جلد 38 شمارہ 4
اپریل 20016ء
قیمت -/60 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامیات

افسانے

ناولٹ

مستقل سلسلے

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماہنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ
اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! اپریل 2016ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

گزشتہ دنوں حکومت پنجاب نے حقوق نسواں بل اسمبلی سے منظور کروایا۔ جس پر مختلف حلقوں میں بحث جاری ہے۔ لاہور میں مختلف دینی جماعتوں کے رہنماؤں کے اجلاس میں حکومت کو یہ قانون واپس لینے کے لئے 27 مارچ کی ڈیڈلائن دے دی گئی ہے کہ یہ قانون واپس لے کر علماء کی مشاورت سے قرآن وسنت کی روشنی میں نیا قانون لائے وگرنہ حکومت کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔ اس کے جواب میں حکومت کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ اس بل میں قرآن وسنت کے خلاف جو بھی شقیں ہیں علماء کرام ان کی نشاندہی کریں۔ حکومت انہیں حذف کردے گی۔ مگر دینی جماعتیں اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں اس بل سے خاندان جڑیں گے نہیں بلکہ ٹوٹیں گے۔ ان کے خیال میں گھریلو معاملات میں حکومتی مداخلت سے طلاق کی شرح میں اضافہ ہوجائے گا جو کہ پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔ ہماری نظر میں عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ اسے وہ تمام حقوق ملنے چاہئیں جو کہ اسلام نے اسے دیئے ہیں۔ اس میں تعلیم حاصل کرنے سے لے کر نان نفقہ کا مکمل تحفظ شامل ہے۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں دو انتہائیں ہیں کہ وہ لوگ جو ایک عورت کو مکمل باندی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں دوسرے وہ جو مغربی ممالک کی چکا چوند سے متاثر ہو کر عورت کی مادر پدر آزادی کے حق میں ہیں۔ حالانکہ یہ آزادی جس کے یہ خواب دکھا کر ہمارے ہاں کی عورتوں کو ورغلا رہے ہیں وہ مغربی معاشرے میں گھریلو نظام کی تباہی کی بنیاد رکھ رہی ہے، وہاں خاندان بکھر چکے ہیں۔ اکثر لوگ بغیر شادی کے بندھن کے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں جب دل اکتا جاتا ہے تو مرد عورت کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رہنا شروع کردیتا ہے۔ بچوں کی پرورش ماں کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اسی لئے مغربی معاشرے میں اب ماہرین نفسیات اور معاشریات خاندانی نظام کے احیا کے لئے تحقیق وجستجو کررہے ہیں۔ جبکہ ہمارے یہاں نام نہاد لبرل خاندانی نظام کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ خاندانی نظام کی بقاء کے بغیر ہمارا معاشرہ نہیں چل سکتا اور اس کے لئے بہترین راستہ اسلام کا دکھایا ہوا راستہ ہے۔ یہاں جو بھی قانون بنے اسلام کی روح کے مطابق ہونا چاہیے۔ اسی میں ہم سب کی بقاء ہے۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے ساتھ میں مہمان سمیرا گل، معصومہ منصور اور نائلہ طارق کے مکمل ناول، فرح بخاری کا ناولٹ، مبشرہ ناز، بنت حوا، غزالہ جلیل راؤ اور عابی ناز کے افسانے، اُم مریم، نایاب جیلانی اور سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر

سردار محمود

اندھیرے چیر کر ان میں اجالا [illegible] کرتا ہے
ہر ایسا کام اے اللہ تعالیٰ تو ہی کرتا ہے

شکست فاش دیتا ہے ہمیشہ تو ہی باطل کو
ہر اک موقع پہ حق کا بول بالا تو ہی کرتا ہے

جہاں میں وقت پیدائش سے لے آخری دم تک
ہر انسان اور ہر حیوان کو پالا تو ہی کرتا ہے

بسا اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں گھبرا کر
ہر ایسے وقت میں مشکل کو ٹالا تو ہی کرتا ہے

زمیں پر گل شگفتہ آسماں پر نجم رخشندہ
ہے یہ کام تیرے کرنے والا تو ہی کرتا ہے

جو تو چاہے تو پتھر میں بھی کیڑے کو غذا بخشے
ایسا کام انوکھا اور نرالا تو ہی کرتا ہے

[illegible] ہے کروڑوں ہی بشر [illegible]
[illegible] سنبھالا تو ہی کرتا ہے

جب نظر کے سامنے [illegible] گا
خود بخود تیری زباں پر ذکر سرور [illegible]

دیکھنا ہے سایہ احمدؐ تو دیکھو عرش کو
آسماں کا سایہ آخر کیوں زمیں پر آئے گا

مجھ کو نسبت ہے نبیؐ سے نہیں دنیا کا خوف
مجھ سے ٹکرائی تو گردش کو بھی چکر آئے گا

تیرگی کو کاٹ دے گی جنبش نوک قلم
روشنی کے ہاتھ میں کرنوں کا خنجر آئے گا

آنکھ میں بھر لوں گا میں تو شربت دیدار کو
جام بھرنے جب میرا ساقی کوثر آئے گا

میں ہوں مداح نبیؐ ممکن نہیں مجھ کو زوال
دیکھنا کس اوج پر میرا مقدر آئے گا

[illegible] کے دل میں آئے گا
[illegible] کی تاریکیوں [illegible]

پیارے نبی کی پیاری باتیں

سید اختر ناز

اللہ کی محبت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں پس تو بھی اس سے کر، پھر جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمان والے فرشتے اس سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں کے دلوں میں وہ مقبول ہو جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی آدمی سے دشمنی رکھتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں کا دشمن ہوں تو بھی اس کا دشمن ہو تو پھر وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں پھر آسمان والوں میں منادی کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے دشمنی رکھتا ہے تم بھی اس کو دشمن رکھو، وہ بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اس کے بعد زمین والوں میں اس کی دشمنی جم جاتی ہے۔'' (یعنی زمین میں بھی اللہ کے جو نیک بندے یا فرشتے ہیں، وہ اس کے دشمن رہتے ہیں۔) (مسلم)

بھائی چارہ

سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مومن (دوسرے) مومن کے لئے ایسا ہے جیسے عمارت میں ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے (اسی طرح ایک مومن کو لازم ہے کہ دوسرے مومن کا مددگار رہے۔'')

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''مومنوں کی مثال ان کی دوستی، اتحاد اور شفقت میں ایسی ہے جیسے ایک بدن کی، (یعنی سب مومن مل کر ایک قالب کی طرح ہیں) بدن میں سے جب کوئی عضو درد کرتا ہے تو سارا بدن اس (تکلیف) میں شریک ہو جاتا ہے، نیند نہیں آتی اور بخار آ جاتا ہے۔'' (اسی طرح ایک مومن پر آفت آئے خصوصاً وہ آفت جو کافروں کی طرف سے پہنچے تو سب مومنوں کو بے چین ہونا چاہیے اور اس کا علاج کرنا چاہیے۔) (مسلم)

پردہ پوشی کے بیان میں

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جب کسی بندے پر اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ ڈال دیتا ہے تو آخرت میں بھی پردہ ڈالے گا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جو کوئی شخص دنیا میں کسی بندے کا عیب چھپائے گا، اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس کا

عیب چھپائے گا۔" (مسلم)

نرمی کے بارے میں

سیدنا جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔

"جو شخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔"

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتی ہیں، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کسی میں نرمی ہو تو اس کی زینت ہو جاتی ہے اور جب نرمی نکل جائے تو عیب ہو جاتا ہے۔" (مسلم)

تکبر کرنے والے کے بارے میں

سیدنا ابو سعید خدری اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"عزت اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اور بڑائی اس کی چادر ہے (یعنی یہ دونوں اس کی صفتیں ہیں) پھر اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جو کوئی یہ دونوں صفتیں اختیار کرے گا میں اس کو عذاب دوں گا۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تین آدمیوں سے بات تک نہ کرے گا اور ان کو پاک کرے گا، نہ ان کی طرف (رحمت کی نظر سے) دیکھے گا اور ان کو دکھ کا عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زنا کرنے والا، دوسرے جھوٹا بادشاہ، تیسرے مغرور محتاج۔" (مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھانے والے کے متعلق

سیدنا جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا۔

"ایک شخص بولا کہ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا۔"

"اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کون ہے جو قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہ بخشوں گا، میں نے اس کو بخش دیا اور اس کے (جس نے قسم کھائی تھی) سارے اعمال لغو (بیکار) کر دیئے۔" (مسلم)

برے شخص کا بیان

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت مانگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس کو اجازت دو یہ اپنے کنبے میں ایک برا شخص ہے۔"

جب وہ اندر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے نرمی سے باتیں کیں تو ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو اس کو ایسا فرمایا تھا پھر اس سے نرمی سے باتیں کیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! برا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت میں وہ ہو گا جس کو لوگ اس کی بدگمانی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔" (مسلم شریف)

درگزر کرنے کے بیان میں

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''صدقہ دینے سے کوئی مال نہیں گھٹتا اور جو بندہ معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھاتا ہے اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔'' (مسلم)

غصہ کے وقت پناہ مانگنے کا بیان

سیدنا سلیمان بن صرد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گالی گلوچ کی، ایک کی آنکھیں لال ہو گئیں اور گلے کی رگیں پھول گئیں۔''
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''مجھے ایک کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے، وہ کلمہ یہ ہے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔'' (مسلم شریف)

راستہ صاف کرنے کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
''ایک شخص نے راہ میں کانٹوں کی ڈالی دیکھی تو کہا کہ اللہ کی قسم میں اس کو مسلمانوں کے آنے جانے کی راہ سے ہٹا دوں گا تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت میں داخل کیا۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ ''یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کوئی ایسی بات بتلایئے جس سے میں فائدہ اٹھاؤں۔''
تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔
''مسلمانوں کی راہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دے۔''

مومن کی مصیبت کا بیان

اسود کہتے ہیں کہ قریش کے چند جوان لوگ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور وہ منیٰ میں تھیں وہ لوگ ہنس رہے تھے۔
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا۔
''تم کیوں ہنستے ہو؟''
انہوں نے کہا کہ ''فلاں شخص خیمہ کی طناب پر گرا اور اس کی گردن یا آنکھ جاتے جاتے بچی۔''
ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا۔
''مت ہنسو اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسلمان کو ایک کانٹا لگے یا اس سے زیادہ کوئی دکھ پہنچے تو اس کے لئے ایک درجہ بڑھے گا اور ایک گناہ اس کا مٹ جائے گا۔'' (مسلم شریف)

مومن کی تکلیف

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے۔
''مومن کو جب کوئی تکلیف یا ایذا یا بیماری یا رنج ہو یہاں تک کہ فکر جو اس کو ہوتی ہے تو اس کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔''
سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ۔
''کوئی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ ملے گا، تو مسلمانوں پر بہت سخت گزرا (کہ ہر گناہ

کے بدلے ضرور عذاب ہوگا۔")

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"میانہ روی اختیار کرو اور ٹھیک راستہ کو ڈھونڈو اور مسلمان کو (پیش آنے والی) ہر ایک مصیبت (اس کے لئے) گناہوں کا کفارہ ہے، یہاں تک کہ ٹھوکر اور کانٹا بھی۔" (لگے تو بہت سے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں ہو جائے گا اور امید ہے کہ آخرت میں مواخذہ نہ ہو) (مسلم شریف)

دوسرے مسلمان سے برتاؤ

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دوسرے سے بغض مت رکھو اور ایک دوسرے سے حسد مت رکھو اور ایک دوسرے سے دشمنی مت رکھو اور اللہ کے بندوں بھائیوں کی طرح رہو اور کسی مسلمان کو حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ تک (بغض کی وجہ سے) بولنا چھوڑ دے۔" (مسلم شریف)

سلام میں پہل

سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مسلمان کو یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تک (بولنا) چھوڑ دے، اس طرح کہ وہ دونوں ملیں اور ایک اپنا منہ اِدھر اور دوسرا اپنا منہ اُدھر پھیر لے اور ان دونوں میں بہتر وہ ہوگا جو سلام میں پہل کرے گا۔"

کینہ رکھنا اور آپس میں قطع کلامی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں، پھر ہر ایک بندے کی مغفرت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا لیکن وہ شخص جو اپنے بھائی سے کینہ رکھتا ہے اس کی مغفرت نہیں ہوتی اور حکم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو دیکھتے رہو جب تک کہ صلح کر لیں۔" (جب صلح کر لیں گے تو ان کی مغفرت ہو گی۔)

بدگمانی سے بچنے کا حکم

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی بڑا جھوٹ ہے اور کسی کی باتوں پر کان مت لگاؤ اور جاسوسی نہ کرو اور (دنیا میں) رشک مت کرو (لیکن دین میں درست ہے) اور حسد نہ کرو اور بغض مت رکھو اور دشمنی مت کرو اور اللہ کے بندے اور (آپس میں) بھائی بھائی بن جاؤ۔" (مسلم)

گلہ کرنے کی ممانعت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟"

لوگوں نے کہا۔

"اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم خوب جانتے ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ذکر اس طرح پر کرے کہ (اگر وہ سامنے ہوتو) اس کو ناگوار گزرے۔"

لوگوں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر ہمارے بھائی میں وہ عیب موجود ہوتو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔"

"جب ہی تو یہ غیبت ہو گی نہیں تو بہتان ہے۔" (مسلم شریف)

چغل خوری کی ممانعت

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا میں تمہیں یہ نہ بتلاؤں کہ بہتان فتیح کیا چیز ہے؟ وہ چغلی ہے جو لوگوں میں عداوت ڈالے۔" اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک سچا لکھا جاتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔" (مسلم شریف)

چغل خور آدمی جنت میں نہ جائے گا

ہمام بن حارث کہتے ہیں کہ ہم سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی آیا اور ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا تو لوگوں نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔

"بادشاہ تک بات پہنچاتا ہے۔" سیدنا حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو سنانے کی نیت سے کہا کہ۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ چغل خور جنت میں نہ جائے گا۔" (مسلم شریف)

سچ اور جھوٹ کے بارے میں

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تم سچ کو لازم کرلو کیونکہ سچ نیکی کی طرح راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچا لکھا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ برائی کی طرف راہ دکھاتا ہے اور برائی جہنم کو لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے۔" (مسلم شریف)

زمانے کو گالی دینے کی ممانعت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ عزوجل فرماتا ہے" مجھے آدمی تکلیف دیتا ہے کہتا ہے کہ ہائے کمبختی، زمانے کی تو کوئی تم میں سے یوں نہ کہے کہ ہائے کمبختی، زمانے کی، اس لئے کہ زمانہ میں ہوں، دن اور رات میں لاتا ہوں جب میں چاہوں گا تو رات اور دن ختم کر دوں گا۔" (جب رات دن کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے تو رات اور دن کو یعنی زمانہ کو گالیاں دینا دراصل اللہ کو گالی دینا ہوگا۔) (مسلم شریف)

☆☆☆

داخلے جاری ہیں

ابن انشاء

پرسوں ایک صاحب تشریف لائے۔

ہے رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

پہلے بریلی کو بانس بھیجا کرتے تھے، یہ کاروبار کسی وجہ سے نہ چلا تو کوئلوں کی دلالی کرنے لگے، چونکہ صورت ان کی محاورے کے عین مصداق تھی، ہمارا خیال تھا، اس کاروبار میں سرخ رو ہوں گے لیکن آخری بار ملے تو معلوم ہوا نرسری کھول رکھی ہے، پودے اور کھاد بیچتے ہیں، پھولوں کے علاوہ سبزیوں کے بیج بھی ان کے ہاں سے بارعایت مل سکتے ہیں۔

آتے ہی کہنے لگے۔

''دس روپے ہوں گے؟'' ہم نے نہ دینے کی بجائے سوچتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا ضرورت آن پڑی؟''

فرمایا۔

''اپن ادبی ذوق کے آدمی ہیں، اپن سے اب گھاس نہیں کھودی جاتی، کھاد اور پود نہیں بیچی جاتی، اب ہم ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جس سے قوم کی خدمت بھی ہو۔''

ہم نے کہا۔

''دس روپے میں اسکول کھولیے گا؟''

بہت ہنسے اور بولے۔

''اچھی رہی، بھلا دس روپے میں بھی اسکول کھولا جا سکتا ہے، دس روپے میرے پاس بھی تو ہیں، دیکھیے سیدھا سیدھا حساب ہے، ایک دس روپے کا تو بورڈ لکھوایا جائے گا، بورڈ کیا کپڑے پہ نام لکھوانا ہی کافی ہو گا اور دوسرے دس روپے سے جو آپ مجھے دیں گے، میں شہر کی دیواروں، پلیوں، بس اسٹینڈوں وغیرہ کے چہرے پر کالک پھیروں گا، یعنی اپنا اشتہار لکھواؤں گا کہ اے عقل کے اندھو، گانٹھ کے پورو، آؤ کہ داخلے جاری ہیں۔''

ہم نے کہا۔

''یہ جو تم لوگوں کے لئے گھروں کی دیواروں کو کالی کوچی پھیر کر خراب کرو گے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تمہیں؟ کارپوریشن نہیں روکتی، پولیس نہیں ٹوکتی؟''

بولے۔

''پہلے یہ لوگ ملاوٹ کو تو روک لیں، عطائیوں اور گداگروں کو تو ٹوک لیں، شہر سے گندگی کے ڈھیر تو اٹھوالیں، کتے تو پکڑوالیں اور مچھروں مکھیوں کے منہ تو آلیں۔''

ہم نے کہا۔

''آپ بھی بچے ہیں، ان لوگوں کی مصروفیت کا ہمیں خیال ہی نہ رہا تھا، اچھا اگر یونین کمیٹیوں کو خیال آ گیا کہ ان کا محلّہ اجلا ہونا چاہیے۔''

ٹھٹھا مار کر بولے۔

''یونین کمیٹیاں؟ یہ کون لوگ ہوتے ہیں، کیا کام کرتے ہیں؟''

ہم نے کھسیانے ہو کر پوچھا۔

''آپ کے پاس اسکول کے لئے عمارت بھی ہے، خاصی جگہ درکار ہوتی ہے، آپ کا گھر تو جہاں تک ہمیں معلوم ہے 133 گز پر ہے۔''

فرمایا۔

''وہ ساتھ والا پلاٹ خالی ہے نا، جس میں ایک زمانے میں بھینسیں بندھا کرتی تھیں، لے کر اس پر ٹین کی چادریں ڈلوائیں گے، فی الحال تو اس کی بھی ضرورت نہیں، گرمیوں کے دن ہیں، اوپن ایئر ٹھیک رہے گا، سنا ہے شانتی نیکتن میں بھی کھلے میں کلاسیں لگتی ہیں۔''

ہم نے کہا۔

''آپ کی بات کچھ ہمارے جی نہیں لگتی، بارشیں آنے والی ہیں، ان میں اسکول بہہ گیا تو؟''

سوچ کر بولے۔

''ہاں یہ تو ہے، جگہ تو اپنی نرسری کے سائبان میں بھی ہے بلکہ اسکول کھولنے کا خیال ہی اس لئے آیا کہ کئی والدین نرسری کا بورڈ دیکھ کر آئے اور کہنے لگے، ہمارے بچوں کو اپنی نرسری میں داخل کر لو، بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ وہ نرسری نہیں بلکہ پھولوں پودوں والی نرسری ہے، لیکن وہ یہی زور دیتے رہے کہ اسکولوں میں تو داخلہ ملتا نہیں، یہیں داخل کر لو ہمارے بچوں کو، کم از کم مالی کا کام سیکھ جائیں گے۔''

ہم نے کہا۔

''کس درجے تک تعلیم ہوگی؟''

فرمایا۔

''میٹرک تک تو ہونی ہی چاہیے، اس کے ساتھ کے جی اور منٹگمری اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا۔

''مانٹو سوری سے مطلب ہے غالباً۔''

فرمایا۔

''ہاں ہاں مانٹو سوری، میرے منہ سے ہمیشہ منٹگمری ہی نکلتا ہے۔''

''پڑھائے گا کون؟'' ہم نے دریافت کیا۔

بولے۔

''میں جو ہوں اور کون پڑھائے گا، اب مشق چھوٹی ہوئی ہے ورنہ مڈل تو بندے نے بھی اچھے نمبروں سے پاس کر رکھا ہے، اے بی سی تو اب بھی پوری آتی ہے، سناؤں آپ کو؟ اے بی سی ڈی ای......''

ہم نے کہا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں آپ کی اہلیت میں کسے شک ہے؟ لیکن آپ تو پرنسپل ہوں گے پھر آپ کی دوسری مصروفیات بھی ہیں یہ پھول پودے کا کاروبار بھی خاصا نفع بخش ہے، یہ بھی جاری رہنا چاہیے۔''

بولے۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے، خیر ساٹھ ستر روپے میں کوئی بی اے، ایم اے پاس ماسٹر یا ماسٹرنی رکھ لیں گے، جب تک چاہا کام لیا، چھٹیاں آئیں نکال باہر کیا، بلکہ ہمارے اسکول میں تو تین کے بجائے چھ ماہ کی چھٹیاں ہوا کریں گی، تاکہ بچوں کی صحت پر پڑھائی کی برا اثر نہ پڑے۔''

''نام کیا رکھا ہے اسکول کا؟'' ہم نے پوچھا۔

''مدرسہ تعلیم الاسلام، اقبال ہائی اسکول وغیرہ۔''

بولے۔

''جی نہیں، نام تو انگریزی چاہیے، فس کلاس قسم کا ہو جس سے معلوم ہو کہ ابھی ابھی انگریزوں نے آ کر کھولا ہے، کسی سینٹ کا نام تو اب خالی نہیں، سینٹ جوزف، سینٹ پیٹرک، سینٹ یہ، سینٹ وہ سب ختم ہوئے۔''

ہم نے کہا۔

''سینٹ سائمن ٹمپلر ہو سکتا ہے۔'' غور کر کے کہنے لگے۔

''نہیں، ہمارے اسکول میں جاسوسی کی تعلیم نہیں دی جائے گی۔''

''پھر آکسفورڈ کیمبرج وغیرہ کے نام پر رکھیے۔''

فرمایا۔

''یہ بھی بہت ہو لئے بلکہ لٹل فوکس اور چلڈرن ہوم اور گرین وڈ وغیرہ بھی کئی ایک ہیں، میرا ارادہ ہمپٹی انگلش اسکول نام رکھنے کا تھا، لیکن وہ بھی کسی نے رکھ لیا، آج سارے ناظم آباد کی پلیوں پر یہی لکھا دیکھا۔''

اس پر ہمارے ذہن میں ایک نکتہ آیا ہم نے کہا۔

''ہمٹی ڈمپٹی دو بھائی تھے، بھائی نہیں تھے تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تو تھے ہی آپ نہلے پہ دہلا ماریے، ڈمپٹی انگلش اسکول نام رکھیے اس میں بچت بھی ہے، نیا اشتہار لکھوانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔''

''وہ کیسے؟'' ازراہ اشتیاق پوچھنے لگے۔

ہم نے کہا۔

''پینٹر سے کہیے کہ رات کو کوچی لے کر نکلے ہمپٹی کی ''ہ'' پر کوچی پھیرتا جائے اور اسے ''ڈ'' بناتا جائے، سفیدی برائے نام خرچ ہوگی، دو تین روپے سے زیادہ نہ دیجئے گا پینٹر کو۔''

یوں اسکول کھل گیا اور یوں اسکول کھل رہے ہیں، جس کا لکڑیوں کا ٹال نہ چلا، اس نے اسکول کھول لیا اور جس کی نرسری کے پودے نہ بکے اس نے بھی اسکول کھول لیا، اسکول بڑھتے جاتے ہیں، تعلیم گھٹتی جاتی ہے، خیر اس میں نقصان بھی کچھ نہیں، آج تک کسی کا تعلیم سے کچھ بنا بھی ہے؟

ہم نے بی اے کیا کلرک بنے
وہ مڈل فیل تھے وزیر بنے

☆☆☆

سمیرا گل عثمان

پیاری رائٹرز عزیز از جان قارئین اور فوزیہ ڈیئر کو میرا سلام، ایک دن کا احوال، کہاں سے شروع کروں، اتنے بوریت بھرے دن ہیں کہ بس پوچھیں مت، دو بچوں کی مصروفیات نے الجھا رکھا ہے، آیئے آپ بھی میری اس بوریت میں ذرا شریک ہو جائیے۔

دن کا آغاز کب اور کہاں سے ہوتا ہے مجھے خود بھی نہیں پتہ، رات سوتے سوتے ساڑھے گیارہ بارہ بج جاتے ہیں اب اگر عائزہ سوئے گی تو ہم بھی سوئیں گے ورنہ رات جاگ کر اور دن اونگھتے ہوئے۔

جی ہاں بچوں کو سلا کر میں یہی دعا مانگتی ہوں کہ کاش اس رات تو آرام سے سو جاؤں مگر نہ جی ابھی آنکھ لگتی ہے اور نیند کی وادیوں میں اترنے سے قبل ہی میوزک اسٹارٹ ہو جاتا ہے وہ بھی بے سرا۔

میں آنکھیں کھول کر وال کلاک کو دیکھتی ہوں تین بج چکے ہیں ساتھ والے بستر سے آواز آتی ہے۔

''کتنی بار کہا ہے اس میوزک کے بجنے سے پہلے اس کو فیڈر دے دیا کرو۔'' اتنا کہہ کر عثمان پھر سو جاتے ہیں اب ان کے خراٹے ایک بار پھر سے کمرے میں گونج رہے ہیں لیکن صبح اٹھ کر کہیں گے۔

''تم اکیلی تھوڑا ہی جاگتی ہو میں بھی تو اٹھا ہی رہتا ہوں۔''

اب میں فیڈر لے کر آتی ہوں حالانکہ روز سونے سے قبل اس کو اچھی طرح سے ٹھونس ٹھانس کر سلاتی ہوں کہ آرام سے سوتی رہے مگر نہ جی......

لیجئے اب دودھ پی کر وہ اتنی فریش ہوتی ہے جیسے دن نکل آیا ہو، اب لاکھ جتن کر لو، پوئمز سنا لو، شانے سے لگا کر تھپک لو مگر اس نے نہیں سونا، تنگ آ کر میں لیٹ جاتی ہوں اور عائزہ کی کوششیں یہی ہوتی ہیں کہ کسی طرح مجھے پھلانگ کر عنایہ کے پاس چلی جائے اور جا کر اس کے بال کھینچے، اب اگر میں روکوں تو اس کا باجا اسٹارٹ۔

پھر میں اس کو کھلونے دوں گی بھالو، ریموٹ، فیڈر جو بھی مجھے مل جائے وہ بہلے گی دو سے چار منٹ، اب میں اس کو ڈانٹوں گی اس کا باجا اور تیز ہو گا اور میرے ضبط کا پیمانہ بھی، اس بار مجھ سے ایک تھپڑ تو پڑ ہی جائے گا، اب اس کے پاپا ایکشن لیں گے۔

''کیوں مار رہی ہو بچی کو، نہیں سو رہی تو کھیلو اس کے ساتھ۔''

''مجھ سے نہیں کھیلا جاتا سارا دن بچے سنبھالو اور رات کو بھی جاگتے رہو۔''

''ہاں تو تم سارا دن گھر رہتی ہو مجھے آفس بھی جانا ہوتا ہے۔''

''میں کیا کروں۔'' اس بار میں نے رضائی تان لی ہے عائزہ اب پاپا کی طرف رخ کرتی ہے۔

''میں پاپا پاس۔'' پاپا دس منٹ تک پچکارتے ہیں اپنے ساتھ سلانے کی کوشش کرتے ہیں سو جائے تو ٹھیک ورنہ پھر مجھے ہی جاگنا پڑتا ہے۔

دوسری صبح میری آٹھ بجے ہوتی ہے عثمان کو

ناشتہ دے کر میں کمرے میں آتی ہوں تو عائزہ ایک بار پھر سے جاگ چکی ہوتی ہے اس کے کپڑے وغیرہ چینج کرنے کے بعد اسے فیڈر دیتی ہوں اور ایک بار پھر سے سلانے کی کوشش جاری۔

تیسری صبح میری ساڑھے دس بجے ہوتی ہے سب سے پہلے بچوں کو ناشتہ کرواتی ہوں پھر خود ناشتہ کرتی ہوں اس کے بعد بچوں کو تیار کرتی ہوں عنایہ کو اس کی بک اور کلرز دے کر بٹھاتی ہوں اور عائزہ کو سائیکل پہ سوار کرتی ہوں۔

اب میرے کاموں کا آغاز ہوتا ہے پہلے برتن دھو کر کچن صاف کرتی ہوں اس کے بعد بچوں کا اور ان کے پاپا کا پھیلایا ہوا پھیلاوا سمیٹتی ہوں پھر گھر کی صفائی ڈسٹنگ اور یہ کام اتنے آرام سے بھی نہیں ہوتا بچے اس دوران خوب تنگ کرتے ہیں ایک بجے ان کے پاپا گھر لنچ کرنے آتے ہیں، ڈیڑھ بجے تک ان کو فارغ کرتی ہوں اب ڈیڑھ دو گھنٹے تھوڑا سا سکون ہے کیونکہ عائزہ سو جاتی ہے اور عنایہ میرا سر کھاتی رہتی ہے، اتنی باتیں اتنے سوال۔

عائزہ کو بخار تھا تو میں نے عنایہ سے کہا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ عائزہ کو آرام دے دو، تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ عائزہ کو آرام دے دو، مما کو آرام دے دو پاپا کو آرام دے دو، اب اگلی صبح میں نے ذرا سا ڈانٹ دیا تو عائزہ سے جا کہ کہتی ہے۔

''عائزہ مما بڑی گندی بچی ہے ہم اللہ سے کہیں گے مما کو آرام نہ دینا۔''

یہ تو آج کل کے بچوں کا حال ہے کب یہ تین سال کی ہو گی تو اس کو اسکول ایڈمٹ کرواؤں گی کچھ تو سکون ہو گا، خیر ابھی رات کا کھانا باقی ہے میں تو کہتی ہوں روز دال چاول بنا لو آسانی سے بن تو جاتے ہیں اور میں کرتی بھی زیادہ تر ایسا ہی ہوں اور جس روز ان کے پاپا رات کو ذرا جاگ جائیں مطلب اس ٹیپ ریکارڈر (عائزہ) کو سنبھال لیں، اگلے روز وہ یہ بدلہ سبزیوں کا ڈھیر میرے سپرد کر کہ نکالتے ہیں۔ چار گھنٹے بندہ ان کو ہی بناتا رہے۔

پانچ بجے کے بعد میں فارغ ہوتی ہوں اس دوران کبھی ٹی وی یا پھر رسالہ وغیرہ پڑھ لیتی ہوں آٹھ بجے ہم رات کا کھانا کھا لیتے ہیں اس کے بعد چائے بناتی ہوں بچوں کے لئے دودھ گرم کرتی ہوں کچن صاف کرتی ہوں۔

نو بجے ہماری لائیٹ چلی جاتی ہے اب ان کے پاپا بچوں کو بٹھا کر نعتیں سناتے ہیں میں اس دوران باہر صحن میں واک کرتی ہوں، وقفے وقفے سے عائزہ کا بھونپو بجتا ہی رہتا ہے۔

عثمان کی آواز آ رہی ہوتی ہے کل سے میں بھی واک کروں گا تم بچے سنبھالنا، میں مزے سے کانوں میں ہنڈ فری ٹھونسے چکر لگاتی رہتی ہوں مجھے پتہ ہے وہ کل کبھی نہیں آنے والی، دس بجے لائٹ آتی ہے۔

اب بچوں کو فیڈر دے کر سلانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے اگر گیارہ بجے تک سو جائیں تو میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں، یہی میرا لکھنے کا ٹائم ہوتا ہے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جب واپس کمرے میں آتی ہوں تو عائزہ ایک بار پھر اٹھ جاتی ہے یار یہ ایک سال پانچ ماہ کی ہو چکی ہے مگر اتنا کم کیوں سوتی ہے؟ اس کو سلانے کا کوئی آزمودہ طریقہ آپ کے پاس ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔

اچھا اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ آپ لوگ جہاں رہیں ہنستے مسکراتے رہیں اور آپ سب کو زندگی میں ایک عائزہ تو ضرور ملے آمین۔

☆☆☆

چوتھی قسط کا خلاصہ

غانیہ، ماما کی ناراضگی کے باعث بہت اپ سیٹ ہے، شادی کی تاریخ اچانک طے ہوتی ہے اس اچانک فیصلے کے پیچھے تاؤ جی کی بیماری ہے، جو منیب چوہدری کے لئے فرار کے ہر راستے کو بند کر دیتی ہے۔

منیب جتنا بھی مجبور ہو، مگر غانیہ اور شادی دونوں کو قبول کرنے پہ آمادہ نہیں۔

غانیہ سے مل کر وہ شادی سے انکار پر مجبور کرتا ہے، غانیہ کا اس کی بات ماننے سے انکار اسے مزید برہم کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

اجنبی عورت کو طلاق کا پروانہ حواس سے بھی منقطع کر جاتا ہے۔

مون اپنی زندگی کے معاملات میں آگے بڑھ چکا ہے، اس کے حتمی فیصلے اس کی زندگی کو متوازن رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

اب آپ آگے پڑھیے

پانچویں قسط

''لیکن پہننے والی کو اگر آپ کی پسند کا خیال ستائے تو کوئی کیا کرے۔'' فضہ کے انداز میں شرارت و شوخی کا عکس تھا، غانیہ نے بے ساختہ گھبرا کر فضہ کا ہاتھ دبایا، منیب نے چونک کر فضہ کو دیکھا تو اس کی حرکت بھی نگاہ میں آ گئی، نظروں کا انداز بڑا سلگتا ہوا تھا، لیکن اب کے وہ کچھ نہیں بولا۔

شاید وہ اس سے زیادہ مروت و لحاظ بھی نہیں نبھا سکتا تھا، فضہ اور عامر بھائی ان لوگوں کو ساتھ چلنے پہ اصرار کرنے لگے کہ اتنا نزدیک آ کر ایسے جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا، جبکہ منیب مسلسل انکار کیے جا رہا تھا، سسرالیوں کی آؤ بھگت خلوص اور چاہت کا اظہار جبکہ منیب کا روادار شائستگی بھرا انداز بھرجائی سے کچھ بھی ہضم ہونے والا نہیں تھا، جبھی ہنستے ہوئے میٹھے انداز میں سہی مگر زہر کاری کی کوشش ضرور کی تھی۔

''رہن دیں بہن جی، دیور جی سسرال آ کے خالی ہتھ نہیں جانا چاہتے ہوں گے، انہیں بھی پتا ہے آپ نے ان کی چیز ابھی نہیں مقررہ ٹائم پہ ہی ان کے حوالے کرنی ہے۔''

ان کا مقصد منیب کا ضبط چھلکانا تھا، غالباً وہ اس مقصد میں کامیاب ٹھہری تھیں، غانیہ کے ساتھ اماں اور کنیز نے بھی سہمی ہوئی نظروں سے منیب کی آنکھوں کی بڑھتی سرخی کو دیکھا۔

منیب اک لفظ نہیں بولا، البتہ چہرے کے تاثرات کو بھی خصوصاً کنٹرول میں رکھا، پھر وہ مزید وہاں نہیں ٹھہرا، جتنی دیر رکا تھا، اس دوران بھی بار بار گھڑی دیکھتا تھا، رسمی الوداعی کلمات کے بعد وہ لوگ رخصت ہوئے تو فضہ اور عامر بھائی پہ ہنوز منیب کی شخصیت کا تاثر قائم دائم تھا، فضہ تو باقاعدہ تعریفیں کر رہی تھی، تعریفوں کا یہ سلسلہ اس وقت پھر شروع ہوا جب وہ لوگ گھر پہنچے۔

''رئیلی امیزنگ ممی! میں تو اس بندے کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، وہ تو کہیں سے بھی تاؤ جی کی فیملی کا حصہ نہیں لگتا، غانیہ واقعی بہت لکی ہے رئیلی۔'' ممی کچھ نہیں بولیں، غانیہ جیسے ابھی تک مدہوش سی بیٹھی تھی۔

''آپ کو چاہیے تھا ممی! آپ ایک بار اس بندے کو مل لیتیں تو اتنا خون نہ جلتا آپ کا۔''

وہ ہرگز مذاق کے موڈ میں نہیں تھی، بلکہ اگر کہا جائے کہ مما نے آج تک اسے اتنا متاثر یا اتنا کسی معاملے میں سنجیدہ نہیں دیکھا تھا تو یہ حقیقت ہوگی، جبھی کچھ حیران کچھ بھونچکی سی ہو گئیں، اسد بھی قدرے حیران تھا مگر غیر یقینی جو مما کی نگاہوں میں تھی وہ اس سے مبرا نظر آتا تھا، پپا کی مسکراہٹ البتہ بہت مطمئن قسم کی اور تفاخر آمیز تھی۔

''یہ بات میں بارہا آپ کی والدہ ماجدہ سے کہہ چکا تھا۔'' انہوں نے فضہ کو جواب دیا، جو پھر شروع ہو گئی۔

''منیب کی پرسنالٹی ہر لحاظ سے پولشڈ ہے، بس ایک ہی مسئلہ ہے گاؤں کا...... تو پپا خود ہینڈل کر لیں گے یہ معاملہ بھی، کیوں پپا ہے نا ایسا؟'' فضہ ہر صورت گویا مما کی تسلی چاہتی تھی، پپا نے محض ہنکارا بھرا۔

''میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں بیٹے! اپنی زندگی کے ہر معاملے کا مکمل اختیار منیب کے پاس ہی رہے گا، میرا نہیں خیال کہ وہ اس مسئلے پہ اکڑ دکھائے گا، مگر مرضی بہرحال اس کی اپنی ہوگی، میں

پہلے بھی کہہ چکا ہوں یاد دہانی کو پھر دہرا دوں، اس مسئلے پہ ہم میں سے کوئی بھی منیب سے بات نہیں کرے گا۔" پپا کی سنجیدگی یکدم بہت بڑھ گئی تھی، مما کو یہی انداز ناگوار گزرا۔

"آپ تو ایسے بات کرتے ہیں گویا ہم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا ہے، کیوں نہیں کچھ بول سکتے اس موضوع پہ؟" انہیں پھر غصہ دکھانے کا نکلنے کا موقع مل گیا تھا، پپا نے مگر اہمیت کہاں دی، بغیر کوئی تاثر دیئے وہاں سے اٹھ گئے، فضہ کی ساری کوشش گویا خاک میں ملی تھی، کہ مما پھر سے اونچا اونچا بولتی اپنا غبار نکال رہی تھیں۔

☆☆☆

"ہاں ہاں...... یہ لڑیاں اور چمک دار پٹی بھی لانی ہے، کیل بھی لکھو، سنہرے پھول اور......"

منیب سیڑھیاں اتر کر آیا تو سہیل موڑھے پہ بیٹھے ہمایوں کو بلند آواز سے ایک ایک شے کا نام لکھواتے چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا، اسے دیکھا تو غیر محسوس انداز میں ہمایوں کو کاپی بند کرنے کا اشارہ کیا، منیب دیکھ چکا تھا، مگر نظر انداز کیے آگے بڑھتا کچن کے دروازے پہ آن ٹھہرا۔

"اماں کہاں ہیں کنیز؟"

"بھابو کے ساتھ چھت پہ صفائی کرا رہی ہیں، تیل مہندی کی رسم وہیں ہو گی۔" کنیز کی پلکیں جھکی جھکی تھیں، ان دنوں وہ شرمائی شرمائی رہتی اور بہت پیاری لگا کرتی تھی۔

"انہیں میری طرف سے کہہ دینا، میرے کمرے میں یہ فضول سجاوٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔" نخوت سے کہتا وہ دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھ گیا، سہیل کا منہ اترا جبکہ ہمایوں نے ناک چڑھا لی۔

"امی کہتی ہے چاچو بڑا خوش ہے، پر لگتا تو کہیں سے وی نئیں، دیکھا نہیں مسہری سجانے سے صاف منع کر گیا، اوئے نکمے! تجھے پتا وی ہے تیرے پاپے کا ویاہ ہو رہا ہے، نوی بڈھی آئے گی اس کی، یعنی کہ...... تیری دوسری امی۔" ہمایوں کا والیوم خاصا بلند تھا، حمدان جو کچن میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا، ہمایوں کے اس انداز پہ نافہم نظروں سے چچا اور پھوپھی کو دیکھتے قدرے گھبرا سا گیا، سہیل نے اک کرارا جھانپڑ ہمایوں کو رسید کیا، کہ وہ اس کا حقدار تھا اس کے خیال میں۔

"اوئے...... زیادہ نہ بولا کر...... اور ذرا تمیز بھی سیکھ لے، کیسے بولنا ہوتا ہے۔" سہیل پہلے ہی چڑا بیٹھا تھا، غصہ ہمایوں پہ اتارا، جو ازل سے بے لحاظ اور غصیلا تھا، سہیل کو ایسے جواب دیئے کہ اس کے چودہ طبق روشن کر کے یہ جا وہ جا، نہ رشتے کا لحاظ نہ عمر کا، وہ انتہا درجے کا بدتمیز بچہ تھا۔

"پھپو آپ نے تو کہا تھا اب میں مما کے گھر آنے پہ ان کے ساتھ رہا کروں گا، یہ ہمایوں بھائی کون سی بڈھی کا ذکر کر رہے تھے، بڈھی کیا ہوتی ہے پھپو؟" حمدان ناشتہ ادھورا چھوڑے سوال میں الجھ رہا تھا، کنیز نے گہرا سانس بھرا، پھر بڑی مشکل سے وہ اسے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

"ابا جی کو پتا لگے گا تو بہت خفا ہوں گے، سہیل کہ ویرے نے مسہری نہیں سجانے دی۔" کنیز فکر مند لگتی تھی، سہیل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، محض کندھے اچکا ڈالے، حمدان کچھ دیر دونوں کو دیکھتا رہا پھر سیڑھیاں چڑھتا اوپر منیب کے کمرے میں آ گیا۔

''مے آئی کم ان پپا؟'' دستک کے بعد وہ معصوم سی آواز میں پوچھ رہا تھا، منیب کے آگے کوئی فائل ضرور کھلی ہوئی تھی، مگر وہ سگریٹ کے کش لیتا کسی گہری متفکرانہ سوچ میں غرق تھا، اچھا خاصا چونک کر متوجہ ہوا، اسے دیکھا تو نہ صرف سگریٹ بجھایا بلکہ فائل بھی بند کر دی۔

''یس آف کورس سویٹ ہارٹ! پپا کے پاس آ جاؤ۔'' اس نے بازو پھیلا کر بچے کو گود میں لے لیا، حمدان نے اپنا سر باپ کے سینے پہ رکھ دیا تھا۔

''پپا سب کہتے ہیں آپ کی شادی ہو رہی ہے اور یہ بھی کہتے ہیں میری مما گھر آ جائیں گی اب؟'' اس کا پہلا سوال ہی اتنا دھماکہ خیز تھا کہ منیب پوری جان سے ہل کر رہ گیا، جواب کیا دیتا بھلا۔

''لیکن پپا! مما کو گھر لانے کے لئے پپا کو شادی کرنا ضروری تو نہیں ہوتا، میرے فرینڈ ایز دکی مما خفا ہو گئی تھیں تو ایز د کے پپا شادی کیے بنا ہی انہیں گھر لے آئے تھے، پھر آپ شادی کیوں کر رہے ہیں پپا؟'' بچہ شاکی ہوا تھا، منیب اسی حد تک شرمندہ ہنوز لب بستہ تھا، وہ اسی آزمائش اسی تکلیف دہ احساس سے کتراتا تھا مگر ابا نے ایک نہ سنی، وہ ان نزاکتوں کو کہاں سمجھتے تھے۔

''میں وہاں اکیلا ہوتا ہوں پپا! میرا روم میٹ جوزف ہے، وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا، جب رات کو میں تنہا اپنے بستر پہ جاتا ہوں تو آپ مجھے بہت یاد آتے ہیں، میں نے آپ کو بتایا تھا ناں پپا، میں آپ کے کاندھے پہ سر نہ رکھوں تو مجھے نیند میں زنجیر خواب آتے ہیں، میں بہت ڈرتا ہوں پپا؟'' وہ اب سسکیاں بھر رہا تھا، منیب کی آنکھیں جلنے لگیں، کچھ کہے بغیر اس نے بیٹے کو بھینچ لیا، سر کو بار بار چومتا رہا۔

''جب بھی ڈر محسوس ہو آیت الکرسی پڑھ لیتے ہیں، بیبو نے آیت الکرسی یاد کروائی تھی نا آپ کو؟'' منیب نے بات کا رخ بدلنا چاہا، مگر حمدان اسی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

''آپ کہتے تھے آپ بہت جلد مجھے ہمیشہ کے لئے وہاں سے لے آئیں گے پپا! آپ نے مجھ سے یہ بھی وعدہ بہت پہلے کیا تھا کہ جب میری مما آ جائیں گی، آپ مجھے ان کے ساتھ سونے کی اجازت دیں گے، مما آنے والی ہیں ناں پپا، اب مجھے بھی وہاں سے لے آئیں پلیز۔'' حمدان سسکتا ہوا وعدہ یاد دلاتا اصرار کر رہا تھا، منیب نے گہرا سانس بھرا۔

''میں آپ کو لے آؤں گا بیٹے!'' اس کی آواز بہت بھاری ہو رہی تھی، اس کے ہونٹ بار بار بچے کو چومتے تھے، اس کی آنکھوں میں جیسے ریت چبھنے لگی تھی۔

''مما تو مما ہوتی ہے نا پپا! نئی پرانی نہیں نہ ہی پہلی دوسری، ہے نا؟'' وہ کچھ خیال آنے پہ اس کے سینے سے سر اٹھا کر سوال کر رہا تھا، منیب نظر چرا گیا۔

''یس مائی چائلڈ!'' اس کی آواز کچھ اور بوجھل ہو گئی۔

''اور ہر مما اپنے بیٹے سے اتنی ہی محبت کرتی ہے نا پپا؟''

''ہوں۔'' اس کی آواز جواب دیتے ڈوبنے سی لگی۔

''بیبو کہہ رہی تھیں ہم مما کو دو دن بعد لائیں گے، ہم مما کو ابھی اسی وقت کیوں نہیں لا سکتے پپا؟ کیا میں انہیں یاد نہیں آتا؟ جوزف تو کہتا ہے مما اپنے سن کو کبھی نہیں بھولتیں، وہ تو اپنے کڈ کا

ویٹ کرتی رہتی ہیں، بن آتا ہے تو مزے کے کھانے پکاتی ہیں، اس لاسٹ ٹائم آیا تو مما یہاں تھیں بٹ وہ میرا ویٹ تو نہیں کر رہی تھیں، نہ انہوں نے میرے لئے کھانے پکائے، پپا تب تو بیہ کہتی تھیں وہ آنٹی ہیں، اب وہ مما کیسے بن گئیں؟'' وہ آٹھ سال کا تھا، سمجھدار تھا، مگر کچھ معاملوں میں بہت الجھتا بھی تھا، اس کی ذہانت ان الجھنوں میں اس کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں۔

''حمدان سو جاؤ بیٹے! رات بہت ہو گئی ہے۔'' اس نے کسی اذیت سے گزرتے ہوئے بامشکل کہا، حمدان البتہ اس آرڈر پہ ہرٹ ہوا تھا۔

''سر عباس کہتے ہیں، جب کسی کے اہم سوال کا بھی جواب نہ دیا جائے اور آپ کو کسی اود کام میں مشغول کر دیا جائے تو اس کا مطلب سمپلی یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو جواب دینا نہیں چاہتا، آپ سے جان چھڑا رہا ہے، تو آپ کی جان چھوڑ دینی چاہیے، بٹ پپا آپ نے کبھی ایسا میرے ساتھ نہیں کیا تھا۔'' بچہ روہانسا ہوا جاتا تھا، منیب سکتے میں آ گیا، تڑپ کر اسے پھر سے سینے سے لگا لیا، اماں ٹھیک کہتی تھیں منیب نے اپنے بیٹے کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا، وہ ساری دنیا سے خفا اور بے زار ہو جایا کرتا تھا، مگر کبھی اپنے بیٹے کو معمولی سا بھی نہیں جھڑکا تھا آج تک، وہ حمدان کو کوئی کمی کوئی تشنگی نہیں دینا چاہتا تھا مزید ماں کی کمی پورا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، مگر جو اختیار میں تھا وہ سب اس کے قدموں میں ڈھیر کرتا جاتا، بچہ جب جب بھی ماں کی کمی محسوس کر کے تڑپتا اسے یونہی لامتناہی اذیتوں کے حوالے کر دیا کرتا، کتنا مشکل ہوتا تھا پھر اسے بہلانا۔

حمدان جب بھی یہاں آتا، واپس ہوسٹل نہ جانے کی ضد لگائے رو رو کر ہلکان ہوتا اسے بھی مشکل میں ڈال جاتا، ایسے میں مما کا خیال تصور سے اسے باپ سے زیادہ پیارا ہو جاتا۔

''سب کی مما ہیں، اک بس میری نہیں۔'' وہ آگے سے خاموش، حمدان پیر پٹخنے لگتا۔

''مجھے بھی مما لا کے دیں، تاکہ میں بھی گھر سے اسکول جاؤں، ہوسٹل سے نہیں۔'' وہ ضدی نہیں تھا مگر کبھی کبھی طوفان بدتمیزی اٹھا دیتا، چیزیں پٹخنے لگتا۔

''او کے لا دیں گے۔'' اس کے معاملے میں منیب کا ضبط و برداشت دیکھنے لائق ہوتا، مجال ہے ماتھے پہ بل آ جائے، اس کی پھینکی چیزوں کو کمال ضبط کے مظاہروں سمیت سمیٹتا ہوا اسے منانے کی سعی کرتا رہتا۔

''پرامس کریں۔'' حمدان کو یقین نہ آ سکتا تھا، اس وعدے کو پپا پتا نہیں کیوں کبھی پورا نہ کرتے تھے۔

''پرامس بیٹا!'' وہ فی الفور ہاتھ پھیلا کر وعدہ وعہد کر لیتا۔

''کب لائیں گے؟'' حمدان اکڑ جاتا۔

''اس بار جب آپ واپس گھر آؤ گے، مما آپ سے پہلے آئی ہوں گی۔'' اسے بہلانے کو وہ ایک اور جھوٹ بول جاتا، مگر نہیں جانتا تھا، اس بار قدرت نے پکا انتظام کر دیا ہے اس کا وعدہ پورا کروانے کا، جبھی کنیز کی منگنی پہ جب غانیہ نے اس سے بات کی اس سے پیار کیا، حمدان کو اس میں ماں کی جھلک نظر آئی تھی۔

''یہ مما تھیں؟'' اس نے باپ سے سوال کیا تھا، اس بات سے بے خبر رہ کر کہ وہ کیسا غضب

ناک ہو گیا ہے اس بات کو سن کر ہی، مگر یہ غضب چونکہ اس پہ نہیں نکلا تھا، جبھی اسے اس کی خبر بھی نہ ہو سکی۔

''نہیں۔'' یک لفظی جواب اور بہت دوٹوک اور قطعیت آمیز سختی لئے، حمدان کو پھر بھی کہاں یقین آسکا۔

''پھر وہ مجھے پیار کیوں کر رہی تھیں؟'' حمدان حیران تھا۔

''بیٹے پیار تو کوئی بھی کر سکتا ہے نا اچھے بچے سے۔'' منیب جتنا بھی جھنجھلایا مگر اس کی تشفی کرانی چاہی۔

''پھر یہ کون ہیں؟'' حمدان کی سوئی وہیں اٹکی رہ گئی تھی۔

''یہ آنٹی ہیں بیٹے۔''

''آنٹی بھی تو مما بن سکتی ہیں نا پپا، انہیں مما بنا دیں، وہ بہت کیوٹ ہیں، مجھے پیار بھی کرتی ہیں۔'' وہ چہک کر کہہ رہا تھا، اشتعال کا ایک زبردست ریلا منیب کا سارا ضبط سارا تحمل بہا کر لے گیا، یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے حمدان کو نہ صرف ڈانٹا بلکہ بری طرح سے جھڑکا تھا۔

''شٹ اپ حمدان! آپ کو شرم آنی چاہیے ایسی بات کرتے ہوئے، مما بس ایک ہوتی ہیں، ہر کسی کو ایسے نہیں کہہ دیا کرتے، سوری کریں پپا سے۔''

حمدان سوری تو کیا کرتا، رو رو کر آسمان ضرور سر پہ اٹھا لیا، ابا جی اماں اور سہیل کے علاوہ کنیز بھی اس کے رونے کی آواز پہ بھاگتی آئی تھی، پھر منیب نے لاکھ چاہا بات سنبھال لے، کسی کو کچھ پتا نہ چلے، مگر دادا کے لاڈلے پوتے نے ان کے پچکارنے پہ ساری بات من وعن بتا کر اس کی ذلت کا زبردست سامان مہیا کیا تھا، پھر ابا جی کی عزت افزائی تھی جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کی اور اماں کی ملامتی نظریں، یہ اسی تلخی کا شاخسانہ تھا جو اس کے بعد غانیہ کو سہنا پڑا تھا، منیب نے اندر کی ساری آگ اس پہ انڈیل دی تھی، مگر حاصل وصول پھر بھی کچھ نہیں تھا، وہ سب کے سامنے بے بس آج بھی کھڑا تھا، اس نے گہرا سانس بھر کے حمدان کو دیکھا، جو سو چکا تھا، اسے ہلکے سے ملال نے آن گھیرا، جھک کر اس کا گال چوما اور آہستگی و نرمی سے اسے اپنی گود سے اٹھا کر بستر پہ لٹا دیا تھا، جب دروازے پہ دستک دیتا سہیل اندر آیا۔

''حمدان......'' وہ بچے کو پکارتا پکارتا آواز دبا گیا کہ نگاہ سوئے ہوئے حمدان پہ جا پڑی تھی، اس نے قدرے متحیر ہو کر منیب کو دیکھا۔

''اماں تو بلا رہی تھیں، اسے کہ نہلا کر نئے کپڑے پہنا دیں۔'' منیب سیدھا کھڑا ہو گیا، بولا کچھ نہیں، چادر اٹھا کر حمدان پہ اچھی طرح ڈالی اور پنکھا ذرا تیز کر دیا۔

''اب اسے ڈسٹرب نہ کرنا۔'' اس کا لہجہ خشک تھا۔

''لیکن ابا!''

''جو میں کہہ رہا ہوں وہ سن چکے تم؟'' منیب کی نگاہیں بے حد سرد تھیں، سہیل گڑبڑا کر رہ گیا۔

''چلتا ہوں، آپ کو بھی اماں بلا رہی ہیں۔'' وہ جاتے جاتے پیغام دے گیا۔

''اماں کو منع بھی کیا تھا، مجھے نہیں پسند یہ خرافات۔'' وہ جھلا کر کہتا واش روم میں گھس گیا۔

''اللہ کی شان ہے، اتنی پیاری لڑکی مل رہی ہے، صاحب کا مزاج پھر بھی سوا نیزے پہ ہے۔''
سہیل کو بھی اس کی نخوت پہ غصہ آ گیا تھا، کلس کر کہتا باہر نکلا تو بھرجائی نے فقرہ اچک لیا تھا۔
''سارے ڈرامے ہیں، من میں ورنہ لڈو پھوٹ رہے ہیں۔'' سہیل ایک دم محتاط ہوا، ناگواری کا تاثر البتہ بہت گہرا اترا تھا چہرے پہ، انہیں کچھ سنا کر وہ ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا تھا، جبھی نظر انداز کیے آگے بڑھ گیا۔
''نکے کو نہیں لائے؟'' بھرجائی جان آسانی سے چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھیں۔
''سو گیا ہے۔'' سہیل روکھا ہوا۔
''ہائیں، سو گیا کہ سلا دیا گیا۔'' ان کے لہجے کی چبھن اور طنز واضح تھا۔
''کیوں...... سلا کیوں دیا گیا؟ کوئی جرم نہیں کرنا جو اسے منظر سے غائب کرنا ضروری ہو جاتا۔'' سہیل بھڑک اٹھا، آگ لگانے کا فن بھرجائی کو خوب آتا تھا۔
''لگتا تو جرم ہی ہے، ورنہ اس حرکت کا مطلب؟'' بھرجائی کہاں دبتی تھی، تیلی پھینک کر تماشا دیکھنے والوں میں شمار ہوتی تھیں، سہیل نے انہیں گھورا اور ہونٹ بھینچے دھپ دھپ کرتا نیچے چلا گیا، بھرجائی البتہ محظوظ ہوتی مسکان لئے پراندہ جھلاتی مٹک مٹک کر سیڑھیاں اترتی نیچے آئی تھی۔

☆☆☆

اماں کی خواہش پہ اس نے مہندی کی رسم بھی جیسے تیسے کروالی تھی، ابا خاصے مطمئن نظر آئے، البتہ حمدان کے اتنی جلدی سو جانے کو محسوس کیا مگر کچھ بدمزگی نہیں کی، انہیں بیٹے کی فکر بھی ہونے لگتی، زبردستی کر کے غلط تو نہیں کر بیٹھے، مگر پھر خود کو تسلی دے لیتے، جو ہوا بالکل ٹھیک ہے، انہیں لگتا بلکہ یقین تھا، چند دنوں کی اکڑ دکھا کر یہی خفا خفا سا بیٹا بیوی کے آگے پیچھے پھرتا نظر آئے گا، انہیں کیا خبر تھی بیٹا کیا ٹھانے بیٹھا ہے، آگے پیچھے بیوی پھرے گی، یہ پھر بھی اسے خوار کرتا رہے گا، رسم کی ادائیگی تک وہ کسی نہ کسی طرح بیٹھا پھر وہاں سے اٹھ گیا تھا، کنیز نے اس سے کھانے کا پوچھا جس سے منع کرتا وہ پھر اپنے کمرے میں آ گیا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بے چینی رگ و پے میں سرائیت کرتی دل کو مسکن کیے بیٹھی تھی، سگریٹ پھونکتے ٹہلتے بھی تھکنے لگا، یہاں تک کہ نیچے ہنگامے سرد پڑتے چلے گئے، وہ اسی بے چینی کے زیر اثر باہر آ گیا، چھت پر چکراتے ریلنگ سے نیچے جھانکا، بیٹھک کی لائٹ جل رہی تھی، پنکھا پوری سپیڈ سے چلتا وہاں کسی کی موجودگی کا گواہ تھا، تب ہی کھلے دریچے سے اسے ابا جی بستر پہ لیٹے نظر آ گئے، پائنتی کی جانب سہیل بیٹھا ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا، ابا جی حقے کی لے منہ میں دبائے باتوں میں مشغول تھے، اس نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا، کچن بھی ابھی تک روشن تھا، چولہے میں آگ جل رہی تھی، کنیز اور اماں وہیں مصروف عمل تھیں، شادی تو کنیز کی بھی تھی، مگر وہ کہیں سے بھی دلہن نہ لگتی تھی، کام میں مصروف اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی، اک دلہن کو کل اس آنگن میں اترنا تھا، وہ پتا نہیں کیسا برتاؤ کرتی یہاں کے مکینوں سے، ویسا جیسا بھرجائی کرتی ہیں، طنز آمیز لہجہ، ہر بات میں جھگڑے کا رنگ شامل کرتی ہوئی، معاملوں کی سن گن لے کر اپنے انداز میں بھا تک پہنچا کر معاملہ بگاڑنے والی، کسی سے لگا کر نہ کھانے والی، یا پھر......
وہ دلہن جو نو سال قبل اس آنگن میں بہت ارمانوں سے اتری تھی، جس نے بڑے بڑے

دعوے کیے تھے، محبت کے، وفا کے، عہد و پیماں باندھے تھے، اپنے حسن کے جال میں جکڑا تھا اور پھر یہ جال خود ہی کتر بھی دیا تھا، جسے اس کے گھر والوں سے نفرت تھی، جوان کی شکلیں دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی، جسے اس سے محبت کا دعویٰ تھا، مگر وہ پھر...... پھر کسی اور سے متاثر ہو کر اس محبت کو خود ٹھوکر مار کر چلی گئی تھی، وہ کون تھی، وہ کہاں سے آئی تھی، کہاں چلی گئی، اس کا ذہن آج نا چاہتے ہوئے بھی انہی تکلیف دہ لمحوں کی یاد میں سلگ سلگ جاتا تھا، یادیں انگاریاں تھیں، چنگاریاں تھیں، جو اڑتی تھیں تو تن من جھلساتی راکھ کرتی تھیں اور وہ راکھ ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گریجویشن کے بعد اس کا لاہور کے پنجاب کالج میں داخلہ اس وجہ سے بھی لیٹ ہوا تھا کہ جن دنوں اس کے ایڈمیشن ہو رہے تھے، عین انہی دنوں ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی، بھا ان دنوں نئے نئے لڑ جھگڑ کر الگ ہوئے تھے اور ہر قسم کے تعاون سے ہاتھ کھینچ رکھا تھا، اوپر سے گندم کی کٹائی کا سیزن پھر گندم کی شہر کی منڈیوں میں سپلائی اور اس سے پہلے کے چھوٹے بڑے بے شمار بکھیڑے، اسے صحیح معنوں میں سر کھجانے کی بھی فرصت نہ مل سکی، ایسے میں داخلے بھرنے کا خیال کسے رہنا تھا، کاموں سے فراغت ملی تو ہوش آیا، ایسے میں داخلہ فیس جمع کرانے اور ایڈمیشن پر گاؤں سے شہر اور شہر سے گاؤں کے روز کے چکر پھر بھی لیٹ ہو جانے کی صورت میں خواری اور خجالت سہنی پڑتی وہ الگ، خیر اللہ اللہ کر کے یہ کام ہو گیا تھا، وکالت کی کلاسز کا باقاعدہ آغاز ہوا تو صبح منہ اندھیرے اٹھ کر نکلنا اور مغرب کی اذان کے ساتھ کبھی اس سے بھی تاخیر سے لوٹنا اماں اور دادی کو تشویش کا شکار کر جاتا، ایسے میں پھر بھی سکون نہیں تھا، وہ کبھی کھیتوں میں پانی کی باری بھگتا رہا ہوتا تو کبھی چھٹی کے دن بھی فصلوں کو کیڑوں سے بچاؤ کی دوائیں لینے بھاگا جا رہا ہوتا، یہ اتنی مشقت کا اثر تھا کہ چند دنوں میں وہ صحت کے اعتبار سے آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا، اس پہ راتوں کو جاگ جاگ کر پڑھتے چائے بار بار پینا، وہ واقعی کمزور ہو رہا تھا کہ ابا جی نے اسے ٹوکا۔

''ٹھیک سے کھایا پیا کر...... منہ ویکھا اپنا...... چوانی جیسا نکل آیا ہے۔''

ابا جی کا خیال کرنا تھی دادی اور اماں کو جگت لگا تھا، یا پھر یہ ایسی حقیقت تھی جوان کے کلیجے نوچ گئی تھی، کہ دونوں پنجے جھاڑ کر ابا جی کے پیچھے پڑ گئیں، ساتھ اس کی مشقتیں گنوائیں کچھ ایسے کہ ابا جی بوکھلا کر رہ گئے۔

''او بھلیئے لوکے! میں وی اس کا دشمن نہیں ہوں، پر اسے شوق ہے ہر کم نس نس کے آگے ہو کے کرنے کا، سہیل اتنا وی چوچا نہیں ہے، کچھ کم اس سے وی کرا لیا کرے، اپنی سخت پڑھائی۔'' ابا جی کی مگر سنی کسی نے انہیں اپنی سنانے بیٹھ گئی دادی۔

''میں دس رہی ہوں کما لے! ہاتھ منڈے کو پڑھن سے ہٹا لے نئیں تو یہ کم نہ کرا، ماڑا کر دیتا تو نے میرا ہیرے جیسا شیر پتر، یہی عمر ہوتی ہے صحت بننے کی اور تو نے اسے کوہلو کا بیل بنا ڈالا۔'' دادی کی لعنت ملامت جاری تھی، منیب بوکھلا گیا۔

''افوہ کچھ نہیں ہوگا مجھے دادی! اب ایسا بھی کمزور نہیں ہو گیا ہوں، ابا جی بھی کیا کریں اور سہیل کو اگر کام پہ لگا دیا تو پڑھائی بالکل نہیں کرے گا وہ نکما، آپ کو پتا تو ہے دل نہیں لگتا اس کا

پڑھائی میں۔''

''کلا کدھر تھا میرا پتر، اللہ نے تین تین بازو دیئے تھے، مگر یہ جو بعد میں آتی ہیں نا چنڑ ایس یہ کہاں اپنے سوا کسے جوگے رہنے دیتی ہیں، چند راتوں میں اپنی ملکیت بنا کر بیٹھ جاتی ہیں، اللہ سمجھے انہیں۔'' دادی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، وہ جھولی پھیلا کر بھابو کو کوس رہی تھیں، منیب نے دانستہ ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں دادی! میں آپ کے لئے ایسی نوں لاؤں گا جو ساس کے ساتھ ساتھ دادی ساس کی بھی دل و جان سے خدمتیں کرتی نہیں تھکے گی۔'' وہ ہنس رہا تھا، دادی کے ساتھ ساتھ اماں اور ابا جی کے چہرے پہ بھی روشنی سی چھا گئی۔

''وہ ایسی ہی ہو گی اللہ سائیں نے چاہا تو...... جیسی شکل سوہنی ویسی عقل بھی ہو گی۔'' دادی کے بے ساختہ کہی بات نے منیب کو البتہ حیرت میں ڈال دیا۔

''کیا مطلب؟ آپ نے خواب میں دیکھ لیا اسے؟'' پھر جیسے کسی خیال کے تحت بدک کر بولا تھا۔

''کہیں آپ نے کسی کو اس نظر سے میرے لئے پسند تو نہیں کر ڈالا؟ پہلے بتا دوں، بھابو کی بہن سکینہ بانو کا اگر خیال ہے تو نکال دیں ابھی کے ابھی دل سے...... ڈورے تو بہت ڈالتی ہے مجھ پہ مگر مجھے نہیں پسند وہ۔'' وہ سخت بدمزا ہو کر کہہ رہا تھا، دادی ہنستے ہوئے بے حال ہونے لگیں۔

''بے فکر رہ، ایسی کوئی گل نئیں، اک کو ہی بھگت لیں کافی ہے۔'' ان کے تسلی دلانے پہ منیب واقعی ریلیکس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پھر اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ابا جی نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے مستقل شہر میں رہائش کا انتظام کر دیا۔

''سہیل ہے میرے ساتھ، گزارہ کسی نہ کسی طرح ہو جائے گا، کچھ ہاری بھی مل جائیں گے مدد کو، تو بس اپنی پڑھائی پہ دھیان لگا۔''

''پڑھائی اتنی بھی ضروری نہیں ہے ابا جی! مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ اس عمر میں آپ پہ اتنا بوجھ ڈال کر خود ہر معاملے سے الگ ہو جاؤں۔'' وہ صرف پریشان ہی نہیں تھا، فکر مند اور شرمندہ بھی تھا، مگر ابا جی سنتے کہاں تھے۔

''تجھے کیا پتا پڑھائی کتنی ضروری ہے، اک گل سن لے منیبے میری کن کھول کے، میرے پتر تو نے بہت سارا پڑھنا لکھنا ہے، وڈا آدمی بن کے بڑے مقام پہ جانا ہے، سمجھ لے سرخرو کرنا ہے اپنے ابے کو، کیا سمجھا؟''

''وہ سب تو ٹھیک ہے ابا جی، پر ایسی شدت نہ رکھیں پلیز، کسی بھی چیز کی طلب اور محنت ضرور کرنی چاہیے، مگر اس کو سر پہ سوار نہیں کریں۔'' وہ انہیں سمجھا رہا تھا، ابا جی نے ضدی ہٹ دھرم انداز میں سر کو نفی میں ہلا کر بات رد کر دی۔

''میرے سر پہ ہی سوار ہے یہ بات بس۔'' منیب حیران رہ گیا ان کے طرز گفتگو و انداز پہ۔

''آپ نے کسی کے ساتھ شرط لگالی ہے ابا جی؟'' وہ جھلایا، ابا جی معنی خیزیت سے مسکرانے لگے۔

''ہے کوئی...... اور میں یہ شرط جیتنا چاہتا ہوں، پر جیتوں گا تب ہی اگر تو میری خواہش پوری کرنے کی سردھڑ کی بازی لگائے گا، حالات کیسے ہی ہوں پر وعدہ کر تو ہمت نہیں ہارے گا منیب۔''

اور منیب نے یہی اک بات ذہن نشین کرلی، یہ اس کے پہلے سال کا تیسرا مہینہ تھا، جب اس کی نیناں سے پہلی اور بھرپور ملاقات ہوئی، ملاقات بھی کیا...... اسے تصادم کہنا زیادہ بہتر ہوگا، وہ اس دن لیٹ ہوگیا تھا، سرظہیر کا لیکچر مس ہو جانا اس کے نزدیک بہت عظیم نقصان شمار ہوا کرتا تھا اور ان کی کلاس شروع ہوئے بھی پندرہ منٹ ہو چکے تھے، ہوا کے گھوڑے پہ سوار دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، جب مخالف سمت سے کوئی اس جیسی عجلت کا مارا اس کے سامنے آ گیا، تصادم یقینی تھا جو ہو کر رہا، جواب میں اس بے حد طرحدار ماڈرن نظر آتی لڑکی کے ہاتھوں میں موجود کتابیں چھوٹ کر زمین بوس ہوگئی تھیں۔

''اوہ...... آئی ایم سوری مس، ویری سوری، میں کچھ جلدی میں تھا۔'' جھک کر کتابیں سمیٹ کر اسے پکڑاتے منیب نے دانستہ اس لڑکی سے مارے خجالت کے نگاہ چار نہیں کی جو اس تصادم کے نتیجے میں اس کے سینے سے ہی آ کر لگ گئی تھی، یہ ایک لمحے کی بات تھی، مگر اس جیسے ایسی نزاکتوں اور حادثوں سے دور نوجوان کی پشیمانی گھبراہٹ اور ندامت فطری تھی، اس کے اوسان خطا ہورہے تھے، پسینے چھوٹ گئے تھے، اگر وہاں سے سرپٹ بھاگتے اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا تو نیناں نے ضرور اس تصادم سے لے کر اس کی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کے ساتھ مردانہ شرماہٹ کے اس مظاہرے کو بھی پوری جزئیات سے محسوس اور انجوائے کیا تھا، اس کے بعد دوسری یا تیسری مرتبہ وہ اتفاقاً یا حادثہً نہیں دانستہ اس سے ٹکراتی رہی اور لطف اندوز ہوتی رہی تھی، مگر منیب کے سادہ اور کسی حد تک معصوم ذہن میں یہ گمان تک بھی نہیں تھا کہ نیناں یہ سب دانستہ اور باقاعدہ پلاننگ سے بھی کرسکتی ہے، البتہ منیب کے دوست ثمر نے پورے وثوق سے یہ بات کہہ دی تھی۔

''وہ جان بوجھ کر تم سے ٹکراتی ہے منیب چوہدری!'' اور منیب چوہدری جلال میں آ گیا تھا۔

''بکواس مت کر، کوئی لڑکی بھلا ایسی فضول حرکت کیسے کرلے گی۔'' اس بات کو سن کر منیب کو شرم آگئی تھی اور ثمر کے ساتھ فیضان بھی ہنستا چلا گیا اس سادگی پہ۔

''تو صرف پینڈو ہی نہیں ہے، عقل سے بھی پیدل ہے قسم سے، یار احمق اعظم! تجھ جیسا شہزادہ سامنے ہو تو پھر سب کچھ ہوسکتا ہے، کیا سمجھا؟'' وہ آنکھیں نچا رہا تھا اور منیب ہونق نظر آنے لگا۔

''کیا مطلب......؟'' اس کی شکل پہ ہنوز حماقت برس رہی تھی۔

''تو نے کبھی خود کو غور سے آئینے میں دیکھا ہے؟ یقیناً نہیں، اب دیکھ لینا، جواب مل جائے گا، ورنہ نیناں تو مجھے ضرور بالکونی سے گھنٹوں کے حساب دیکھتی ہے اور تکتی نہیں، میری بات لکھ کے رکھ لے، وہ عنقریب محبت کا اظہار کرے گی تجھ سے۔'' منیب چند لمحوں کو جھینپ گیا، پھر اس بات کو بھول گیا، مگر فیضان کی بات وقعی سچ ثابت ہوگئی، چند دن بعد نیناں نے اسے خود چائے کی آفر کر دی تھی اور اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھے منیب چوہدری کی شکل دیکھنے والی ہوگئی تھی، کالج بھر

کی حسین ترین اور خاص لڑکی خود اس کی طرف مائل تھی، کتنی آنکھوں میں اس پل منیب کے لئے رشک و حسد تھا، ستائش تھی، مگر منیب کا چہرہ فق ہوا جاتا تھا۔

''ہم نے تو ابھی چائے ختم کی ہے اور میں دن میں بس ایک بار چائے پیتا ہوں۔'' جان چھڑانے کو جو بہانہ اس نے گھڑا وہ اس قدر احمقانہ اور بودا تھا کہ نیناں کے ساتھ اس کے دوست بھی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

''اٹس او کے منیب چوہدری! آپ چائے نہ پینا، کولڈ ڈرنک لے لینا، مگر ہمیں یہ اعزاز تو بخشیں۔'' وہ پر اعتماد ہی نہیں تھی، بے باک بھی تھی، منیب گڑبڑا کر بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، گویا سمجھ نہ پا رہا ہو اب کیا کرے، ایسے میں ثمر کی سرگوشی نے اس کا اعتماد مزید ڈگر گوں کر دیا۔

''جا میرے شہزادے! حوصلہ پکڑ، عین ممکن ہے بیوٹی کوئین محبت کا اظہار نہ کرے، کوئی اسائمنٹ ہی بنوا لے تجھ سے۔'' اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھنے لائق تھیں، ثمر وغیرہ نے اسے باقاعدہ نیناں کی جانب دھکا دے دیا تھا اور گویا اس کے پاس کوئی راہ فرار نہیں بچی تھی، یہ پہلی ملاقات کسی حد تک رسمی رہی، جبھی وہ قدرے ریلیکس ہوا، مگر نیناں کو توجہ حاصل کرنا اور مائل کرنا آتا تھا، حسن کے جلوے دکھانا، اداؤں کے جال پھینکنا اور دام میں جکڑ لینا، اسے سب ازبر تھا، وہ آج تک لوگوں سے وصولتی آئی تھی، مگر منیب پہ وہ خود دل کھول کر لٹاتی تھی، تاخیر سے سہی مگر وہ کامیاب ٹھہری، جس دن منیب نے از خود اسے بتایا وہ اس کی کمی کو محسوس کرتا ہے، نیناں کو لگا تھا وہ ہی فتح کا دن ہے، اس سے قبل وہ سینکڑوں بار منیب سے یہ بات کہہ چکی تھی، اس سے کہلوانے آکسانے کو اور اس دن کا انتظار کرتے کئی مہینے ضائع ہو گئے تھے، منیب چوہدری ہرگز آسان ہدف ثابت نہیں ہوا تھا، مگر وہ اس چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

''میں عورت کے اظہار محبت کو معیوب نہیں سمجھتی ہوں منیب! میں پورے فخر اور اعتماد کے ساتھ یہ کہتی ہوں کہ مجھے تم سے پہلی نگاہ سے ہی شدید محبت ہو گئی تھی، صرف محبت نہیں، میرے پاس تم سے جدائی کا تصور بھی نہیں ہے۔'' اس نے کتنے اعتماد سے کہا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ منیب بجائے جھینپنے یا شرمانے کے فخریہ انداز میں سر اٹھا کر مسکرانے لگا۔

''جدائی کا تصور تو میرے پاس بھی نہیں ہے نیناں مگر میں بہتر سمجھتا ہوں کہ کچھ معاملات پہلے کلیئر کر لوں تم سے۔''

''کون سے معاملات؟'' نیناں ٹھٹک سی گئی۔

''شادی کے بعد میں اپنی بیوی کو گاؤں میں اپنے پیرنٹس کے ساتھ رکھوں گا، تم شاید ایڈجسٹ نہ کر سکو۔'' وہ متامل تھا، مگر نیناں لاپرواہ اور بے نیاز۔

''مجھے تم سے مطلب ہے منیب! تم مجھے کسی جھونپڑی میں بھی رکھو گے تو وہاں بھی رہوں گی، محبت کو کیا سمجھتے ہو تم، کوئی معمولی چیز؟ اس میں بہت اسٹیمنا بہت پاور ہوتی ہے۔''

وہ کیسے بلند و بانگ دعوے کیا کرتی تھی، یہی تو اس کی لفاظی تھی، چرب زبانی تھی، جس نے منیب جیسے سادہ لوح نوجوان کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا، وہ سمجھا تھا، جو کہتی ہے، سچ ہے، وہ ایسی ہی ہو گی، وہ کیسی تھی یہ تو اسے بہت بعد میں جا کے معلوم ہو سکا۔

''مجھے تو تمہاری ہر بات کا اعتبار ہے نیناں، مگر بہتر ہو گا پھر بھی کہ جو تم میرے پیرنٹس سے مل لو، ہمارا ماحول دیکھ لو، تا کہ کل کو تمہیں مجھ سے شکایت نہ ہو کہ میں تم سے کچھ چھپاتا تھا۔'' وہ ہنوز متامل تھا، نیناں جھنجھلانے لگی۔

''تمہیں میرا اعتبار ہی نہیں ہے منیب! خیر اگر تم ایسا کر کے مطمئن ہو سکتے ہو تو مجھے اعتراض نہیں، بتاؤ کب لے جا رہے ہو اپنے پیرنٹس کے پاس مجھے، میرا خیال ہے اسی ویک اینڈ پہ ٹھیک رہے گا۔''

وہ خود ہی سب کچھ منٹوں میں طے کر لیتی، منیب البتہ بہت بوکھلا کر رہ گیا، اس کے گھر کا ماحول نیناں کے ماحول جیسا کہاں تھا، جہاں اپنے بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ کو اتنی آسانی و سہولت سے لے جا کر ملا دیا جاتا، وہ تو جب نیناں کے ساتھ اس کے گھر اس کی مدر سے ملنے گیا تب بھی کتنا سٹپٹایا ہوا تھا، بلکہ جانے پہ آمادہ ہی نہ ہوتا تھا، وہ تو نیناں خود ہی اسے زبردستی گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے گئی تھی، کہ مام ملنے کو کہہ رہی ہیں تم سے۔

''یار جوتے نہ پڑوا دینا مجھے۔'' اس نے جب چوتھی بار اضطراب کی کیفیت میں یہی بات کہی تو نیناں الٹا خفا ہونے لگی تھی۔

''یہ مت بھولو منیب چوہدری کہ تم نیناں کے گھر جا رہے ہو، اپنے نہیں۔'' تب اس کا یہ تیکھا ترشی طنز منیب کو شرمسار کر گیا تھا۔

''کس سوچ میں گم ہو منیب! اپنے ساتھ لے جانے پہ اتنے متامل ہو تو شادی کرنے میں کتنے ہو گے تم۔'' وہ کتنی برہمی سے کہہ رہی تھی، منیب ہڑبڑا کر رہ گیا، گھبرا سا گیا۔

نیناں کی کسی بھی بات کے پیچھے پڑ جانے والی عادت سے منیب کو بہت چڑ محسوس ہوا کرتی، اس وقت بھی اس نے بے بس انداز میں اسے دیکھا، وہ یہ بات کہہ کر اسے اپنے پیچھے پڑوانا نہیں چاہتا تھا، کہ اس نے ابھی تک گھر میں نیناں کا سرسری سا بھی ذکر نہیں کیا، وہ اس کا مسئلہ نہ سمجھتی بلکہ صرف اس بات پر خفا ہوتی کہ اس کے نزدیک نیناں کی اہمیت ہی اتنی ہے، کسی نہ کسی طرح اسے اگلے ہفتے پہ ٹال کر وہ خود ابا جی سے بات کرنے کا حتمی فیصلہ کر کے گاؤں پہنچا تھا، یہ جون جولائی کے گرم ترین دن تھے، سورج کی تیز تپش درختوں کی جڑوں تک کو گرمائے دے رہی تھی، بھری دوپہر میں جب وہ پسینوں سے بھیگا بس سے اترا تو ہر سمت دھول اڑ رہی تھی، گاؤں کو جاتا رستہ ویران اور دھوپ میں سلگتا تھا، گاؤں کو صرف ایک تانگہ جاتا تھا، جو اڈے پہ موجود نہیں تھا، یہ رستہ تو اس کے پیروں کو لگا ہوا تھا، بیگ کاندھے پہ ڈالے وہ راستہ ناپنے لگا، نہر گاؤں کے آغاز میں تھی، جو بھی گاؤں آتا، وہ نہر کا پل کراس کر کے آتا تھا، جہاں گاؤں ختم ہوتا وہاں جنگل شروع ہو جاتا، یہ جنگل گھنا اور تاریک تھا، جس کے بیچ سے سڑک گزر کر شہر تک جاتی تھی، اونچے درختوں کے درمیان ایک قطعہ خالی تھا، سوکھے پتے جا بجا گرتے رہتے، جب وہ چھوٹا تھا تو ابا جی کے ساتھ ایندھن کے لئے یہاں لکڑیاں کاٹنے آیا کرتا، یہاں قدم قدم پہ اس کی یادیں وابستہ تھیں، اسے یہاں کے چپے چپے سے انسیت تھی، وہ یہ سب باتیں نیناں کو بتایا کرتا اور اسے لگتا وہ بہت دھیان سے سنتی ہے، اسے کبھی معلوم نہ ہو سکا، وہ دھیان سے اس کے چہرے کو اس کی خوبصورتی کو دیکھتی

ہے اور بس۔

گھر پہنچا وہ تو دھول مٹی اور پسینے سے اٹا تھا، مگر تھکن زرہ برابر بھی نہیں تھی، ابا جی نیم کی گھنی چھایا میں دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتے ہوا کے مست جھونکوں میں بے خبر تھے، درخت کی شاخ پہ بیٹھا کوآبار بار بولتا تھا، اس نے دانستہ انہیں بے آرام نہیں کیا۔

''ویرے! میرے لئے شہر سے کیا لایا ہے؟'' کسی جانب سے مٹی سے ستے ہاتھوں سمیت کنیز بھاگتی آئی تھی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر مچلی، منیب نے جھک کر اسے خود سے الگ کیا اور نرمی سے ڈانٹا۔

''کتنی بار منع کیا ہے کنیز فاطمہ کو مٹی سے نہیں کھیلتے۔''

''میں اب کبھی نہیں کھیلوں گی ویرا!'' وہ آنکھیں معصومیت سے پٹپٹا کر کہتی وعدہ کررہی تھی، منیب نے اس کی پسندیدہ میٹھی گولیاں اور جلیبیوں کا لفافہ اس کے حوالے کرنے سے قبل کھیتوں کو سیراب کرتے ٹیوب ویل کے پانی سے اس کے ہاتھ دھلوائے تھے۔

''سہیل کدھر ہے؟''

''وہ تو اپنے بیلیوں (دوستوں) کے ساتھ گڈیاں لوٹنے گیا ہوا ہے۔''

کنیز کی ساری توجہ اب اس لفافے پہ مرکوز تھی جس میں اس کی مرغوب چیزیں تھیں، منیب اس کا ہاتھ پکڑے گھر چلا آیا، اماں بھٹی میں آگ دہکائے روٹیاں پکانے میں مصروف تھیں، خود ہی روٹی ڈالتیں خود ہی سینکتی ہوئیں، حالانکہ یہ کام ایک بندے کے بس کا نہیں تھا، دادی مدد کروایا تو کرتی تھیں مگر جب سے آنکھوں کا آپریشن ہوا تھا، دھوئیں سے بچنا ضروری تھا، منیب نے سلام کے بعد پنکھا ان کے ہاتھ سے لے لیا، اماں ٹوکتی رہ گئیں مگر وہ ان سنی کیے کام کرتا رہا، اک کے بعد دوسری روٹی سینکتا اور جھاڑ کر رومال میں لپیٹ کر چنگیر میں رکھ دیتا۔

''میں چاہتا ہوں اماں! اب آپ کے ساتھ کوئی ہاتھ بٹانے والی آجائے، تھک جاتی ہیں آپ کام کرتیں۔'' اس نے بات کا آغاز کردیا، بے وقوف ہی تھا، حالانکہ ذرا سی عقل استعمال کرتا تو جان سکتا تھا، جیسے وہ سوچتا ہے، ایسا ہونا ناممکن ہے، نیناں جیسی لڑکی اور یہاں گاؤں کے ماحول میں نہ صرف ایڈجسٹ کرے بلکہ اس کے والدین کی خدمت بھی کرے، وہ واقعی احمقوں کی جنت میں رہتا تھا، اس کے لئے چاٹی کی لسی میں نمک ملا کر برف ڈالتی اماں بے ساختہ ہنس دیں، پھر کسی قدر متبسم نظروں سے اسے دیکھا۔

''یعنی تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اب ہم تیری ووہٹی لے آئیں؟'' اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ بجائے جھینپنے کے پورے اعتماد سے سر اثبات میں ہلانے لگا تھا۔

''ہاں یہی مطلب ہے اماں! آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے، اب میری ذمہ داری ہے کہ کچھ نہ کچھ آپ کے لئے بھی کروں۔'' اس کے سادہ لہجے میں خلوص کی چاشنی تھی، اماں متاثر ہوئی ہوں گی یقیناً جبھی ان کا لہجہ مزید محبت آمیز ہوگیا۔

''پر پتر ابھی تو پڑھ رہا ہے تو......اور پھر تیرے ابا......''

''ابا جی منع تھوڑی کریں گے اماں! نیناں ہے ہی اتنی اچھی......ساتھ پڑھتی ہے میرے......

میں چاہتا ہوں اسے آپ سے ملوادوں، بہت پسند آئے گی وہ آپ سب کو یقیناً۔'' ان کے ہاتھ پکڑے وہ کتنے یقین سے کہہ رہا تھا، شاید اپنا فیصلہ سنا رہا تھا، اماں کو کہاں اس سے اتنے بڑے فیصلے کی توقع تھی، بس ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھتی رہ گئیں، یہی بات جب ابا کو پتا چلی وہ اماں کی طرح خاموش نہیں رہے، نہ انہوں نے خود پہ جبر کیا، نہ صبر کا مظاہرہ ضروری سمجھا، گرج اٹھے تھے حسب عادت۔

''تو نے یہ کیسے سوچا منیبے کہ تو اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اکیلا ہی کرے گا، سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں ابھی تمہاری شادی ہی نہیں کروں گا اور ایسی لڑکی سے تو بالکل نہیں جو لڑکوں کے ساتھ پڑھتی کم انہیں پھانستی زیادہ ہو، اک گل اور کن کھول کے سن لے اج تو...... میرے پاس تو میرے بھرا کی امانت ہے، اس کی نکی دھی کی پیدائش پہ یہ رشتہ ابا جی نے طے کیا تھا، ہم دونوں بھائیوں کے درمیان...... اس کا ٹوٹنا ہم بھائیوں کا آپس میں تعلق ٹوٹنا ہے، وہ مر گیا سمجھ جس نے اس عہد کو توڑا، تجھے اتنا پڑھا لکھا میں کیوں رہا ہوں، اپنی جان خوری کر کے اپنی ہڈیوں سے ماس کھینچ کھینچ کے میں تجھے بڑا آدمی کیوں بنا رہا ہوں کدی سوچا تے نئیں ہوگا تو نے، اوئے پاگا...... تجھے شہزادوں جیسی زندگی میں نے اس لئے دی تھی کہ تو شہر جا کے ایسی بدقماش عورتوں کے ساتھ اکھ مٹکا کرتا پھرے، باز آجا ورنہ اتنے چھتر ماروں گا کہ کھوپر گنجا ہو جائے گا تیرا، فیر ناں نہ لیئں میرے سامنے کسی ہور کڑی دا۔'' انہوں نے جو اس کے لتے لیے تھے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ عقل کو ہاتھ مارتا، مگر وہ الٹا اس بات کو ہی انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ گیا، پھر لڑائی جھگڑا سب کچھ ہوا، مگر جیت اس کے حصے میں آئی، یہ طے تھا کہ اسے جیتنا تھا کہ اس کے منہ میں جو زبان بولتی تھی، وہ اب اس کی نہیں تھی، اسے ہر قیمت یہ حاصل کرنے کا عزم باندھے نیناں کی تھی، جس میں لحاظ اور مروت کا شدید فقدان تھا، جس میں دھمکیاں اثر دکھاتی تھیں اور ابا نے جان لیا، اولاد سے سر اونچی ہوگئی ہے تو ان کی مرضی بھی ختم ہوگئی ہے، پھر تو بس مان اور بھروسے ہوتے ہیں، کوئی رکھ لے تو رہ جاتے ہیں، نہ رکھے تو سب ختم اور یہاں سب ختم ہوتا نظر آرہا تھا، جبھی ہتھیار ڈال دیئے اور منیب کے پاس یہ تک سوچنے کی فرصت نہ تھی، کہ وہی ابا جی جنہوں نے بڑے تھسے کے ساتھ بھا کو ان کی بیوی کے ساتھ رخصت کیا تھا اور ذرا نہ ڈگمگائے تھے، وہ اس کی باری اتنا کمزور کیوں پڑ گئے تھے ایکدم۔

اس نے نہیں سوچا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کہ جب با خوشی بارضا اپنی زندگی کا اختیار غیروں اور نا اہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو پھر سوچیں آزادنہ فیصلوں کے قابل نہیں رہتی ہیں، وہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا اس کے اس فیصلے نے کتنے دلوں کو توڑا ہے، جس روز وہ نیناں کو گاؤں ملوانے کو لایا، اماں کا مکدر دل مزید مکدر ہو کر رہ گیا۔

''یہ گھر بسانے والی عورت نہیں لگتی منیبے پتر! کیوں مت وج گئی ہے تیری۔'' یہ دادی تھیں، جن کی بات کا وہ سخت برا مان گیا تھا۔

''اگر ہم کسی کو اس کا بنیادی حق یعنی اسے عزت ہی نہ دے سکیں گے تو وہ ہمیں کیسے قبول کرے گا دادی! نیناں کو آپ اس لئے بھی اپنا ئیں کہ وہ میری پسند میری محبت ہے۔''

اور دادی نے چپ سادھ لی تھی، تمام آنسو اندر گرا کر، اس پل اماں کو اس میں اور بھا حبیب

میں بال برابر بھی فرق محسوس نہ ہوا تھا، بھا حبیب تو پھر اچھا تھا، ماں باپ کی پسند سے شادی کی تھی، بیوی نے زیادہ نہ سہی کچھ عرصہ ان کی خدمت بھی کی، منیب تو پہلے ہی اس حرافہ کے دام میں پوری طرح جکڑا نظر آنے لگا تھا، انہوں نے ہر آس ختم کر دی، ہر امید سے ہاتھ کھینچ لیا، اس کے باوجود ابا جی نے اس کا ہر شگن پورا کیا، دھوم دھام سے شادی کی، تو اس کی وجہ وہ اپنے منیب کو کھونا نہ چاہتے تھے، اتنی ہی محبت تھی انہیں اس سے۔

منیب بھلے جتنا بھی نیناں کی مٹھی میں تھا، مگر اپنی ہٹ کا پکا نکلا تھا، رخصت کرا کے اسے گاؤں ہی لایا، اس نیم پختہ مکان کا ایک حصہ جدید سہولیات سے مزین کر دیا گیا، اس کے باوجود نازک مزاج بہو کے ماتھے کی تیوریاں نہیں کھلتی تھیں، وہ کسی سے بھی سیدھے منہ بات نہ کرتی تھی، جو لباس وہ پہنتی تھی وہ یہاں کے ماحول سے میل نہ کھاتا تھا، اس کے باوجود گھر کے ہر فرد نے آنکھیں اور کان بند کیے رکھے، منیب سے اس کا پہلا جھگڑا شادی سے محض ایک ہفتے بعد ہوا، یہ جاتی گرمیوں کے دن تھے اور نینا کو اس گھر اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی، محبت کا حسن کا خمار اترا انہیں بھی تھا تو دھیما ضرور پڑ گیا تھا، اسے مچھر اور مکھیوں سے نفرت تھی اور یہاں ان کی بہتات تھی، خدمت تو دور کی بات وہ تو الٹا بوجھ بن گئی تھی اماں پہ، انہیں دن میں تین ٹائم ٹرے سجا کر پیش کرنا پڑتی، اس پہ وہ ناک بھوں چڑھاتی ہزار نقص نکال کر کھانے سے انکار کر دیا کرتی، یہی نازک مزاجی منیب سے برداشت نہ ہو سکی اور اختلاف شروع ہو جاتا، منیب اسے عہد اور وعدے یاد دلاتا تو نینا الٹا اس پہ چلانے لگتی۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے منیب چوہدری، میں یہاں کام کروں گی؟ میں تو اپنے امریکن اسٹائل کچن میں کھڑی ہو کر بھی چائے نہیں بناتی تھی، پھر یہ......“ اس کے لہجے میں کتنی حقارت کتنی تضحیک کا عنصر ہوتا تھا، یہ ابھی تو منیب سمجھ سکا تھا۔

”تم شکر ادا نہیں کرتے ہو کہ میں یہاں رہتی ہوں، حالانکہ یہ جگہ ہرگز اس قابل نہیں، مگر صرف تمہاری وجہ سے...... ورنہ میری اسکن کا ناس ہو رہا ہے۔“ وہ بھڑک بھڑک کر جتلاتی، منیب جو اس کے بدلے رنگ ڈھنگ سے حیران تھا، غصے سے بھرنے لگتا۔

”یہ تم مجھ پہ ہرگز احسان نہیں کر رہی ہو، تمہاری اپنی منتخب کردہ ہے یہ زندگی، سمجھیں؟ میں تمہیں بتا چکا تھا کہ......“

”وہ حماقت تھی میری، محض تمہیں حاصل کرنے کو آزمایا گیا ایک حربہ...... ورنہ میں کیوں تمہارے اجڈ اور گنوار پیرنٹس کی خدمتیں کروں گی جن کا حلیہ اور رہن سہن میرے ملازموں سے بھی کم تر درجے کا ہے۔“

”شٹ اپ۔“ بات سخت تھی، تلخی کی حد تک کاٹ دار اور طیش میں مبتلا کر دینے والی، جبھی وہ صرف دھاڑا نہیں، اس کا زور دار طمانچہ بھی نیناں کے چودہ طبق روشن کر گیا، وہ ایسی توقع کہاں رکھتی تھی، اس جلالی تھپڑ سے تیورا کر آدھی بستر پہ آدھی نیچے گری، کتنی دیر حواس سلامت نہ ہو سکے، منیب کا غصہ مگر ختم کہاں ہوا تھا، اس نے اس کی کلائی پکڑ کر ایک زور دار جھٹکا دے کر کسی بے وزن شے کی مانند اسے اپنے مقابل کھینچ کر کھڑا کر دیا۔

''بولو...... آئندہ کرو گی اس قسم کی بکواس؟''

وہ اتنا مشتعل تھا گویا ابھی اس کا گلا دبا دے گا، اس کی آنکھوں میں واقعی خون اترا ہوا تھا، نیناں کو اس سے خوف محسوس ہوا، مگر یہ اک لمحے کی بات تھی، اگلے لمحے وہ اسے زور سے دھکیل کر ہیجانی انداز میں چیختی باہر بھاگی تھی، یہ اتفاق تھا کہ اس روز بھر جائی بھی آئی ہوئی تھی، اک تماشا لگا، اک قیامت آ گئی، وہ ایسی عورت ہی نہ تھی جو لحاظ مروت یا پھر مصلحت سے آگاہ ہوتی ہے، جبھی خوب اسے ذلیل کیا، وہ اس کی فیملی کا خیال کیئے بغیر اس پہ الزام لگاتی رہی اور یہیں پہ اکتفا نہیں کیا، بیگ اٹھائے میکے جانے کو تیار ہو گئی۔

''دو ٹکے کے معمولی انسان کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم خود کو کچھ سمجھنے کی غلطی کر رہے ہو نیناں کے آگے، تمہارے جیسے لاکھوں مرد میرے قدموں کی ٹھوکروں میں ہوتے ہیں۔'' وہ اسے اس کی اوقات یاد دلا رہی تھی، منیب کی غیرت پہ یہ ایسا تازیانہ تھا، جس نے اسے خون میں نہلا دیا، وہ اپنا بھگتان خود بھگتنا چاہتا تھا، مزید طیش مزید ذلت بھی گویا۔

''بیگ واپس رکھو نیناں اور آرام سے بیٹھ جاؤ، مسائل ایسے حل نہیں ہوا کرتے۔'' بھابھو کی چبھتی نظروں سے آنکھیں چراتا وہ ہی مصلحت پہ اترا تھا، مگر نیناں کا تکبر ساتویں آسمان پہ پرواز کرتا رہا۔

''مسائل تمہارے ہیں، حل بھی تم انہیں کرنا سمجھے۔'' جواباً وہ آنکھیں نکال کر غرائی، منیب نے خون کا گھونٹ بھرا۔

''مسائل اب ہمارے سانجھے ہیں نیناں! تم مجھ سے الگ نہیں ہو۔'' اسے ہی رسان سے بات کرنی پڑ رہی تھی، دونوں طرف اکڑ ہو تو معاملے نہیں سلجھا کرتے، یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔

''میں صرف اس صورت تمہارے ساتھ ہوں اگر تم اپنے ان قابل شرم رشتوں کو خود سے الگ کر کے میرے ساتھ شہر میں رہو، ورنہ میرا بہر حال تم سے کوئی رشتہ نہیں بچے گا۔''

شادی کے محض ایک ماہ بعد اس کے والدین اور بھائی بہنوں کو اچھی طرح ذلیل کر کے وہ اپنے تئیں عاجز ہو کر یہاں سے جا رہی تھی، ایک بار پھر اس نے منیب کے والدین کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال کیا یہ انتہا تھی اس کی برداشت کی بھی اور صبر بھی، اس نے نینا کو جانے سے نہیں روکا، وہ شاید اب نیناں کے لئے گنجائش نہیں رکھتا تھا، مگر اس بار ابا جی اس کے آڑے آ گئے تھے، ایک ہی ہفتے میں دسویں بار انہوں نے جب نیناں کو منا کر واپس لانے کا حکم دیا اور اس نے نظر انداز کیا، ان سنا کیا تو انہیں غضب کا طیش آیا تھا۔

''وہ تیرے بچے کی ماں بننے والی ہے اور تو اسے بے سہارا چھوڑ کر آرام سے بیٹھا رہے گا تو منیبے ایسا نہیں ہو گا، کچھ شرم کو ہتھ مار اور اسے جا کر واپس لا۔''

''وہ یہاں واپس نہیں آئے گی ابا جی! اس کے مطالبات پورے کرنا میرے بس کی بات نہیں۔'' وہ کتنا بے بس لگتا تھا، کتنا عاجز، شادی شدہ زندگی نے اسے سوائے ذہنی انتشار اور اذیت کے کچھ نہیں دیا تھا، ہر لمحہ اضطراب تھا، ہر لمحہ پچھتاوا، وہ کس مصیبت میں پڑ گیا تھا۔

''یہاں نہیں رہنا چاہتی، ٹھیک ہے، وہاں رکھ اسے جہاں وہ رہنا چاہتی ہے گل مکا۔'' ابا جی

چارپائی پہ بیٹھے چاول کھا رہے تھے، تھوڑے تھوڑے ہمایوں کے منہ میں بھی ڈال دیتے جو پاؤں پاؤں چلتا تھا دادے دادی کی محبت میں یہاں گھسا رہتا، کہ یہاں سب پیار بھی تو بہت کرتے تھے، مگر جب بھابھو کا کسی بات پہ میٹر گھوما ہوتا خوب خوب گرجتیں اگلے پچھلے طعنے دیتیں اور بچے کو دو ہنٹروں سے اماں کو دکھا دکھا کر مارتی وہاں سے لے کر چلتی بنتی، مگر وہ بچہ تھا، پھر آن دھمکتا، منیب کو ابا جی کے اس فیصلے نے بھونچکا کر کے رکھ دیا، اس کی آنکھوں میں تحیر کا اک جہان آباد نظر آیا، اتنا آسان تھا یہ......؟

وہ تو بھا حبیب کی اس چشم پوشی کو بے غیرتی سے تعبیر کرتا تھا، والدین بے کار فالتو سامان نہیں ہوتے جنہیں خوشحال خودمختار ہونے پہ پھینک دیا جاتا ہے، وہ تو ایسا تصور بھی گناہ سمجھتا تھا۔

''یہ ہرگز بھی ممکن نہیں ہے ابا جی! میں اس کے ساتھ شہر میں نہیں رہوں گا۔'' وہ غصیلا ہونے لگا، ابا البتہ تحمل سے نرمی سے ٹوک گئے تھے۔

''اس سے پہلے بھی تو، تو شہر میں رہتا تھا، اب کیا حرج ہے؟'' ابا جی کو پتا نہیں کیوں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا، یا شاید وہ غم و غصے کے بعد صبر و برداشت کی اس منزل پہ آ پہنچے تھے، جہاں ہر قسم کا نقصان برداشت کرنے کی ہمت خود بخود پیدا ہونے لگتی ہے۔

''وہ ایک یکسر الگ معاملہ تھا ابا جی، مجھے تعلیم مکمل کر کے واپس یہیں آنا تھا، چچا جمال اور بھا حبیب کی طرح میں اپنے اصل سے کٹ نہیں سکتا، مجھے یہ کسی بھی طور گوارا نہیں ہے۔'' کتنا جذباتی ہو رہا تھا وہ، جیسے کچھ سننے پہ آمادہ نہ ہو، مگر ابا جی کو اس کی اس بات نے ضرور غصے سے نیلا پیلا کرنا شروع کر دیا۔

''صرف گلیں کرنے سے کچھ نہیں ہوا کرتا پتر! کچھ کر کے دکھانے کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے، یاد ہے منع کیا تھا تجھے کہ اس زنانی سے ویاہ نہ کر جو عمر میں تجھ سے دو چار سال آگے ہی نہیں چھٹی ہوئی بھی لگتی ہے، پر تو مانا؟ اب اپنا گل سیاپا ڈالا ہے تو اس ڈھول کو بجانا تو پڑے گا، نسل کی امین بن چکی ہے اب وہ ہماری، ایسے نہیں چھوڑا جا سکتا ہے اسے، میری فکر میں دبلا نہ ہو، ہم سنبھال لیں گے خود کو، ہمارا اللہ سائیں وارث ہے، میں سمجھ لوں گا میرے نصیبوں میں پتروں کا ساتھ یہیں تک تھا، گرہستی وستے دیر لگتی ہے پر اجڑنے میں ٹیم نہیں لگدا، میں نہیں چاہتا تیرا گھر اجڑے، تیرا دل ویران ہو، جا میرا پتر، اب تو چلا جا۔''

پھر اس دن نہ سہی مگر اگلے کچھ دنوں تک ضرور ابا جی نے اسے سمجھا بجھا کر اسے اس امر پہ مجبور کر دیا تھا، جس پہ نہ اس کا ذہن آمادہ تھا نہ اس کا دل، مگر کچھ فیصلے واقعی ناگزیر ہوتے ہیں، گلے کا طوق بن کر شہ رگ کے نزدیک گھیرا تنگ کرنے لگتے ہیں، یہ بھی ایسا ہی فیصلہ ثابت ہوا تھا، جس روز وہ اپنا گھر اپنے والدین اور بھائی بہن چھوڑ کر جا رہا تھا، اس کا دل خون ہوا جاتا تھا، ابا جی نے کہا تھا انہوں نے اسے پتر نہیں دھی سمجھ کر رخصت کر دیا، اسے اپنا آپ کسی لڑکی کی طرح ہی لگا تھا، مجبور بے بس لاچار، جس کے پاس سمجھوتے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچتا، دل آمادہ ہو نہ ہو، مگر زندگی کو زہریلے گھونٹ کی مانند حلق سے اتارنا ہی اتارنا ہے، وہ اندر سے تو بجھا ہی تھا، ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید خالی ہوتا چلا گیا، نیناں اپنی فتح پہ شاداں تھی، منیب اسی قدر بے بس اور ملول،

اس نے تب جانا، نیناں کو اس سے محبت ہی نہ تھی، محبت بھلا مخالفت پہ کب اکساتی ہے، محبت تو محبوب کی رضا و تسلیمات کا دوسرا نام ہے، اس میں فتح نہیں شکست تسلیم کرنا ہی اہم ترین حصہ ہے، اپنی اپنی انا کی اپنے آپ کی مگر نیناں کے اندر ایسا کوئی احساس نہیں تھا، وہ اپنی نہیں اس کی نفی کر رہی تھی، اسے نچوڑ رہی تھی، اسے ختم کر رہی تھی۔

وہ بے غیرت نہیں تھا، وہ اسے بے غیرت بنانے پہ تلی تھی، وہ اسے کہتا، مجھے ایسے ملبوسات پسند نہیں، وہ اس کی ضد میں مزید بے باکی پہ اتر جاتی، اسے نینا کا آزادانہ ہر جگہ گھومنا اپنے میکے جا کر کزنز سے بے تکلفانہ ملنا پسند نہیں تھا، نیناں نے اس ناپسندیدگی کو بھی اہمیت نہ دی، پریگنینسی پریڈ کے دوران جب اس کا جسم ہر گزرتے دن کے ساتھ بے ڈھب ہو رہا تھا وہ اتنی بے شرم تھی پھر بھی دوپٹہ خود پہ حرام کیے رکھتی، منیب کا ضبط اس وقت بالکل جواب دینے لگا، جب نیناں کا امریکہ پلٹ کزن خضر حیات اس سے ملنے کی غرض سے گھر پہ بھی آنے لگا اور آنا جانا اتنا ہی بے معیار اور آزادانہ تھا جتنے وہ دونوں خود تھے، خضر بالکل لحاظ نہیں رکھتا تھا بیڈروم تک میں گھس آتا، نیناں کی وہی بے حجابیاں نائٹ ڈریس میں ہی اس کے ساتھ قہقہے لگاتی نظر آتی۔

منیب سے یہ سب برداشت کرنا محال تھا، آئے دن اسی بات پہ جھگڑا ہوتا اور طول پکڑے جاتا، مگر نیناں کو کسی بات کی پرواہ نہ تھی، منیب کی آنکھوں کے سامنے ایسی شرمناک گفتگو ہوتی بے تکلفی ایسی کہ اس کا خون کھول اٹھتا، یہ ختم ہوتی برداشت اور غیرت کا جوش ہی تھا کہ اس نے طیش میں ابلتے بپھرتے ہوئے خضر حیات کو مار مار کر ادھ موا کرتے اپنے گھر آنے پہ پابندی لگا دی، یہ پابندی وہ خضر حیات پہ تو نہ لگا سکا، البتہ خود ضرور سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا گیا، کہ نیناں اور اس کی ماما نے اسے اس گستاخی کا مزا چکھانے کو اپنے اثر و رسوخ کی معمولی سی جھلک دکھلانا ضروری خیال کیا تھا، مستقبل کا وکیل جیل کی ہوا کھاتا کانسٹیبلوں کے ڈنڈے برداشت کر رہا تھا، ذلت و سبکی کا یہ ایسا باب رقم ہوا تھا اس کی زندگی میں جس کا سامنا کرنے کا اس میں یارا نہیں تھا۔

ہوش مند ہونے کے بعد اس نے اس شب کی تنہائی میں اپنی ہی باہوں میں منہ چھپا کر اسے روتے پایا تھا اور یہ انتہا تھی ہر بات کی، چاہے وہ برداشت ہو صبر یا پھر ضبط، حوالات سے باہر آنے کے بعد اس نے بغیر کسی سے مشورہ کیے نیناں کو طلاق بھجوا دی۔

☆☆☆

وہ شب بہت تاریک تھی، بہت ہولناک ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر طویل جب اس کی گود میں چند گھنٹے قبل پیدا ہونے والا بچہ ماں کی آغوش کی خاطر بلکتا اور تڑپتا تھا اور وہ ساکن بیٹھا ہوا تھا، ابھی کچھ دیر قبل خضر حیات اور نیناں کی ممی یہ بچہ اس کے حوالے کر گئے تھے، اس کی ماں کے الفاظ ابھی بھی منیب کی سماعتوں پہ سنگ باری کرتے تھے۔

''بہت اچھا کیا جو تم نے خود فارغ کر دیا نیناں کو، ورنہ عدالت میں گھسیٹ کر طلاق لیتی قسم سے اور اسے سنبھالو گٹر کے گند کو، سانپ کا بچہ سپولیا ہی کہلاتا ہے، اسے دودھ پلا کر ہمیں آستین میں سانپ نہیں پالنا، نیناں تو شروع سے ہی خضر کے نام تھی، تمہیں تو خواہ مخواہ اپنی زندگی میں شامل کر لیا احمق لڑکی نے۔'' دونوں کے چہرے کے تاثرات میں اس کے لئے نفرت ہی نفرت تھی، وہ

ساکن بیٹھا تھا، حالانکہ بچہ مسلسل روئے چلا جاتا تھا، ابھی جو بات خضر کے حوالے سے نیناں کی ماں نے کہی تھی، یہ نیناں خود بھی اسے جتلا چکی تھی، یقین نہ کرنے والی تو بات ہی نہیں تھی، نیا تو کچھ بھی نہیں تھا، پھر بھی دکھ نئے سرے سے ضرور شل کر رہا تھا اسے، اس کے اعصاب کو، اسے یاد تھا، خضر کے حوالے سے ناپسندیدگی کا اظہار کرنے پہ نیناں نے جواباً اسے کس حد تک تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے کتنی دیر تلک دیکھا تھا۔

''تم خود کو کیا سمجھتے ہو منیب چوہدری! چلو اگر سمجھتے ہو تو آج اس خوش فہمی سے نکل آؤ، صرف شکل کا اچھا ہونا بالکل قابل فخر بات نہیں ہے کہ میں خود کو تم تک محدود کر رکھوں، تعلیم تمہاری ادھوری ہے، کام کاج تم کوئی نہیں کرتے، گھر تمہارے پاس نہیں ہے، پیرنٹس کی ہڑک تمہارے اندر سے نہیں جاتی، باپ بننے کا تمہیں جنون ہے، شادی کا مطلب صرف بچوں کا ڈھیر لگانا نہیں ہوتا، میں تمہارے ساتھ لائف انجوائے کرنا چاہتی تھی کہ تم مجھے پسند آ گئے تھے، مگر تم نے فوراً ہی میرے قدموں میں اولاد کی زنجیر ڈال دی، میری بدقسمتی ہے کہ مجھے اس مصیبت کا بہت دیر سے پتا چلا کہ جان بھی نہیں چھڑا سکتی تھی کہ خود میری زندگی خطرے میں جا پڑتی، میرے سارے فگر کا ناس ہو گیا تمہاری وجہ سے ان چند مہینوں میں، مجھے تو تم سے اتنی نفرت محسوس ہوتی ہے کہ بس نہیں چلتا جان چھڑا لوں تم سے کسی بھی طریقے، اول تو مجھے تمہارے ساتھ رہنا نہیں ہے، چند مہینے جو ہیں انہیں مجھے اپنی مرضی سے گزار لینے دو گے تو تمہارے حق میں بہتر ہے، یہ محبت اور عزت کے اسباق تم کسی اپنے جیسے اسٹنڈرڈ کی لڑکی کو پڑھانا، وہی تمہاری ہر بات پر فرمانبرداری سے سر جھکا سکتی ہے میں نہیں اور میں تم جیسے کنگلے انسان کے لئے سکری فائز یا کمپرومائز کروں بھی کیوں؟ مجبوری کیا ہے آخر میری؟''

اور مجبوری منیب کی بھی تھی، وہ کچھ بھی برداشت کر سکتا تھا، مگر کردار باختہ عورت نہیں، جبھی حتمی فیصلہ کر دیا، بچہ اس کے پاس آئے، یہ اس کی بھی خواہش تھی، نیناں کو کیا کرنا تھا اس کی نشانی کا، یوں اس کا بیٹا اس تک پہنچا دیا گیا، اس کی آنکھ سے ٹوٹا اشک گود میں رو رو کر نڈھال ہو کے سو جانے والے ننھے وجود پہ گرا، بچہ پھر سے کسمسایا اور ہاتھ پیر چلا چلا کر پھر سے رونا شروع کر دیا، منیب چونک اٹھا، جاگ اٹھا، ہڑبڑا گیا، اس رات اس نے اتنے چھوٹے بچے کو کیسے بہلایا، کیسے جتن کر کے اس کی بھوک مٹائی اور سلایا یہ الگ داستان ہے، وہ بس اتنا جانتا تھا، بیس سال کی عمر میں ہی وہ اپنی جوانی پھلانگ کر ایک پختہ سوچ کا مرد بن گیا تھا، یکسر تبدیل ہو گیا تھا۔

اس کی زندگی کا یہ اکیسواں سال بہت اہم رہا، اس کے آغاز پہ وہ ایک لاابالی پر جوش اور کھلنڈرا نوجوان تھا، جسے زندگی سے لطف اٹھانے کا شوق نہیں تھا، جو سنجیدگی و متانت مزاج کا حصہ تھی اس میں اس کے ماحول اور تربیت کا خاصہ تھا، اس کا ذاتی کمال نہیں تھا اور بہترین تربیت بھی اللہ کا اک فضل ہوا کرتی ہے اپنے بندے پہ جو اس پہ ہوا تھا اور یہی اللہ کا فضل اس سے جب غلط انتخاب ہوا تو اسے پر ملال بھی رکھنے لگا تھا، فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک ہوتا ہے، زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے، صحیح وقت پر کامیاب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت بنا کرتا ہے، اگر نادانی میں کوئی غلط قدم اٹھ جائے تو اس کی بروقت اصلاح کر لینا بھی اہم ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری

سے ہرگز گریز نہیں برتا جانا چاہیے، اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہوتے ہیں، جیسے بھی ہوں انہیں سنبھالنا پڑتا ہے، حفاظت کرنی پڑتی ہے، دنیا کی تاریخ کا جائزہ لینے پہ معلوم ہوتا ہے، اکثر تاریخی فیصلے غلط تھے لیکن تاریخی تھے، تقدیر کا بیشتر سفر انسان اپنے فیصلوں سے ہی طے کرتا ہے، انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے، یا وہ اپنے فیصلے کی بنا پر بہشت میں داخل ہو جاتا ہے، بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے، لیکن یہ مقدر انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے اور کون جانتا ہے کس نے اپنے فیصلے سے کیا خریدا، کیا سودا کیا، اچھائی والا یا برائی والا، اپنے ہر عمل کا ہر فرد خود ذمہ دار اور جواب دہ ہوگا اس فیصلے کی گھڑی میں جسے رب نے قیامت کا نام دے رکھا ہے۔

اک فیصلہ اس نے کیا تھا، اک نیناں نے کیا، اپنی جگہ پہ وہ خود کو صحیح سمجھتا تھا، یقیناً نیناں بھی سمجھتی ہوگی، منیب چوہدری نے اپنی زندگی کا اکیسواں سال ہر لحاظ سے انوکھا پر آزمائش اور فیصلہ کن پایا تھا، وہ اکیسویں سال میں لگا تھا جب اس کی نیناں سے شادی ہوئی، اکیس سال کی عمر میں باپ بنا اور اکیس سال کی عمر میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرلیا تھا، نیناں سے علیحدگی کا فیصلہ۔

اس نے بالآخر جان لیا تھا وہ غلط تھا، اس نے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لیا کہ وہ غلطی کا مرتکب ہوا ہے اس غلطی کو وہ اپنی سزا نہیں بنانا چاہتا تھا، ہاں پچھتاؤں سے نجات نہیں تھی، یہ تو زہریلے ناگ تھے جنہوں نے اس کی پوری زندگی کی آسودگی کو نگل لیا تھا۔

جس روز اس نے محض دو دن کے نومولود بھوک سے بلکتے ہوئے منصف حمدان کو لا کر اسی ندامت اور پچھتاوئے کے احساس سمیت اماں کی گود میں ڈالا، وہ اس قابل نہیں تھا کہ ان سے نگاہیں چار کرلیتا، پھر دس سال کی کنیز فاطمہ کے ساتھ اماں اور دادی نے حمدان کے آرام وسکون کی خاطر خود کو تیاگ دیا تھا، اماں جب ساری ساری رات ماں کی مخصوص خوشبو کے متلاشی بے چین بچے کو اٹھا کر ٹہلا کرتیں تو کتابوں میں دھیان لگاتے منیب کا دھیان بھٹک جاتا، ندامت وشرمندگی کا احساس نیناں کی نفرت کو پھیلاتا زہر میں ڈھلتا چلا جاتا، یہ اس کے گھر والوں کا اعلیٰ ظرف تھا کہ کسی نے اسے لعن طعن نہیں کی، بلکہ اس کے زخم خوردہ شکستہ وجود کو سمیٹ لیا۔

وہ صبح کالج جانے کو نکلتا تو دادی بچے کو گود میں لئے بیٹھیں ہوتیں، اماں ناشتہ بناتی کنیز بھاگ بھاگ کر سب کو روٹی دیئے جاتی اور منیب...... منیب جس نے کبھی یہ ماحول نہیں چاہا تھا، جس کے خواب بہت الگ تھے، اماں پہ مزید بوجھ ڈال کر شرمسار نظر آیا کرتا۔

اس روز وہ کالج سے پڑھ کے شام گئے لوٹا تو چند ماہ کا حمدان نہایا دھویا پاؤڈر لگائے نیا لان کا کرتا پاجامہ زیب تن کیئے چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں محوِ خواب تھا، کھلے آنگن میں چارپائیاں بچھی تھیں، جن پہ اماں نے نئے سفید سبز کناری والے سوتی کھیس بچھا دیئے تھے اور خود اب دیسی مرغا بھون رہی تھیں، دادی زردے کی تیاری میں ساتھ دے رہی تھیں، یہ تو خاص مہمانوں کی آمد کا اعلان تھا، کونے میں لگے نلکے پہ کنیز پرچھتی سے اتارے گئے وہ برتن دھو رہی تھی جو مہمانوں کی آمد پہ ہی اترا کرتے تھے۔

''کون آیا ہے اماں؟'' وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا، اماں نے ہرا دھنیا توڑ کر کاٹتے مصروف

انداز میں جواب دیا تھا۔

''تیرا چاچا! خیر سے بچی ویاہنے لگا ہے ناں، دعوت نامہ دینے آئے گا۔'' منیب کے چہرے پہ عجیب سا تاثر پھیل گیا، اوئل سرما کی نرم حدت لئے دھوپ اس کے چہرے پہ آہستگی سے اتر آئی، اسے حیرت ہوئی تھی، چچا نے اب بھی تعلقات بحال رکھے ہوئے ہیں، حالانکہ ابا نے تو کچھ اور کہا تھا، اس نے دل سے چاہا تھا، یہ وہی بیٹی ہو جو اس سے منسوب کی گئی تھی، اسے بس یہ یاد رہا تھا، ان کی کسی بیٹی سے رشتہ ہوا تھا، اسے اس کی عمر یاد نہ رہ سکی تھی۔

''تو کہاں جا رہا ہے اب؟ پتر روٹی تو کھا لے۔'' اسے پھر سے باہر کی راہ لیتے دیکھ کر اماں نے ٹوکا، مگر وہ پلٹ کر نہیں آیا۔

''آ جاتا ہوں اماں! روٹی میں نے آج کالج کے بعد دوستوں کے ساتھ کھالی تھی۔''

وہ جمال چوہدری کے سامنے سے کتراتا تھا، وہ واقعی ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا، شاید زندگی کے کسی بھی موڑ پہ اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہا، وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا، ان گزرتے ماہ و سال میں اس کی صرف تعلیم مکمل نہیں ہوئی، پریکٹس کے بعد اس نے جاب حاصل کر کے ہی دم لیا تھا، محبت میں ناکام ہو کر وہ خود کو نامرد ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا، نیناں کے ساتھ ساتھ اسے باقی سب کو بھی یہ جتلانا تھا کہ اس کے زندگی سے چلے جانے سے اس پہ کوئی فرق نہیں پڑا، کچھ وقت اور گزرا تو اس نے حمدان کو ہوسٹل میں داخل کروا دیا، وہ حتمی اور دوٹوک فیصلوں کا ایسا عادی ہوا تھا کہ اس معاملے میں دادی اماں اور ابا جی کی مخالفت پہ بھی دھیان نہیں دیا، حالانکہ وہ کتنا خفا ہوتے تھے اس پہ، کتنا جھگڑا بھی کیا تھا۔

''اک ظلم تو پہلے ہی کر چکا ہے اس نمانے پہ، ماں چھین کر اس کی، یہ ہوا ظلم نہ کر کہ بچے کچھے رشتے بھی کھو کر اسے کالے پانیو کی سزا دے دے۔''

''ابا جی میں وہی کر رہا ہوں جو اس کے حق میں بہتر ہے، پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔'' جواباً وہ تحمل کا دامن تھامے نرمی سے سمجھانے لگا، مگر ابا جی اس کے گلے پڑ گئے تھے۔

''یہ کیسا بہتر فیصلہ ہے اوئے، بوت پڑھا لکھا بنتا ہے، عقل تجھے نام کو نہیں، خبردار جو منڈے کو وہاں چھوڑا، میرا پوتا ہے، میری بڈھی نے آنکھیں ساڑ ساڑ کے راتوں کو جاگ کر پالا ہے اسے تو کدھر سے اس کے فیصلے کرنے والا آ گیا وڈا، ارمان نال بیٹھ، منڈا رو رو ادھا ہو رہا ہے۔'' اب کے وہ کچھ نہیں بولا، البتہ کی اپنی دل کی ہی تھی، حمدان رو رو کر ہلکان ہوا جاتا تھا، دادا، دادی، پھپھو کی ٹانگوں سے لپٹتا جاتا۔

''مجھے تول نہیں جانا، ہائے مجھے تول نہیں جانا۔'' دادی بھی خود رونے لگیں، مگر منیب کا اس معاملے میں دل نہیں پگھلا، ابا جی کی دھمکیاں اماں کی منتیں کچھ بھی کام نہ آیا، حمدان کو اس نے ہاسٹل چھوڑ کر دم لیا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا اس کا بیٹا گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح سات سال کا ہو کر ہی اسکول جائے، چند گھنٹے اسکول میں گزار کر باقی دن گلیوں میں آوارہ گردی کرتا بڑا ہو، وہ اسے کسی بلند مقام پہ دیکھنے کا متمنی تھا، خود سے بھی زیادہ اونچے مقام پہ، پھر یہ وقتی قربانی تو ضروری تھی، ابا جی بہت دنوں تک اس سے خفا رہے، بات نہیں کی، مگر منیب نے بھی پرواہ نہ کی تھی۔

وقت جیسا تیسا گزرتا جا رہا تھا، اس کی روٹین اور زندگی اک مناسب ڈھب پہ آ گئی تھی، وہ مطمئن نہیں بھی تھا تو ایسا غیر مطمئن اور بے چین بھی نہیں تھا جیسا نیناں سے شادی کے بعد ہو گیا تھا۔

دادی اور اماں کو اکثر اس کی زندگی کی ویرانی و تنہائی کا خیال مضطرب کیے رکھتا، ابا نے البتہ اس معاملے میں مکمل چپ سادھ رکھی تھی، زندگی ایک ڈھب پہ ضرور چل نکلی تھی، کہ اس بظاہر پرسکون سکوت پہ تلاطم غانیہ کی آمد نے برپا کیا۔

وہ اک عام سا دن تھا، کورٹ سے اس روز اس کی چھٹی تھی اور فراغت کے وقت میں وہ ابا جی اور سہیل کے بوجھ اٹھانے کی سعی کیا کرتا تھا، شہر کے رکے ہوئے کام فصلوں کے متعلق ضروری مداد یعنی کھاد وغیرہ لانا اور فروٹ کی سپلائی اس کے ذمے تھی، یہ فصل کی کٹائی کا سیزن تھا، ان دنوں اس کی مصروفیات بہت بڑھ جایا کرتی تھیں، شام ڈھلے جب وہ کھیتوں سے گھر لوٹا تو گرد و غبار اور پسینے کے باعث حال سے بے حال ہو رہا تھا۔

''کون آیا ہے کنیز فاطمہ! گاڑی کھڑی ہے باہر؟'' حسب عادت وہ گھر آنے کے بعد سب سے پہلے چولہے کی جانب آیا تھا، جہاں کنیز مصروف مکمل نظر آ رہی تھی، بلکہ ضرورت سے زیادہ مصروفیات میں گھری تھی، چاول گوشت سبزیاں، جانے کیا کچھ پکانے میں مصروف پسینوں پسینے ہو چکی تھی، اس کی کم سن بہن نے اپنی کم عمری اور ناتجربے کاری کے باوجود اس کے بیٹے کے واسطے اپنی راتوں کی نیندیں قربان کی تھیں، ایسے موقعوں پر جبکہ اماں اور دادی کو خاندان کی غمی خوشی میں شریک ہونا پڑتا تو حمدان کی مکمل طور پہ ذمہ داری کنیز پہ آ پڑتی، وہ اپنی بہن سے صرف محبت نہیں کرتا تھا، اس کی قربانی و خدمت کا بھی بہت اسیر تھا، کنیز کا مقام اس کی نظروں میں اس کے دل میں بہت بلند بہت خاص تھا۔

''چاچا جمال آیا ہے شہر سے، ساتھ میں پتا ہے کون ہے؟''

منیب نے دیکھا اس پل کنیز کی آنکھوں میں شوخی و شرارت تھی، امید تھی، آس تھی، وہ حیران رہ گیا، کنیز کا مزاج تو بہت سلجھا ہوا بہت سنجیدہ قسم کا تھا، اتنی خوشی اتنی پرجوش تو وہ بہت کم ہوا کرتی تھی۔

''کون ہے؟'' منیب نے محض اس کا دل رکھنے کی خاطر اشتیاق ظاہر کیا، اس کے گمان میں بھی نہیں تھا، وہ آنے والے دنوں میں کیسی الجھن و مصیبت میں پڑنے والا ہے۔

''چچا کی چھوٹی بیٹی غانیہ! یعنی آپ کی بچپن کی منگ، قسم سے ویرے، میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اتنی حسین اتنی پیاری، آپ بھی دیکھیں گے تو دیکھتے رہ جائیں گے۔'' کنیز اس کے چہرے پہ دھیان دیئے بغیر جہاں یکدم سرد مہری اور کبیدگی اتر آئی تھی، جوش مسرت سے کہے گئی تھی کہ منیب کو ہی ناگواری سے اسے ٹوکنا پڑ گیا تھا۔

''میں کیوں دیکھتے کا دیکھتا رہ جاؤں گا، نان سنس۔'' اس کے انداز میں برہمی در آئی، معاً کسی خیال کے زیر اثر بولا تھا۔

''اور بات سنو کنیز! تمہیں یہ بچپن کی منگنی والی باتیں کس نے بتائی ہیں؟'' ماتھے پہ لاتعداد بل

ڈالے وہ خشک و روکھے انداز میں سوال کر رہا تھا، کنیز اس کے انداز پہ خائف ہوتی قدرے سہم کر اسے دیکھنے لگی۔

''ابا جی اور دادی کے منہ سے اکثر سن چکی ہوں ویرا، آج تو دادی اور ابا جی غانیہ کو دیکھ کر بہت خوش بھی ہوئے ہیں، ابا جی کہہ رہے تھے چاچے کے دل میں بھی یہی خیال ہے، جبھی تو اپنی دھی کو ہم سے ملانے لایا ہے۔'' کنیز منمنا کر جواب دے رہی تھی، خوشی اور جوش دھیما پڑتا بالآخر ختم ہو گیا، منیب کی ناگواری و برہمی میں اضافہ ہوا۔

''ابا جی کی عادت ہے فضول قیاس آرائیاں کرنے اور خوش فہمیاں پالنے کی، بات سنو کنیز، یہ بات بچپن میں ہوئی ضرور تھی مگر پھر میری شادی پہ ختم بھی ہو چکی ہے، تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے آگے یہ بات کسی سے کہنے کی۔'' وہ اتنے غصے میں تھا کہ کنیز سے بات کرتے ہوئے بھی لہجے کی تختی و درشتی پہ قابو نہیں پا سکا، اسی شدید اور غصیلے موڈ میں پلٹا تو ابا جی کو اپنے بالکل پیچھے کھڑے پا کر یکدم گڑبڑا کر رہ گیا تھا، جن کے چہرے کا دکھ بھرا تاثر صاف گواہ تھا کہ اس کی پوری بات پوری جزئیات سے سن چکے ہیں۔

''واہ......واہ...... بہت بڑھیا لفظوں سے نواز رہا ہے تو بڈھے جاہل باپ کو، گنوار اور ناخواندہ جو ٹھہرا میں تو یہ فضول قیاس آرائیاں ہی کروں گا۔'' وہ کاٹ دار طنز سمیت کہہ رہے تھے، منیب خائف انداز میں ہونٹ بھینچے انہیں بھڑکتے دیکھتا رہا، کوئی جواب دے کر وہ انہیں مزید دل برداشتہ کرنا چاہتا تھا نہ مزید بڑھکانا۔

''اک گل یاد رکھنا منیبے، میں بھی اپنی گل نبھا کے دکھاؤں گا اللہ نے چاہا تو۔'' منہ پہ ہاتھ پھیر کر پختہ عزم باندھتے ابا جی اسی شدید موڈ میں وہاں سے چلے گئے، منیب نے گہرا سانس بھرا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب آ گیا، صحن میں چارپائیوں پہ دادی اور گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ بیٹھے جمال چاچا سے رسمی علیک سلیک کرتے اس کی اڑتی پڑتی نگاہ غانیہ پہ بھی جا پڑی تھی اور اسے لگا وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے، وہ غانیہ نہیں نیناں تھی، ہو بہو وہی صورت وہی انداز و اطوار اس کے اندر کے وہی زخم تازہ کر گئے جو شاید کبھی مندمل ہی نہ ہو سکے تھے، وقت نے جن کی مرہم پٹی نہیں کی تھی۔

وہ نفرت وہ برہمی و اشتعال جو نیناں پہ نہیں نکل سکا تھا، شعوری یا لاشعوری طور پہ غانیہ اس عتاب کی نشانہ بنتی چلی گئی، اس لڑکی کا اس سے خاص تعلق تھا، وہ اسے مگر خصوص اہمیت ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن وہ اسے خصوصی اہمیت دے گیا، یہ الگ بات کہ یہ اہمیت تکلیف دہ تھی، اذیت میں مبتلا کرتی تھی، لیکن وہ اسے چونکانے کا باعث بن گیا تھا اور چونکنا توجہ کا مرتکز بنا تھا اور توجہ اسے بھاری پڑ گئی تھی، اس لاشعوری عمل میں گو کہ اس کا کوئی بھی شعوری عمل دخل نہیں تھا، پھر بھی نقصان کا باعث ضرور ٹھہر گیا۔

اس نقصان کا اندازہ پہلی بار منیب کو اس وقت ہوا جب اس نے غانیہ کی نگاہوں میں اپنے لئے پسندیدگی اور محبت دیکھی، وہ ٹھٹکا اور محتاط ہو گیا، یعنی اسے نظر انداز کرنا چاہا مگر اب پانی سر سے اوپر پہنچ چکا تھا اک بار اس نے اپنی رضا و منشا سے یہ سفر طے کیا تھا، اب کی بار اس کی ہر گریز ہر پہلو

''ابا جی کی عادت ہے فضول قیاس آرائیاں کرنے اور خوش فہمیاں پالنے کی، بات سنو کنیز، یہ بات بچپن میں ہوئی ضرور تھی مگر پھر میری شادی پہ ختم بھی ہو چکی ہے، تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے آگے یہ بات کسی سے کہنے کی۔'' وہ اتنے غصے میں تھا کہ کنیز سے بات کرتے ہوئے بھی لہجے کی تختی و درشتی پہ قابو نہیں پا سکا، اسی شدید اور غصیلے موڈ میں پلٹا تو ابا جی کو اپنے بالکل پیچھے کھڑے پا کر یکدم گڑبڑا کر رہ گیا تھا، جن کے چہرے کا دکھ بھرا تاثر صاف گواہ تھا کہ اس کی پوری بات پوری جزئیات سے سن چکے ہیں۔

''واہ...... واہ...... بہت بڑھیا لفظوں سے نواز رہا ہے تو بڈھے جاہل باپ کو، گنوار اور ناخواندہ جو ٹھہرا میں تو یہ فضول قیاس آرائیاں ہی کروں گا۔'' وہ کاٹ دار طنز سمیت کہہ رہے تھے، منیب خائف انداز میں ہونٹ بھینچے انہیں بھڑکتے دیکھتا رہا، کوئی جواب دے کر وہ انہیں مزید دل برداشتہ کرنا چاہتا تھا نہ مزید بڑھکانا۔

''اک گل یاد رکھنا منیب، میں بھی اپنی گل نبھا کے دکھاؤں گا اللہ نے چاہا تو۔'' منہ پہ ہاتھ پھیر کر پختہ عزم باندھتے ابا جی اسی شدید موڈ میں وہاں سے چلے گئے، منیب نے گہرا سانس بھرا اور پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب آ گیا، صحن میں چار پائیوں پہ دادی اور گھر کے دیگر افراد کے ہمراہ بیٹھے جمال چاچا سے رسمی علیک سلیک کرتے اس کی اڑتی پڑتی نگاہ غانیہ پہ بھی جا پڑی تھی اور اسے لگا وقت دس سال پیچھے چلا گیا ہے، وہ غانیہ نہیں نیناں تھی، ہو بہو وہی صورت وہی انداز و اطوار اس کے اندر کے وہی زخم تازہ کر گئے جو شاید کبھی مندمل ہی نہ ہو سکے تھے، وقت نے جن کی مرہم پٹی نہیں کی تھی۔

وہ نفرت وہ برہمی و اشتعال جو نیناں پہ نہیں نکل سکا تھا، شعوری یا لاشعوری طور پہ غانیہ اس عتاب کی نشانہ بنتی چلی گئی، اس لڑکی کا اس سے خاص تعلق تھا، وہ اسے مگر خصوص اہمیت ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن وہ اسے خصوصی اہمیت دے گیا، یہ الگ بات کہ یہ اہمیت تکلیف دہ تھی، اذیت میں مبتلا کرتی تھی، لیکن وہ اسے چونکانے کا باعث بن گیا تھا اور چونکنا توجہ کا مرتکز بنا تھا اور توجہ اسے بھاری پڑ گئی تھی، اس لاشعوری عمل میں گو کہ اس کا کوئی بھی شعوری عمل دخل نہیں تھا، پھر بھی نقصان کا باعث ضرور ٹھہر گیا۔

اس نقصان کا اندازہ پہلی بار منیب کو اس وقت ہوا جب اس نے غانیہ کی نگاہوں میں اپنے لئے پسندیدگی اور محبت دیکھی، وہ ٹھٹکا اور محتاط ہو گیا، یعنی اسے نظر انداز کرنا چاہا مگر اب پانی سر سے اوپر پہنچ چکا تھا اک بار اس نے اپنی رضا و منشا سے یہ سفر طے کیا تھا، اب کی بار اس کی ہر گریز ہر پہلو تہی بھی اسے بچانے میں بری طرح ناکام ٹھہری اور وہ جال میں پھنستا چلا گیا، یہ بے بسی اس کی شکست تھی اور شکست اسے منظور نہ تھی، جو کچھ وہ دل میں ٹھان چکا تھا، اسے کوئی نہ جانتا تھا، ہاں یہ اسے کامل یقین تھا یہ شکست اس کا نہیں غانیہ کا مقدر بنے گی اور شاید ایسا ہونے والا تھا۔

(جاری ہے)

مجھے معتبر کردے

معصومہ منصور

رنگ برنگے آنچل، خوشبو، چوڑی کی کھنک اور مسکراہٹ سے سجے چہرے، وہ اردگرد کا جائزہ لیتی مسکرادی۔

''کتنا اچھا لگتا ہے ناں یہ سب۔'' اس نے اپنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی نور کو مخاطب کیا۔

''ہوں۔'' نور میز کے نیچے ہاتھ کیے میسج ٹائپ کرنے میں مصروف تھی۔

''مگر خوشی کے یہ لمحات کتنے مختصر ہوتے ہیں، ابھی کچھ دیر تک کھانا لگ جائے گا اور سب کھانا کھاتے ہی اپنے اپنے گھروں کو روانہ......سب ختم...... سناٹا...... جیسے یہ فنکشن کبھی ہوا ہی نہ تھا۔'' اس کے لہجے میں اداسی گھل گئی۔

''ہوں۔'' اس بار اس نے کھا جانے والی نظروں سے نور کو گھورا، مگر وہ سنجیدگی سے موبائل کی جانب متوجہ تھی۔

''نور میں تم سے مخاطب ہوں۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''ہاں......تو میں سن رہی ہوں ناں۔'' نور کی انگلیاں مسلسل موبائل کے بٹن پریس کر رہی تھیں۔

''وہ دیکھو ندا کا سی گرین سوٹ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے سامنے سے آتی ندا کو دیکھتے ہوئے کہا، ندا نے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، گردن ہلا کر سلام کیا اور پھر ٹیبلٹ کی جانب متوجہ ہوگئی، اس نے سر کے اشارے سے جواب دیا، نور کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے ساتھ بیٹھیں غزالہ چچی کی گود سے دعا کو لے لیا، دعا بھی اس کی توجہ پاتے ہی کھل اٹھی اور کھلکھلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی، کچھ ہی دیر پہلے مولوی صاحب چار سالہ عباد کو بسمہ اللہ پڑھوا کر گئے تھے، یہ تقریب پھپھو کے گھر کے لان میں منعقد تھی، کلر لائٹنگ

مکمل ناول

اور سٹیج بنا کر لان کو کسی خوبصورت ہال کی مانند سجایا گیا تھا، ان کی ٹیبل پر دادو اور دونوں چچیاں بھی بیٹھیں تھیں، اس نے تھوڑا سا گردن گھمائی اور مما کو ڈھونڈنا چاہا وہ کچھ فاصلے پر مہمان خواتین سے مل رہی تھیں، جبھی اس کی نظر ہال کے گیٹ پر پڑی، پولیس یونیفارم میں انصار اپنی پوری وجاہت اور وقار کے ساتھ عباد کا ہاتھ کھڑا پھپھو سے باتیں کر رہا تھا، آج اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی، وہ صرف عباد کی خوشی کے لئے کچھ دیر رکا تھا، دائیں ہاتھ سے بال درست کرتے انصار کی نظر جونہی ایشاع سے ٹکرائی تو پھر لوٹ نہ سکی، ایشاع گھبرا کر دعا سے باتیں کرنے لگی، مگر اپنے چہرے پر انصار کی نظریں محسوس کرتے ہوئے اس کا دل مقناطیس کی مانند کھنچنے لگا۔

''بری بات ہے ایشاع، بہت ہی بری بات، وہ اب تمہاری منزل نہیں رہا۔'' اس نے دل کو سختی سے ڈپٹا اور دعا کو ٹیبل پر اپنے چہرے کے سامنے کھڑا کر لیا، سر جھٹک کر نور کی جانب دیکھنے لگی، جس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں واضح تھیں، وہ بار بار دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے پیشانی مسل رہی تھی، چہرہ بالکل سپاٹ اور زرد ہو رہا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے، کیا بات ہے، کیوں پریشان ہو؟'' وہ فکرمندی سے پوچھنے لگی۔

''پریشان نہیں میں کیوں ہوں گی پریشان، طبیعت بھی ٹھیک ہے، بس دل گھبرا رہا ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جا کہاں رہی ہو؟'' وہ اسے بہت گھبرائی اور الجھی ہوئی لگی۔

''آتی ہوں ابھی۔'' وہ سنجیدگی سے کہتی پھپھو کے گھر کے اندرونی حصہ کی جانب بڑھ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد کھانا لگ گیا اور سب کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے، اسے نور کے لئے پریشانی ہوئی جو ابھی تک نہیں آئی تھی، نجانے کیوں اس کے دل میں عجیب عجیب وہم آنے لگے، اس سے رہا نہ گیا اور دعا چچی کو تھما کر وہ اس جانب چل پڑی جہاں نور گئی تھی، سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا، وہ دروازے کے وسط میں کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی، بائیں جانب کچھ روشنی آتی دکھائی دی تو وہ اس جانب مڑی، یہ روشنی کچن سے آ رہی تھی، وہ آگے بڑھی ڈائننگ ٹیبل کے قریب سے گزر کر کچن کے دروازے سے داخل ہوئی اور شاکڈ رہ گئی، سیاہ کپڑا چہرے پر لپیٹے ایک شخص بہت بے دردی سے نور کے جسم پر چھری سے وار کر رہا تھا۔

''چھوڑو...... میری بہن کو۔'' وہ چیل کی مانند اس شخص پر جھپٹ پڑی اور سیاہ کپڑا اتار دیا۔

براؤن آنکھوں والا یہ چہرہ اس کے لئے مکمل اجنبی تھا، اس نے نور کے منہ کو سختی سے دباتے ہوئے زمین پر پھینکا، اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر نور پر دھکیلا اور بھاگ گیا۔

''نور...... نور...... میری بہن یہ سب کیسے ہوا، کون تھا وہ؟'' اس نے تیزی سے اٹھ کر نور کا سر اپنی گود میں رکھا۔

''وہ...... وہ...... مجھے...... اسے ساتھ۔'' تڑپتی نور نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز نے ساتھ چھوڑ دیا اور جسم ڈھیلا پڑ گیا۔

''نور...... نور...... اٹھو۔'' وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز حلق میں اٹک گئی، کچھ اور سمجھ نہ آیا تو اس نے نور کے جسم میں لگی چھری پکڑ کر باہر کھینچی۔

انصار جو اپنی کیپ اٹھانے آیا تھا، کچن کی جانب سے آتیں آوازوں کو سن کر اس جانب آیا

اور پھر کچن کے اندر کے منظر نے اسے ساکت کر دیا۔

''نور......!'' وہ چیختا ہوا نور کے قریب پہنچا، ایشاع کو ایک جانب دھکا دیا، چھری ایشاع کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری اور وہ حق دق رہ گئی، انصار نے نور کی نبض چیک کی اور اسے گود میں اٹھا کر باہر کی جانب لپکا۔

''بڑے ماموں...... چھوٹے ماموں۔'' وہ آوازیں لگاتا باہر نکلا، پاپا اور چاچو ایک جانب کھڑے تھے تیزی سے اس کی طرف آئے۔

''نور...... نور...... کیا ہوا نور کو؟ یہ سب کس نے کیا؟'' وہ چلانے لگے، تمام مہمان افراد اردگرد اکٹھے ہوگئے۔

''ماموں یہ وقت ان باتوں کا نہیں حوصلہ رکھیے، نور ٹھیک ہے، نبض چل رہی ہے، اسے فوراً ہسپتال لے جانا ہوگا۔'' چاچو پلٹ کر گاڑی نکالنے دوڑے، انصار نے نور، پاپا کے بازوؤں میں تھمائی اور موبائل نکال کر کال ملانے لگا، پاپا نے نور کو چھوٹی سی بچی کی مانند اپنے بازوؤں میں سمیٹا اور ہجوم کو چیرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''میں بھی جاؤں گی، مجھے بھی نور کے ساتھ جانا ہے۔'' وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''تم کہیں نہیں جاسکتیں۔'' انصار نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

''کیوں...... کیوں نہیں جاسکتی، بہن ہے وہ میری...... چھوٹی بہن۔'' وہ چلائی۔

''یہ بات تمہیں...... اسے جان سے مارنے کی کوشش کرنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی...... مس ایشاع نور۔'' وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''کیا؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''ہاں میں تمہیں بسمہ نور کو جان سے مارنے کی کوشش میں گرفتار کرتا ہوں۔'' اس کی بات سن کر ایشاع پتھر کی بن گئی، اس میں نظریں ملانے کی بھی طاقت نہ رہی، تمام رشتہ دار بڑی حیرت اور تاسف سے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

گلابی شام اختتام پذیر ہوئی، آسمان پر اڑتیں پتنگیں نیچے آنے لگیں، پرندے اپنے اپنے گھروں کو محو پرواز ہوئے اور سرمئی اندھیرے چار سو اپنا جال پھیلانے لگے، ریلنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے کچھ فاصلے پر بنی دیوار میں موجود سوراخ سے باہر جھانکتی نور نے دور تک پھیلے اونچے نیچے کچے پکے، چھوٹے بڑے مکانوں کو دیکھا اور آخری نظر ان بچوں پر ڈالی جو اب پتنگ اور ڈوری سمیٹے اپنے گھر کی چھت سے نیچے جارہے تھے، وہ پیچھے ہٹی اور نیچے زمین پر رکھی اینٹ اٹھا کر دیوار میں موجود سوراخ میں لگائی۔

''نور نیچے آجاؤ اب۔'' مما کی آواز آئی۔

''جی آئی ہوں۔'' اس نے وہیں کھڑے کھڑے سڑھیوں کی جانب چہرہ کرکے جواب دیا۔

''یہ بھی کوئی زندگی ہے بھلا۔'' اس نے اپنے خوبصورت کٹاؤ والے گلابی سونٹ سکوڑے اور آسمان کی جانب نظریں اٹھائیں، پہلا تارہ جگمگا رہا تھا۔

''یہ کرو، یہ نہ کرو، یہ کیا تو کیوں کیا، یہاں آؤ، یہاں نہ جاؤ، بلکہ کہیں جاؤ ہی نہیں، دیواروں سے سر پھوڑتے رہو، لوگ چاند پر جا پہنچے اور یہاں گھر سے باہر قدم نکالنے پر بھی پابندی، کنوئیں کے مینڈک بنے رہو بس، بلکہ کنوئیں کا مینڈک بھی ہم سے تو بہتر ہی ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے ہر جگہ آجا تو سکتا ہے، ہم تو یہ بھی نہیں کرسکتے۔'' وہ چھت پر ادھر سے ادھر ٹہلتے

ہوئے ہاتھ ہلا ہلا کر بڑبڑا رہی تھی۔

''نور!'' مما کی آواز پھر آئی۔

اس بار اس نے جواب دینے کے بجائے نیچے اترنا بہتر سمجھا اور ٹھنڈی ہوا سے لہراتے اپنے جامنی دوپٹے کو اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے وہ سیڑھیاں گنتی نیچے اتر آئی، سیڑھیوں کے بالکل نیچے ایک زنگ آلود لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ تھا، جو پچھلی گلی میں کھلتا تھا اور عموماً بند ہی رہتا تھا، اس کے ساتھ ماما پاپا کا کمرہ، پھر دادی اماں کا کمرہ، جب بھی وہ آتیں اس کمرے میں ٹھہرتیں پھر گیسٹ روم درمیان میں وسیع لاؤنج جہاں اس وقت مما سرمئی صوفے پر بیٹھیں تسبیح کر رہی تھیں، سامنے ایشاع، نور کا کمرہ پھر کچن، ایک ہی نظر میں اس نے پورے گھر کا جائزہ لے ڈالا، وہ خاموشی سے لاؤنج سے گزر کر کچن میں داخل ہو گئی، مما نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر تسبیح کرنے لگیں۔

''کیا بنا ہے آج؟'' اس نے دہی میں پودینہ اور ہری مرچوں کی چٹنی مکس کرتی ایشاع سے پوچھا۔

''چکن کڑاہی۔'' مصروف سے انداز میں جواب آیا، نور نے آگے بڑھ کر کڑاہی کا ڈھکن ہٹانا چاہا۔

''ابھی نہیں پلیز، کچھ منٹ رکو۔'' ایشاع نے پلیٹ کر چٹنی فریج میں رکھی اور سنک میں رکھے برتن دھونے لگی۔

''میں کیا کروں؟'' نور اکتائے ہوئے انداز میں بولی اور اچھل کر شیلف پر بیٹھ گئی۔

''روٹی بنالو۔'' ایشاع نے فوراً مشورہ دیا۔

''آہم۔'' اس نے چھلانگ لگائی اور کچن سے باہر نکل گئی، ایشاع نے قہقہہ لگایا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گھر کے کاموں سے نور کی کتنی جان

جاتی تھی، نور لاؤنج میں آ کر مما کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی، جبھی پاپا اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم!'' اس نے اور مما نے اکٹھے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''مما مجھے آگے پڑھنا ہے۔'' اس نے دونوں بانہیں مما کے گلے میں ڈال دیں۔

''اس سلسلے میں اپنے پاپا سے بات کرو، میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' مما کا تسبیح کے دانے گراتا ہاتھ رک گیا، انہوں نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''آپ سب کچھ کر سکتی ہیں، پلیز مما۔'' اس نے التجاء کی۔

''میں نے کہا ناں، اپنے پاپا سے بات کرو۔'' اس بار ان کی آواز میں سختی نمایاں تھی۔

''میں...... میں کیسے بات کروں، آپ کریں ناں۔'' وہ سیدھی ہو بیٹھی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میں نے کی تھی بات اور ان کا جو جواب ہے وہ بھی تمہیں بتا چکی ہوں، اب مجھے تنگ مت کرو۔'' مما بیزار تھیں۔

''کیا بات ہے نور، کیوں اپنی مما کو تنگ کر رہی ہو؟'' پاپا لباس تبدیل کر کے کمرے سے نکل آئے اور مما کے صوفے کے قریب کھڑے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''وہ...... وہ...... پاپا...... کالج کے ایڈمیشن کلوز ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے اور ابھی تک میرا ایڈمیشن فارم بھی نہیں آیا۔'' وہ دونوں ہاتھ آپس میں ملتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کو آپ کی مما نے نہیں بتایا، کہ مجھے لڑکیوں کا زیادہ پڑھنا پسند نہیں، میٹرک کر لیا ہے، بس کافی ہے۔'' وہ قطعی انداز میں کہتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھے، ایشاع کچن سے نکل آئی، انہیں سلام کیا اور کھانا لگانے لگی۔

''مگر پاپا کیوں، آخر بھائی نے بھی تو ایم بی اے کیا ہے؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''وہ مرد ہے۔'' وہ لاپرواہی سے کہتے نیپکن پھیلانے لگے۔

''ہمارے نبیؐ نے تعلیم کو مرد اور عورت دونوں پر فرض قرار دیا ہے، جب ہمارے دین میں یہ فرق نہیں تو آپ......''

''نور!'' پاپا نے سختی سے اس کی بات کاٹی۔

''اب آپ ہمیں دین سمجھائیں گی؟''

''نہیں پاپا میرا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا، بلکہ......''

''آپ کا جو بھی مطلب تھا، آج کے بعد میں اس گھر میں یہ بحث نہ سنوں، سمجھ گئیں آپ۔'' نور نے بے بسی سے آنسو پیئے۔

''اور جس دین کی آپ مجھے مثالیں دے رہی ہیں، اس دین میں لڑکیوں کی جلد شادی کا بھی حکم ہے، صدیقی صاحب بہت دن سے اپنے بیٹے کا کہہ رہے ہیں، جیسے ہی فراز یورپ سے آتا ہے بلاتے ہیں انہیں کسی دن۔'' آخری بات انہوں نے مما کی جانب دیکھ کر کہی اور کھانے کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''نور...... تم کیوں اس قدر ضدی ہو، ایشاع کو دیکھو وہ بھی تو تمہاری بہن ہے۔'' مما نے تسبیح مکمل کر کے میز پر رکھی اور اٹھ کر پاپا کے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں، نور روتی ہوئی پلٹی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ روز بار وز ضدی اور خود سر ہوتی جا رہی ہے، سمجھاؤ اسے۔'' پاپا نے مما کو تنبیہ کی۔

''جی۔'' مما سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''آپی کو کیا دیکھوں، وہ تو اللہ میاں کی گائے ہیں، جب دیکھو جی...... جی...... جی اچھا...... ان کا تو زندگی میں کوئی مقصد ہی نہیں، مگر میں...... میں تو ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں، پاپا کی انہی سختیوں کی وجہ سے بھیا ہم سے اتنی دور جا بیٹھے۔'' کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھی جا گری، آنسو تھے کہ بہے جا رہے تھے۔

پاپا کا شمار ان والدین میں ہوتا تھا جو کبھی نہیں دیکھتے کہ ان کی اولاد کیا چاہتی ہے، اس کی خوشی کس چیز میں ہے، وہ صرف اپنے بنائے گئے ترازو میں اولاد کی اچھائی برائی تولتے ہیں اور حکم صادر کرتے ہیں، پھر چاہتے ہیں کہ اولاد بغیر کسی چوں چرا کیے ان کی ہر بات مانے، حنظلہ کو بھی نور کی طرح پاپا سے شکایات رہتی تھیں اس لئے اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاپا کی خواہش جاننے کے باوجود کینیڈا کی ایک کمپنی کو جاب کے لئے اپلائی کر دیا، پاپا کو پتا چلا تو بہت شور کیا مگر حنظلہ نے پروا نہ کی اور گھر چھوڑ دیا، اب پچھلے پانچ سالوں سے وہ کینیڈا تھا، ہر ماہ خاصی معقول رقم مما کو بھیجواتا، ہر آنے جانے والے کے ہاتھ ڈھیروں تحفے ماں، بہنوں کے لئے بھیجتا، فون پر بھی بات کرتا رہتا مگر واپسی کا نام نہ لیتا۔

کچھ ہی دیر بعد ایشاع کھانے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی۔

''اٹھو نور، کھانا کھا لو۔'' اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''نہیں کھانا مجھے۔'' نور نے بازوؤں میں منہ دیئے روٹھی روٹھی آواز میں کہا۔

''کھانے سے بھلا کیا ناراضگی نور، ویسے بھی آج تو تمہاری پسند کا کھانا بنا ہے۔'' وہ اس کا سر سہلانے لگی۔

''کہا ناں نہیں کھانا مجھے، جاؤ یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اس نے غصے سے ایشاع کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گئی، ایشاع نے دیکھا اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

''نور میری پیاری بہن۔'' ایشاع نے نرمی سے کہتے ہوئے اسے اپنے شانے سے لگایا، گلے لگ کر نور اور بھی تیزی سے رونے لگی۔

''مجھے مزید پڑھنا ہے ایشاع، مجھے ڈاکٹر بننا ہے، پاپا سمجھتے کیوں نہیں آخر، دنیا کے سب والدین اپنے بچوں کی خوشی اور خواہش دیکھتے ہیں اور ایک ہمارے والدین ہیں......''

''یہ کیا بیوقوفی ہے نور۔'' ایشاع نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور دوپٹے سے آنسو جذب کرنے لگی۔

''اس طرح رونے کا کوئی فائدہ بھی ہے بھلا۔'' ایشاع اس کی آنکھوں سے مزید آنسو نکلتے دیکھ کر بولی۔

''تو اور کیا کروں میں۔'' اس نے آنکھیں رگڑیں۔

''پہلے یہ رونا بند کرو، پھر نکالتے ہیں کوئی حل۔'' اس نے دلاسا دیا۔

''جب مما ہی کچھ نہیں کر سکتیں، تو بھلا تم کیا کرو گی۔'' نور سیدھی ہو بیٹھی اور ایک بار پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''پاپا کو سمجھانا، واقعی میرے اور مما کے بس کی بات نہیں، لیکن اگر تم حنظلہ بھیا سے بات کرو تو وہ لازمی پاپا کو سمجھا سکیں گے۔''

''مگر وہ تو خود پاپا سے خفا ہیں۔'' نور نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

''ہاں مگر جب تم کہو گی تو وہ...... پاپا سے تمہارے لیے ضرور بات کریں گے۔''

''واقعی؟'' نور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں نور تو اور کیا، چلو شاباش اب اٹھو اور ہاتھ دھو کر آؤ پھر یہ کھانا ختم کرو۔'' اس نے ایک منٹ سوچا اور پھر سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، ایشاع نے واش روم کی جانب جاتی اپنی لاڈلی بہن کو دیکھا، جس کا رونا اسے دلی دکھی کر گیا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی خواہش بھی پوری نہیں ہو گی، کچھ عرصہ رونے دھونے کے بعد بالآخر وہ بھول جائے گی، اسے بھولنا ہی پڑے گا، وہ لڑکی ہے حنظلہ کی طرح گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی، روتے دھوتے ہی صحیح مگر اسے اپنی خواہش کی قربانی دینا ہی پڑے گی، مگر ابھی یہ بات نور کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

''آپی...... آپی...... اٹھیں...... چلیں جلدی کریں۔'' نور شور مچاتی کمرے میں داخل ہوئی اور پھر کمرے میں اندھیرا دیکھ کر دروازے پر ہی رک گئی۔

''اُف۔'' کہتے ہوئے ٹچ کی آوازوں کے ہمراہ اس کے کمرے میں موجود تمام بٹن دبا دیئے، اندھیرے میں ڈوبا کمرہ یک دم روشنیوں سے جگمگا اٹھا، ایشاع بیڈ پر کمبل تانے سو رہی تھی۔

''آپی آپی اٹھیں۔'' نور نے کمبل کھینچا۔

''کیا بات ہے، کیا ہوا؟'' وہ بامشکل آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی۔

''اٹھیں گئیں تو پتا چلے گا۔'' اس نے جوش سے کہتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''کیا ہوا نور، تم خواہ مخواہ کا سسپنس کیوں

پھیلا رہی ہو، بتاؤ بھی کچھ۔'' وہ پریشانی سے بیڈ سے اتری۔

''ارے باہر بارش ہو رہی ہے اور آپ یہاں سو رہی ہیں۔'' نور نے ناراضگی سے منہ پھلایا۔

''اوہ نور کی بچی ڈرا دیا یار۔'' وہ منہ بناتی پھر سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

''چلیں ناں۔'' نور نے اس کا بازو پکڑا۔

''نور تم جاؤ مجھے ابھی سونا ہے۔'' اس نے آہستگی سے اپنا بازو چھڑوایا اور پھر لیٹ کر آنکھیں موندلیں۔

''آ جاؤ ناں آپی، میں اکیلی بور ہو رہی ہوں، سچ اتنی اچھی بارش برس رہی ہے۔'' نور نے التجا کی، اس نے آنکھیں کھول کر ایک نظر نور کو دیکھا پھر اس کی نظر اس کے کپڑوں پر پڑی، وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی، سر سے پاؤں تک اسے گھورا پھر اس کے پاؤں سے دروازے تک بنی لائن کو دیکھا۔

''نورا!'' وہ چیخی۔

''چلو ناں آپی۔''

''چلو ناں آپی کی بچی، تم...... تم گیلے کپڑوں سے کمرے میں داخل ہوئیں، تمہیں شرم نہ آئی ذرا بھی۔''

''کیا مطلب آپی؟'' نور انجان بنی۔

''تم نے کمرے کا سارا قالین خراب کر دیا۔'' نور نے گھبرا کر گیلے قالین کو دیکھا اور زبان دانتوں تلے دبائی، واقعی اسے ذرا بھی خیال نہ تھا۔

''چلو نکلو تم یہاں سے۔'' اس نے نور کو انگلی کے اشارے سے باہر دھکیلا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جاتی ہوں، مگر آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔'' نور بھی اپنے نام کی ایک تھی، اپنی کرنے اور اپنی منوانے والی، اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔

''آؤٹ آؤٹ چلو نکلو یہاں سے۔'' ایشاع اسے پکڑ کر دروازے تک لے گئی اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی نور نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر کھینچ لیا، وہ چلاتی رہ گئی، مگر نور نے اسے باہر نکال کر ہی سانس لیا، باہر واقعی خاصی تیز بارش تھی، تھوڑی ہی دیر میں دونوں بھیگ گئیں۔

''مزہ آ رہا ہے ناں؟'' نور نے آنکھیں پٹپٹائیں اور بالوں سے کیچر نکال کر پھینک دیا۔

ایشاع سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ملا کر بوندوں کو روکنے لگی، نصف گھنٹے تک بارش اسی طرح برستی رہی اور وہ دونوں مما کی آوازوں ''ایشاع، نور آ جاؤ، ٹھنڈ لگ جائے گی'' کی پروا کیے بغیر لان کی سبز گیلی گھاس پر اِدھر اُدھر پھرتی رہیں، بارش رکی تو وہ دونوں بھی تھک کر لان میں موجود کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

''سچ آپی اگر اب آپ اپنے خوبصورت ہاتھوں سے چائے اور پکوڑے بنا لائیں تو مزہ ہی آ جائے۔''

''واہ جی واہ، کس خوشی میں جناب۔''

''بارش کی خوشی میں۔''

''بارش کی خوشی، تو تمہیں زیادہ تھی، اس لئے اب تم ہی بناؤ۔''

''ہائے نہیں۔'' نور نے دہائی دی، ایشاع ہنسنے لگی۔

''چینج کر و اور پھر کچن کا رخ کرو۔''

''نہیں آپی، سچ آپ کے ہاتھ میں بڑا ہی ذائقہ ہے۔'' نور نے مسکا لگایا۔

ابھی دونوں اس بحث میں الجھی ہوئی تھیں

کہ بیرونی گیٹ سے آف وائٹ سٹی اندر داخل ہوئی۔

''پاپا اور وہ بھی اس ٹائم۔'' دونوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، جلدی سے دوپٹے ٹھیک کیے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئیں، ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاپا اس ٹائم بھی آسکتے ہیں۔

لان میں کچھ فاصلے پر بنی سنگ مرمر کی روش پر گاڑی رکی، پاپا نیچے اترے اور ان دونوں کو گھورتے ہوئے اندر چلے گئے، وہ دونوں یوں ساکت ہوئیں جیسے بت ہوں، جان ایسی نکلی کہ سلام تک کرنے کی ہمت نہ رہی۔

''یہی تربیت کر رہی ہو تم ان کی، حالت دیکھو ذرا، یہ شریف لڑکیوں کا گھروں میں رہنے کا یہ طریقہ ہوتا ہے، غیرت کہاں مر گئی ہے، تم ماں بیٹیوں کی۔'' اندر جا کر وہ مما پر برسنے لگے، کچھ دیر پہلے کی خوشی منٹ بھر میں اڑن چھو ہو گئی اور اس کی جگہ خوف بیٹھ گیا۔

''میں نے...... میں نے تو منع کیا تھا، مگر وہ مانی نہیں، بارش پسند ہے انہیں تو۔'' مما منمنائی۔

''کیسے نہیں مانتیں، ہم ان کے والدین ہیں یا وہ ہمارے۔'' پاپا غصے سے بھرے تھے۔

''جانے بھی دیجیے، بچیاں ہیں، کہیں آتی جاتی تو ویسے بھی نہیں، اب اگر گھر میں بھی۔'' مما کو سمجھ نہ آیا کہ وہ پاپا کے غصے کو کیسے کم کریں۔

''خاموش۔'' پاپا کی جھڑکی پر مما یک دم خاموش ہو گئیں۔

''میں ابھی چینج کر کے آرہا ہوں، یہ دونوں انسانی حالت میں چاہیے مجھے۔'' وہ وارن کرتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے، ایشاع اور نور سر جھکائے مرے مرے قدم اٹھاتیں، کانپتی ہوئیں اندر داخل ہوئیں اور خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

دس منٹ بعد پاپا اپنے کمرے سے باہر آئے تو وہ دونوں لاؤنج میں کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھیں۔

''آئندہ میں ایسا کچھ نہ دیکھوں۔'' وہ انہیں سختی سے وارن کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

''ہیلو بھیا کیسے ہیں آپ؟'' نور نے پہلے ہی بیل پر نور نے کال ریسو کی اور موبائل کان سے لگاتے ہوئے بولی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں گڑیا، تم کیسی ہو؟'' دوسری جانب حنظلہ تھا۔

''جی میں ٹھیک۔''

''مما اور ایشاع کیسی ہیں؟''

''وہ بھی ٹھیک۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''سب ٹھیک ہیں تو یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟''

''وہ......وہ بھیا؟''

''ہاں ہاں بولو گڑیا، کیا بات ہے؟'' وہ پریشان ہوا۔

''بھیا مجھے آگے پڑھنا ہے، مگر پاپا اجازت نہیں دے رہے، آپ بات کریں ناں ان سے۔'' وہ اداسی سے بولی۔

نور کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش رہ گیا، اس ایک لمحے میں اس کی نظروں میں ان گنت ایسے پل گھوم گئے جب پاپا اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور فرمائشوں کو رد کیا تھا، پھر ان سب پلوں میں سے ایک پل نکلا اور باقی تمام پلوں پر چھا گیا، جب پہلی مرتبہ نماز میں تاخیر کرنے پر پاپا اسے مسجد تک اپنے جوتے سے مارتے گئے تھے، محلے کے بچوں کی وہ تمسخر سے بھرپور نظریں اور مذاق اڑاتیں دبی دبی ہنسی، وہ

سات سال کا بچہ آج تک فراموش نہیں کر پایا تھا، اس دن ہونے والی اس کی پٹائی اسے نماز کا پابند تو بنا گئی تھی مگر ساتھ ہی پاپا کی جانب سے اس کے دل میں گرہ لگا گئی تھی، جو گزرتے وقت کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

''ہیلو...... ہیلو بھیا آپ بات کریں گے ناں پاپا سے۔'' اس کی خاموشی پر نور بولی تو وہ چونکا۔

''مجھے یقین ہے بھیا، آپ بات کریں گے تو پاپا ضرور مان جائیں گے۔'' وہ پریشانی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا جواب دے وہ اپنی عزیز بہن کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''آپ بات کریں گے ناں بھیا؟'' وہ بار بار پر امید سی پوچھنے لگی، اچانک اس کے سامنے ایک نام چمکا اور وہ مسکرا دیا۔

''ہاں گڑیا میں بات کروں گا اور اگر میری بات پاپا نے نہ مانی تو، حذیفہ سے کہوں گا، تمہیں پتا ہے ناں پاپا اسے پسند کرتے ہیں، اس کی بات ضرور مانیں گے۔''

''جی جی بھیا، آپ حذیفہ بھیا سے کہیے گا وہ بات کریں پاپا سے۔'' اس کی آواز میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔

''اچھا یہ بتاؤ چیزیں مل گئی تھیں؟'' کچھ دن پہلے اس نے مما اور بہنوں کے لئے گفٹس بھجوائے تھے۔

''جی بھیا مل گئیں تھیں، مگر آپ نے ایشاع کا کوٹ مجھ سے زیادہ خوبصورت بھیجا ہے۔'' امید کی ڈوری تھامتے ہی وہ چہکنے لگی۔

''اچھا۔'' حنظلہ نے اس کے بچپنے پر قہقہہ لگایا تھا۔

''جی بھیا، مگر اگلی بار آپ نے میرا گفٹ زیادہ خوبصورت بھیجنا ہے، ٹھیک ہے۔''

''اوکے جی ٹھیک ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''لیں بھیا، ایشاع سے بات کریں۔'' اس نے موبائل ساتھ کھڑی کپڑے استری کرتی ایشاع کو تھمایا۔

''نور کی باتوں میں مت آیئے گا بھیا، یہ تو ایسے ہی شور کرتی رہتی ہے۔'' سلام دعا کے بعد وہ بولی۔

دوسری جانب وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا، نور نے لپک کر اس سے موبائل لینا چاہا مگر وہ دور ہو گئی۔

''بھیا! میں نے تو دونوں کوٹ اس کے سامنے رکھ دیئے تھے، کہ جو پسند ہے لے لو۔''

''ارے واہ بہت سمجھدار ہو گئی ہے ہماری بہنا تو۔'' وہ پیار سے بولا۔

''جی بھیا! بس آپ پریشان مت ہوئیے گا اور اپنی خیریت کا فون کرتے رہیے گا۔'' اس لمحہ حنظلہ کو سب کا خیال رکھنے والی اس بہن پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، مما کہاں ہیں؟''

''مما!'' اس نے سوالیہ نظروں سے نور کی جانب دیکھا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں، لاؤ میں موبائل وہیں لے جاتی ہوں۔'' ایشاع نے موبائل اسے تھمایا۔

''بھیا! میں نے ایشاع والا کوٹ نہیں لیا، میں نے کہا جو بھیا نے میرے لئے بھیجا ہے، میں وہی لوں گی۔'' نور کو موقع مل گیا تھا، اپنی کہنے کا اس لئے وہ موبائل کان سے لگاتے ہی شروع ہو گئی اور باتیں کرتے کرتے موبائل مما کے کمرے کی جانب لے گئی۔

ایشاع پریس کیے کپڑوں کو ہینگر کرنے لگی، کچھ دیر بعد نور ہاتھ میں موبائل تھامے واپس آئی

اور دھپ سے بیڈ پر گری۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' نور نے ناک چڑھائی۔

''پاپا نے کچھ کہا کیا؟'' چھٹی والے دن پاپا گھر پر ہی ہوتے تھے۔

''نہیں تو۔'' اس نے نہیں کو خاصا کھینچ کر ادا کیا۔

''پھر اتنی بری بری شکلیں کیوں بنا رہی ہو؟''

''فری کا میسج آیا ہے۔''

''وہ تو آپا ہی رہتا ہے۔'' اس نے اپنی پنک استری شدہ قمیض ہینگر کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے کزنز کے ہمراہ پکنک پر جا رہی ہے۔''

''تو اس میں اتنا دلگرفتا ہونے کی کیا بات ہے؟''

''وہ لوگ اکثر ہی کہیں نہ کہیں جاتے رہتے ہیں اور ایک ہمارا گھر ہے، کہیں جانا تو دور کوئی آتا بھی نہیں، حنظلہ بھیا تھے تو ثاقب بھیا یا حذیفہ بھیا آ ہی جاتے تھے، بے شک ہم ان سے گپ شپ نہیں کرتے تھے کبھی، مگر احساس تو رہتا تھا کہ ہمارے پھپھو، چچا زاد بھی ہیں اور جب سے حنظلہ بھیا گئے ہیں، یہ لوگ تو جیسے رستہ ہی بھول گئے ہیں ہمارے گھر کا، سارا آپی بھی پھپھو کے ہمراہ آ جاتی تھیں، تو کتنا اچھا لگتا تھا، مگر شادی کے بعد وہ صرف ایک بار ہی آئیں ہیں اور نند ارد اکے نخرے ہی الگ ہیں۔'' اب ایشاع سمجھی تھی اس کی اداسی کی وجہ۔

''دیکھو نور ہر گھر کا اپنا ماحول ہوتا ہے اور ان کی متعین کردہ اصول، لمٹس اور آزادی بھی۔''

''ہونہہ، یہاں تو صرف لمٹس ہی لمٹس ہیں آزادی تو کہیں نظر نہیں آتی۔''

نور کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جو خاصے آزاد پسند ہوتے ہیں، ہر وقت کچھ نیا کرنے کی خواہش جن میں مچلتی رہتی ہے اور ذرا سی بھی پابندی اور طبیعت کے خلاف بات ان سے برداشت نہیں ہوتی۔

''بس ہر وقت گھر کی چار دیواری میں گھومتے رہو یا پھر کھاؤ پیو اور سو جاؤ، یہ بھی کوئی زندگی ہے، انسان کو کچھ نیا کرنا چاہیے، کچھ ایسا کہ دوسرے اس کے گن گائیں، مگر تمہیں کیا فکر، تم تو بس ایک کنویں میں نکل کر دوسرے کنویں میں جا گرنے کی منتظر ہو بس، تمہیں کیا خبر اپنی مرضی اور من مانی کرنے سے کوئی کام کر کے کتنی خوشی اور سکون ملتا ہے۔''

''چاہے وہ کام آپ کے لئے غلط ہی کیوں ناں ہو۔'' ایشاع نے کپڑے اٹھا کر الماری کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بالکل چاہے صحیح ہو یا غلط، انسان کو یہ سکون تو ہوتا ہے کہ فیصلہ اس کا اپنا تھا۔'' نور نے تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھا۔

''مگر۔'' ایشاع نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا پھر اسے سوتا دیکھ کر سر جھٹکا، کپڑے الماری میں رکھے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ادھر تقدیر نور کی باتیں سن کر پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگی، فی الحال نور کو سمجھانا لاحاصل تھا بعض لوگوں پر نصیحتوں کا اثر نہیں ہوتا، ان کے لئے تقدیر کی ٹھوکر ضروری ہوتی ہے اور جب تقدیر کی ٹھوکر لگتی ہے تو اچھے اچھوں کو عقل آ جاتی ہے۔

☆☆☆

''ہیلو۔'' اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ پر کام کرتے انصار نے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا۔

''السلام علیکم! انصار بھائی کیسے ہیں

آپ؟" دوسری جانب حنظلہ تھا۔

"وعلیکم السلام شہزادے! میں ٹھیک ہوں تم سناؤ کیسے ہو؟ اور تمہارا کینیڈا کیسا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا، ساتھ ہی بائیں ہاتھ سے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا۔

"میں اور کینیڈا دونوں ہی فٹ ہیں، بس آپ کو ایک کام کے لئے کال کی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور پھر یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"جی جی حکم!" اس نے لیپ ٹاپ بند کیا، گھوم کر پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے زمین پر رکھے اور ہمہ تن گوش ہوا۔

"حکم نہیں بس ایک ریکویسٹ تھی وہ...... وہ۔" حنظلہ ہچکچایا۔

"جی بولو۔"

"وہ نور مزید پڑھنا چاہتی ہے ابھی، مگر پاپا اجازت نہیں دے رہے۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر ماموں اجازت کیوں نہیں دے رہے؟"

"اس کیوں کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں، مگر آپ سب جانتے تو ہیں، بچپن سے اب تک کبھی ہماری چلنے دی ہے انہوں نے کبھی، ہمیں ذہنی ٹارچر کر کے نجانے کیا خوشی ملتی ہے اس شخص کو۔" وہ تپ کر بولا۔

"او بھائی یہ بات کیسے کر رہے ہو، والد ہیں وہ تمہارے۔" انصار نے سرزنش کی۔

"والد؟" وہ تمسخر سے ہنسا۔

"میرے والد میرے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے، میں بخوبی جانتا ہوں کہ والد کا وجود ہی اولاد کے لئے کتنی بڑی نعمت ہوتا ہے، اس لئے چاہے کچھ بھی ہو جائے اولاد کو والدین کا ذکر بہت احترام سے کرنا چاہیے۔" انصار نے کہا تو وہ بولا۔

"جی بہتر۔"

"اب بولو، مجھ سے کیا چاہتے ہو اس سلسلے میں۔"

"آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ آپ پاپا سے بات کریں اور انہیں سمجھائیں وہ نور کو ایڈمیشن دلوا دیں۔"

"میرا خیال ہے، اگر تم ماموں کو سمجھانے کے بجائے نور کو سمجھاؤ تو زیادہ بہتر ہے، بڑوں کا کہا ماننے میں ہی بچوں کی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔"

"درست کہا آپ نے، مگر یہ ضروری تو نہیں کہ بڑے ہر بار ٹھیک بات ہی کریں، ان سے بھی تو غلطی ہو سکتی ہے اور آپ بتائیں کہ کیا آگے پڑھنا جرم ہے، کیا نور کی خواہش غلط ہے۔"

"خواہش غلط تو نہیں، مگر۔"

"اگر مگر کچھ نہیں انصار بھیا، مجھے یقین ہے آپ بات کریں گے تو وہ مان جائیں گے۔" وہ باضد ہوا۔

"اوکے یار، تم پریشان مت ہو، میں کروں گا بات۔"

"شکریہ بھیا۔"

"اوکے اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" اس نے موبائل بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ڈالا اور بیڈ کے پیچھے بنی کھڑکی پر سے پردے ہٹا کر دروازے کھول دیئے، شیشے کا دروازہ کھلتے ہی سرد ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا۔

"لگتا ہے آج پھر بارش برسے گی۔" چاند تاروں سے صاف سیاہ آسمان کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا، کمرے کا دروازہ کھلا اور زرقا اندر داخل ہوئیں۔

"ارے انصار بیٹا یہ کھڑکی کیوں کھولی ہوئی

ہے، پتا ہے کتنی سرد ہوا ہے۔" انہوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی بند کی اور پردے برابر کر دیئے۔

"کیا مما اتنی اچھی لگ رہی تھی، ٹھنڈی ہوا۔" وہ خفا ہوا۔

"اچھی تو لگتی ہے، لیکن اگر ٹھنڈ لگ گئی تو مسئلہ ہو گا۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا اور بازوؤں سے پکڑ کر پیچھے بیڈ کر بیٹھا دیا۔

"کیا میں کوئی بچہ ہوں مما جو مجھے ٹھنڈ لگ جائے گی۔" وہ ہنسا۔

"ٹھنڈ صرف بچوں کو ہی نہیں لگتی، کبھی کبھی بڑے بھی اس کے لپیٹے میں آ جاتے ہیں، احتیاط اچھی چیز ہے بیٹا، چلو یہ دودھ ختم کرو۔" انہوں نے پیار سے اس کا کان کھینچا اور ساتھ ہی ٹیبل پر رکھا گلاس اٹھا کر اسے تھمایا، اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا۔

"بچے جتنے بڑے بھی ہو جائیں، والدین کے لئے وہ ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں اور پھر میری تو حیات ہی تم دونوں سے آباد ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

"یو آر گریٹ مما، پاپا کی وفات کے بعد جس طرح آپ نے سب سنبھالا وہ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔" اس نے جھک کر مما کے دائیں ہاتھ پر بوسا دیا۔

"اب تو بس ایک ہی فرض رہ گیا ہے باقی۔"

"کون سا فرض مما؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تمہارے سہرے کے بھی پھول کھل جائیں، تو بس اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"ہو جائے گا سب مما، اپنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔

"یہ ابھی جلدی ہے، سارا کی شادی کو پانچ سال ہو گئے اور تم صرف دو سال ہی تو چھوٹے ہو اس سے۔"

"اوہ مما۔" وہ سر جھٹک کر دودھ پینے لگا۔

"بھابھی بتا رہی تھیں کہ بھائی صاحب نور کی شادی بھی ایشاع کے ساتھ ہی کرنا چاہتے ہیں، تو میں سوچ رہی ہوں کہ نور کو تمہارے لئے مانگ لوں، ایشاع نہ سہی نور ہی سہی، میرے لئے تو دونوں بھتیجیاں ایک سی ہی ہیں۔" ان کی بات پر انصار کو اچھو لگ گیا۔

"کمال کرتی ہیں، مما آپ بھی، آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے، بچی ہے ابھی نور، بڑے ماموں کو تو نجانے کیا ہو گیا ہے اور آپ ہیں کہ ان ہی کا ساتھ دے رہی ہیں، ایسا کیجئے آپ یہ گلاس لیں اور آرام سے جا کر سو جایئے میں بھی ذرا چینج کر لوں۔" وہ انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بنا الماری سے کپڑے نکال کر واش روم کی جانب بڑھ گیا، زرقانفی میں گردن ہلاتی اٹھیں اور پر سوچ انداز میں دروازے کی جانب بڑھیں۔

تین سال پہلے جب انصار نے ان سے ایشاع کے حوالے سے بات کی تھی تو انہیں خوشی ہوئی تھی، کیونکہ یہ ان کی بھی دلی خواہش تھی، انہوں نے انصار کو مزید محنت کرنے اور کچھ بننے کو کہا تا کہ فخر سے بھائی سے بھتیجی کو مانگ سکیں مگر ایسا ہونے سے پہلے ہی شفیق الرحمان نے ایشاع کا نکاح کر دیا اور وہ یہ سوچ کر دل مسوس کر رہ گئیں کہ شاید ایشاع ان کے بیٹے کا نصیب ہی نہ تھی اور انصار نے بھی کبھی دوبارہ پلٹ کر اس کا نام نہ لیا۔

☆☆☆

زندگی کے سمندر میں لہریں بہت آہستگی

سے رواں دواں تھیں، نومبر کا آغاز ہوا اور گرمیاں ٹھنڈے میٹھے دنوں کو ویلکم کرتیں رخصت ہوئیں، سورج کی ہلکی دھوپ میں ایشاع چھت پر رکھی کرسی پر نیم دراز تھی، سورج کی نرم گرم کرنوں سے بچنے کے لئے اس نے چہرے کو دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا، سامنے رکھی دوسری کرسی پر نور ترچھی لیٹی تھی، اس کا سر کرسی کے دائیں بازو پر تھا تو پاؤں بائیں بازو سے نیچے لٹک رہے تھے اور وہ بیزاری سے ہاتھ میں موبائل تھامے پرانے میسجز پڑھ رہی تھی، اس کی تمام دوستوں نے آگے ایڈمیشن لے لیا تھا، اب کبھی کبھار ہی ان کا کوئی میسج آتا تھا اور اگر وہ کبھی خود سے میسج کرتی تو ''بزی ہوں'' کا ریپلائی آ جاتا، میسج چیک کرتے کرتے اس کا دھیان ایک اونچے مردانہ قہقہہ نے کھینچ لیا، وہ اٹھی اور مسکراتے ہوئے ریلنگ کی جانب بڑھنے لگی، ریلنگ کو مضبوطی سے تھام کر اس نے دیوار میں سے اینٹ نکالی۔

''نو......ر۔'' ایشاع نے دوپٹہ ہٹا کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''ششش۔'' اس نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سوراخ سے باہر نیچے گلی میں جھانکنے کی کوشش کی جہاں سے مسلسل باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں، مگر سوراخ چھوٹا تھا، وہ ناکام ہوئی، اس نے اینٹ دوبارہ لگائی اور واپس آ گئی۔

''یہ تم نے کیسے ہٹائی؟'' وہ نور کی جانب دیکھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

''کہو تو دوسری بھی ہٹا کر دکھاؤں۔'' نور نے جھک کر موبائل میز پر رکھا اور لاپرواہی سے کہتی سیڑھیاں اتر گئی۔

اس گھر میں شفٹ ہونے کے بعد پاپا نے اس ریلنگ سے کچھ فاصلے پر چار دیواری کروائی تھی، تاکہ ان کو یا مما کو اوپر آنے پر بے پردگی کا احساس نہ ہو مگر یہ نور، ایشاع کو دل سے افسوس ہوا، تبھی وہ موبائل بجنے لگا، اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا اور چمکتی سکرین دیکھی، کسی نئے نمبر سے کال تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم!'' دوسری جانب سے شائستگی سے کہا گیا۔

''وعلیکم السلام! جی کون اور کس سے بات کرنی ہے آپ کو۔''

''میں علی بات کر رہا ہوں اور عینی سے بات کروا دیں پلیز۔''

''کون عینی؟'' وہ ٹھٹکی۔

''ارے عینی میری کزن، کمال ہے آپ عینی کو نہیں جانتی۔'' وہ کچھ خفا خفا سا بولا۔

ایشاع گڑبڑا گئی اور اسے سمجھ نہ آئی کہ کیا جواب دے۔

''ارے وہی عینی جس کی براؤن آنکھیں، براؤن لمبے بال اور دودھ جیسی سفید گوری رنگت ہے۔'' وہ معصومیت سے بتانے لگا۔

''اچھا اچھا وہ عینی سمجھ گئی۔'' اس نے گردن گھما کر سیڑھیوں کی جانب دیکھا جہاں نور ہاتھوں میں کینو کی ٹوکری پکڑے آ رہی تھی۔

''جی جی وہی عینی، پلیز بات کروا دیں ناں، اس سے میری......''

''ویٹ......ویٹ ابھی کرواتی ہوں۔''

''جی پلیز ذرا جلدی۔'' بے چینی سے کہا گیا۔

''لو بھئی عینی تمہارے کزن علی کا فون ہے تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے موبائل نور کی جانب بڑھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا، وہ دونوں کبھی خود سے

رونگ نمبر ڈائل نہیں کرتی تھیں لیکن اگر کبھی کوئی رونگ نمبر آ جاتی تو اسے بے وقوف بنا کر لطف اندوز ہوتیں اور اس حرکت کو برا نہ سمجھتیں تھیں، ایسا کبھی کبھار ہی سہی مگر ہوتا رہتا تھا، اس لئے نور فوراً ہی اس کا اشارہ سمجھ گئی۔

''ہیلو...... میں عینی۔'' نور نے ٹوکری میز پر رکھی اور خود کرسی پر بیٹھ گئی، ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر بھی آن کر دیا تاکہ ایشاع بھی بات سن سکے۔

''کہاں غائب تھیں عینی تم، اتنے دنوں سے کوئی خیر خبر ہی نہیں، کیا ایک بار بھی میری یاد نہ آئی تمہیں۔'' نہایت جذبے سے پوچھا گیا۔

''پڑھائی میں بزی تھی، تمہیں معلوم تو ہے، ایف ایس سی کی پڑھائی کتنی مشکل ہوتی ہے، انسان کو کہاں ٹائم ملتا ہے کچھ اور یاد رکھنے کا۔''

''اچھا تو کب ایگزیم ہو رہے ہیں جناب کے۔''

''ابھی تو خاصا ٹائم پڑا ہے۔''

''اچھا، ایک بات کہوں یقین کرو گی۔''

''جی کہو، یقین کرنا ہے یا نہیں یہ تو بات سننے کے بعد ہی بتاؤں گی۔''

''آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے، اتنی پیاری کہ کانوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے دل کرتا ہے سنے جاؤ، سنتے ہی جاؤ۔''

''ارے ارے تھوڑی سی شرارت کیا کر لی، آپ تو لائن ہی مارنے لگے، معاف کیجئے گا یہ کسی عینی کا نمبر نہیں، اپنی عینی کو کہیں اور تلاشیے۔'' نور نے جلدی سے کہہ کر کال کاٹ دی، کچھ ہی دیر بعد دوبارہ اسی نمبر سے کال آنے لگی۔

''رہنے دو، مت پک کرو۔'' ایشاع نے منع کیا مگر نور نے کال پک کر لی۔

''دیکھیے آپ کو بتایا تو ہے، یہ عینی کا نمبر نہیں۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''تو پھر جس کا نمبر ہے وہی بات کرلے۔'' وہ بھی کوئی ڈھیٹ تھا۔

''کیوں بھئی جب میں عینی نہیں تو کیوں بات کرلوں۔''

''تو اتنی دیر سے جھوٹ پر جھوٹ کیوں بولے جا رہی تھیں۔''

''تھوڑی سی شرارت تھی اور بس۔'' ایشاع نے اسے گھورا اور کال بند کرنے کو کہا۔

''آپ نے اگر شرارت کی تو ہم کون سے سنجیدہ ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں جانتا ہوں کہ آپ عینی نہیں۔'' وہ ہنسا۔

''اوہ تو آپ ہمیں بنا رہے تھے۔''

''جی آپ کیا سمجھتیں ہیں یہ ڈگری صرف آپ کو ہی ملی ہے۔'' شرارت اگر یہاں تھی تو وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔

''ہونہہ، جایئے جایئے اپنا کام کیجئے۔''

''کام کے قابل چھوڑا ہی کہاں ہے آپ نے، اب تو دل کرتا ہے بس ہر وقت آپ سے ہی باتیں ہوتی رہیں۔''

''میرے پاس اتنا فضول ٹائم نہیں، پڑھنا ہوتا ہے مجھے۔'' نور نے کال کاٹ دی، کچھ ہی دیر بعد پھر کال آنے لگی۔

''یہ تو پیچھے ہی پڑ گیا۔'' اس نے موبائل سائیلنٹ پر لگایا اور دونوں بہنیں کینو کھانے لگیں۔

☆☆☆

بار بار کال آنے کے بعد ہر پانچ منٹ بعد میسج آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، نور نے نہ تو دوبارہ کال رسیو کی اور نہ ہی کسی میسج کا جواب دیا، پھر تیسرے دن آنے والے ایک میسج نے اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

"آپ شاید مجھے ایک رونگ کال سمجھ کر اگنور کر رہی ہیں مگر میرا یقین کریں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے، میں اس شہر میں نیا ہوں اور یہاں پڑھنے کے لئے آیا ہوں، ماموں کے پاس رہتا ہوں اور وہ بھی ان پڑھ ہیں، آپ مجھے آواز سے کافی سمجھدار اور ایجوکیٹڈ لگی ہیں، کیا آپ میری فسٹ ائیر کے سبجیکٹ اور کالج سلیکٹ کرنے میں مدد کریں گی؟" بے حد غور سے میسج پڑھتی نور کو شرمندگی نے آ گھیرا، وہ واقعی اسے رونگ کال سمجھی تھی، اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر اپنے لئے منتخب کردہ سبجیکٹ اور کالج کا نام لکھ کر بھیج دیا، کافی دیر گزرنے تک کوئی میسج نہ آیا تو اسے عجیب سا لگا، انسان تو شکریہ تو کہنا ہی چاہیے تھا، مگر دوسری جانب سے ایسا کچھ نہ ہوا، جب بھی وہ موبائل اٹھاتی ان بکس ضرور چیک کرتی اور پھر آخر دس دن بعد اس کی کال آئی، وہ کمرے میں تھی اور سونے کے موڈ میں تھی۔

"ہیلو! میں علی بات کر رہا ہوں۔"

"کون علی، میں نے پہچانا نہیں۔"

"آپ نے مجھے سبجیکٹ نام اور کالج کا نام بتایا تھا۔"

"جی!" وہ اٹھ بیٹھی۔

"وہ...... میں نے تھینکس کہنے کے لئے کال کی تھی۔"

"اوہ بہت جلد خیال آ گیا جناب کو۔"

"سوری، مجھے اندازہ نہ تھا کہ آپ انتظار کریں گی۔"

"نہیں میں کیوں انتظار کروں گی۔"

"اصل میں پتا ہے کیا، کالج تلاش کرنے اور ایڈمیشن وغیرہ کروانے کے چکر میں اتنا ٹائم لگ گیا، میں نے اسی کالج میں ایڈمیشن لیا ہے، جو آپ نے بتایا تھا اور سبجیکٹ بھی وہی رکھے ہیں۔"

"واقعی۔" نور کو خوشی سی ہوئی۔

"جی بالکل۔"

"پھر کب سے کلاس سٹارٹ ہیں۔" اس کا دل ڈوبا۔

"نیکسٹ ففٹین سے۔"

"کاش میں بھی جوائن کر سکتی۔" اس نے اداسی سے سوچا۔

"گڈ۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"آپ اجازت دیں تو آئندہ بھی اگر کبھی پڑھائی میں مدد کی ضرورت ہو تو، آپ کو کال کر لیا کروں۔"

"اوکے۔" اس نے موبائل دائیں سے بائیں ہاتھ میں ٹرانسفر کیا اور سامنے موجود کلاک کو دیکھا۔

"کیا......اوکے؟"

"کر لیا کریں بھئی۔" اس کی نظریں کلاک کی سوئیوں پر فوکس ہوئیں جو چار بجا رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے، ایک بار پھر بے حد شکریہ، میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، اللہ حافظ۔"

"ارے ارے بات تو سنیئے۔"

"جی اب کیا ہوا؟"

"آپ کو کس نام سے پکاروں؟" وہ فرینڈلی انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ بیڈ سے اتری اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"مطلب یہ کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

"ن......نا......م۔"

"جی......جی۔"

"کچھ بھی کہہ لیں نام میں کیا رکھا ہے۔"

"کسی بھی انسان کو مخاطب کرنے کے لئے

اس کے نام کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے، آپ کو کیا کہہ کر پکاروں۔"
"کچھ بھی کہہ لیں، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔"
"یعنی آپ نام نہیں بتانا چاہتی۔" وہ خاموش رہی۔
"چلئے پھر عینی رکھ لیتے ہیں آپ کا نام۔"
"ٹھیک ہے۔"
"اوکے عینی، اللہ حافظ۔"
اس نے کال کٹ کی اور موبائل تھوڑی سے لگا کر سوچنے لگی، اس دن کے بعد وہ ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے کال کرنے لگا، بات پڑھائی سے شروع ہوتی اور مختلف ٹاپکس پر جا پہنچتی، جلد ہی آپ جناب کا تکلف سمٹ کر تم میں آ گیا اور دونوں اچھے دوست بن گئے، آہستہ آہستہ نور اس کی باتوں کی عادی ہوتی چلی گئی، اب اگر وہ فون نہ بھی کرتا تو وہ خود کر لیتی، اسے ایک اچھا دوست مل گیا تھا، ایک ایسا دوست جو اسے ہر وقت میسر تھا، جس سے وہ بغیر کسی ڈر کے بات شیئر کر سکتی تھی اور وہ کبھی نخرے نہیں کرتا تھا، فری ایس ایم ایس اور کال پیکیجز نے دونوں کو دلوں جوڑا کہ دن رات کا فرق ہی مٹا دیا، مگر جب ایشاع کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بے حد خفا ہوئی، کئی بار اس نے نور کو سمجھایا مگر نور پر کوئی اثر نہ ہوا اور پھر ایک رات جب اس نے نور کو رات ایک بجے تک موبائل پر بات کرتے پایا تو وہ رہ نہ سکی۔
"نور! یہ بالکل غلط ہے۔" وہ غصہ سے بولتی کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھی۔
"کیا بھئی، کیا غلط ہے؟" اپنے سنگل بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے نور انجان بنی۔
"یہی جو تم آج کل کر رہی ہو۔"
"کیا کر رہی ہوں میں، الارم ہی تو لگا رہی ہوں لو یہ دیکھو۔" نور نے موبائل اس کی جانب گھمایا۔
"زیادہ انجان بننے کی ضرورت نہیں ہے، تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں اور اس کی بات کر رہی ہوں۔" اس کی لاپرواہی نے ایشاع کو تاؤ دلا گئی۔
"اچھا تو پھر؟" اس نے آئی برو اچکاتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔
"تمہیں پتا ہے ناں، یہ موبائل صرف بھیا سے بات کرنے کی وجہ سے ہمارے پاس ہے اور اور اگر پاپا کو خبر ہو گئی تو؟" وہ بیڈ سے اتر کر اس کے بیڈ کے قریب آ گئی اور فکرمندی سے بولی۔
"انہیں بتائے گا کون، ہاں تم بتا دو، تو الگ بات ہے۔" نور نے ناراضگی سے منہ پھلاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔
"ٹھیک ہے میں نہیں بتاتی، مگر تمہیں پتا ہے عورت کے لئے آواز کا پردہ بھی ضروری ہے، نا محرم سے ہنسی مذاق کرنا یا اتنی نرم آواز سے بات کرنا کہ وہ آپ کی جانب متوجہ ہو، کتنا گناہ ہے اس میں۔" اس نے نور کے بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا اور سمجھانا چاہا مگر وہ بھڑک اٹھی۔
"پلیز ایشاع! مجھے یہ گناہ ثواب کے لیکچرز مت دو۔" اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
"یہ غلط ہے نور اور تمہیں کوئی بھی غلط کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"
"تم سے اجازت طلب کس نے کی ہے میں بالکل پسند نہیں کرتی کہ تم میرے کسی کام میں بھی مداخلت کرو اور ہٹو میرے بیڈ سے سونا ہے مجھے۔" وہ بدتمیزی سے بولی تو ایشاع فوراً اس کے

بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اور ہاں اگر بات صحیح یا غلط کی ہے تو میں مطمئن ہوں کہ یہ میری خوشی ہے اور اگر بات گناہ یا ثواب کی ہے تو یہ میرا اور میرے خدا کا معاملہ ہے، ویسے بھی اگر تمہیں یاد ہو تو تم ہی نے مجھے اس سے بات کرنے کے لئے کہا تھا۔''

''ہاں کہا تھا، مگر وہ صرف ایک شرارت تھی۔''

''واہ یہ خوب کہی تم نے، تم کرو تو شرارت اور میں کروں تو گناہ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

''نور!'' ایشاع چلائی۔

''اس زندان میں سانس لینے کے لئے ایک کھڑکی کھلی ہے، خدارا مجھے زندہ رہنے دو، مجھے اپنی مرضی سے سانس لینے دو۔'' سختی سے کہتے ہوئے اس نے ایشاع کے سامنے ہاتھ جوڑے اور سر تک کمبل تان کر لیٹ گئی، زیرو بلب کی روشنی میں کھڑی ایشاع اس کے سفید کمبل کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''گھڑی الارم بجا بجا کر پاگل ہو چکی ہے، اب اٹھ بھی جاؤ نور نماز کا ٹائم ختم ہونے والا ہے۔'' اس نے کمبل پکڑ کر کھینچا تو وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہے یہ روز صبح اتنی جلدی کیوں ہو جاتی ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملیں۔

''اگر رات کو جلدی سویا کرو تو صبح اٹھنا کبھی اتنا دشوار نہ لگے۔'' نور نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر بیڈ کے قریب کھڑی ایشاع کو دیکھا، سفید دوپٹے کے حالے میں اس کا چہرہ بہت نورانی لگ رہا تھا۔

''اب اٹھتی ہو یا پاپا کو بھیجوں۔'' وہ اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر دروازے کی جانب بڑھی پھر پلٹ کر بولی۔

''آتی ہوں ناں۔'' نور نے جلدی سے کہا اور بیڈ سے اتر کر سلیپر پہننے لگی، جبھی اس کی نظریں سفید اور سرخ گلابوں پر پڑیں جنہیں سرخ ربن سے باندھا گیا تھا، اس کی بوجھل آنکھیں مکمل کھل گئیں، اس نے ہاتھ بڑھا کر انہیں اٹھایا، پھولوں کے نیچے ہاتھ سے بنا ایک کارڈ تھا، جس پر بنی گڑیا ''ہیپی برتھ ڈے نور'' کہہ رہی تھی۔

''لو یو ایشاع، یو آر سو سویٹ۔'' پیار سے کہتے ہوئے اس نے کارڈ اور پھول اٹھا لیا، علی نے وشک کے بے شمار ایس ایم ایس اور ایم ایم ایس بھیجے تھے، بیڈ پر بیٹھ کر وہ ایک ایک کر کے انہیں پڑھنے لگی، خوشی اس کے چہرے اور آنکھوں سے پھوٹنے لگی تھی، اس نے ''تھینک یو'' کا میسج بھیجا، فوراً ہی ریپلائی آیا۔

''یہ تو کچھ بھی نہیں ڈیئر، اصل سرپرائز تو تمہیں دس بجے کے بعد دوں گا۔''

''آج پھر تم نے نماز قضا کر دی۔'' ایشاع کمرے کے دروازے میں ایستادہ تھی۔

''اوہ شٹ، سوری، ابھی قضا پڑھتی ہوں۔'' اس نے تیزی سے او کے کا ریپلائی دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سوری تم اللہ پاک سے کرنا، نمازوں کی ضرورت ہمیں ہے نور، اللہ پاک کو ہماری ان ٹوٹی پھوٹی نمازوں کی ضرورت نہیں ہے اور بھی قضا نماز بھی۔''

''میں نے پہلے بھی بتایا تھا تمہیں، مجھے تمہارے لیکچرز کی ضرورت نہیں ہے۔'' نور نے اس کی بات کاٹی۔

''یہ صرف لیکچرز نہیں ہیں، اگر تم سمجھنے کی کوشش کرو تو تمہیں احساس ہو کہ، یہ اللہ پاک کی

کتنی بڑی ناراضگی ہے، کہ اس نے تم سے نماز ادا کرنے کی توفیق چھین لی، اس نے تمہیں اپنے قرب سے دور کر دیا، کیا نہیں دیا اس نے تمہیں، ہاں بولو، آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ، ہاتھ، پاؤں، شعور، رہنے کو پرسکون گھر، جانتی ہو ہمارے ملک میں ان نعمتوں سے کتنی ہی لوگ محروم ہیں اور سب سے بڑھ کر اس نے تمہیں مسلمان بنایا، ایک مسلمان گھرانے میں پیدا کیا، اور تم سے اس کی شکر گزاری بھی گراں گزرتی ہے۔'' انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایشاع نے اپنی بات مکمل کی اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

''ہونہہ۔'' نور نے پاؤں پٹخا اور بیڈ پر گر کر کمبل لپیٹ لیا۔

''ہاں اللہ نے سب کچھ دیا، مجھے دل دماغ آنکھ کان ناک شعور سب کچھ دے کر مجھے اس دنیا میں بھیجا اور پھر اس گھر میں قید کر دیا، اس سے تو بہتر تھا وہ مجھے اپاہج اور بے شعور پیدا کرتا، آرام سے اس گھر کے کونے میں پڑی رہتی، کم از کم یہ ہر وقت کی فضول سوچیں اور خواہشات مجھے تنگ تو نہ کرتے۔'' عادت کے مطابق ہو کافی دیر تک بڑبڑانے کے بعد وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی، تقدیر نے نور کی بڑبڑاہٹ سنی اور اس کی ناشکری پر غصے سے سر جھٹکا۔

☆☆☆

دن بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلتے ہی اس کا ذہن علی کے سرپرائز کی جانب گیا، کمبل میں سے ہاتھ نکال کر اس نے دو تین جگہ موبائل تلاشا اور پھر انگلیاں ٹچ ہونے پر موبائل اٹھا کر کمبل کے اندر کر لیا، اگلے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی، علی کے سرپرائز نے اسے کنگ کر دیا تھا، اس کی نظریں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر جمی تھیں،

جہاں علی کا بھیجا ایم ایم ایس کھلا تھا، ایک سانولا اور دبلا پتلا سا لڑکا کھڑا تھا، اگر اس نے اپنی تصویر ہی بھیجی ہوتی تو نور پریشان نہ ہوتی، ساتھ ہی اس نے نور کی تصویر کا مطالبہ کیا تھا، وہ کافی دیر تک ایسے ہی ساکت بیٹھی سوچتی رہی۔

''تصویر بھیج دیتی ہوں، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے، نہیں وہ ایک اجنبی ہے۔''

''وہ اجنبی کہاں رہا، اتنے دنوں سے تو جانتی ہوں اسے، اچھا ہے ایک دوسرے کو دیکھ لیں تو۔''

''نہیں وقت گزاری یا دوستی کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر، وہ ایک اجنبی کو کبھی اپنی تصویر نہیں بھیج سکتی۔'' اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑی تھی، دل کچھ کہتا تو دماغ کچھ مشورہ دیتا، بالآخر اس نے دماغ کی بات مان لی اور سوری کا میسج سینڈ کر دیا، فوراً وائے پوچھا گیا۔

''کیونکہ میں پردہ کرتی ہوں۔'' اسے اس وقت کوئی اور وجہ سمجھ نہ آئی۔

''بہانے مت بناؤ۔'' اس کی کال آ گئی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''اوکے، مگر مجھ سے کیا پردہ؟''

''اف علی، پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''آئی تھنک تمہیں میری تصویر پسند نہیں آئی۔''

''نہیں یہ بات نہیں، تم تو بہت اچھے ہو، بہت معصوم اور ہینڈسم۔''

''پھر شاید تم میرے ساتھ سنسیئر نہیں ہو، جسٹ ٹائم پاس کر رہی ہو۔''

''نہیں ایسا بھی نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''غلط نہیں، میں بالکل صحیح سمجھا ہوں، تمہارے گریز کی یقیناً یہی وجہ ہے۔'' وہ غصہ سے کہتا کال ڈسکنیکٹ کر گیا، نور نے کئی بار دوبارہ

کال ملائی مگر وہ ہر بار کاٹ دیتا۔

''اف۔'' نور نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

''اوکے بابا خفا مت ہو، کر دونگی سینڈ تصویر اپنی۔'' اس نے میسج بھیجا۔

''کب؟'' ریپلائی آیا۔

''بہت جلد۔''

''اوکے میں ویٹ کروں گا۔'' سمائلنگ فیس کے ہمراہ اس کا میسج آیا تھا۔

نور نے شکر ادا کیا کہ جان چھٹ گئی تھی مگر ایسا وقتی طور پر ہوا تھا، وہ ہر کال میں تصویر کے بارے میں سوال کرتا نور کسی نہ کسی طرح ٹال جاتی ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کے بارہ بجے تھے، چاند کی مدھم روشنی ہر طرف پھیلی تھی، ہوا میں ہلکی ہلکی نمی اور خنکی تھی، علی کے گھر کے لان میں موجود جھولے پر وہ تینوں دوست بیٹھے تھے، زاہد اور حارث نے سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی جبکہ علی کے جیکٹ پیچھے جھولے کی بیک پر پڑی تھی، وہ بازو پر شرٹ کی آستین فولڈ کرتا ایک پاؤں سے دھیرے دھیرے جھولا ہلا رہا تھا۔

''میرا نہیں خیال یار علی کہ وہ لڑکی تمہارے ہاتھ آنے والی ہے۔'' زاہد نے ہڈ پر سر جمایا۔

''زاہد ٹھیک کہہ رہا ہے، دو سے ڈھائی ماہ ہو گئے ہیں تمہیں اس سے بات کرتے، تصویر دیکھنا تو دور اس نے اپنا اصل نام بھی تمہیں نہیں بتایا۔'' حارث بولا۔

''ہاں یار تم لوگ ٹھیک کہہ رہے ہو، کتنی ہی بار ناراض ہو کر جان چھڑوانی چاہی میں نے مگر وہ پیچھا چھوڑے بھی تو، اتنی کالز، ایس ایم ایس کرتی ہے کہ مجبوراً مجھے بات کرنا پڑ جاتی ہے۔''

''یار تو ایسا کر اپنا نمبر ہی چینج کر لے۔'' حارث نے مشورہ دیا۔

''ہاں اور کیا یار، فیس بک پر آج کل ٹینا متوجہ کرنا چاہ رہی ہے مجھے، دیکھا نہیں کتنے بولڈ کومنٹس کرتی ہے تیری تصویروں پر، میرا خیال ہے وہ صرف تیری طرف سے ابتدا کی منتظر ہے۔'' زاہد کی بات پر علی نے دائیں جانب گردن گھما کر اسے دیکھا اور بولا۔

''میں تو خود اس بورنگ لڑکی سے تنگ آ گیا ہوں، ذرا سا کھل کر بات کرو یا رومینس جھاڑو تو سالی فوراً بات پلٹ دیتی ہے۔''

''چل پھر آخری بار بات کر لے اس سے، تصویر بھیجتی ہے تو ٹھیک ورنہ سم بدل لینا۔'' حارث نے کہا تو علی اثبات میں سر ہلاتا کال ملانے لگا ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ سے انہیں خاموش رہنے کا کہا۔

''ہیلو۔'' دوسری جانب سے نور کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

''بہت خوب جناب یہاں پل بھر دل کو سکون نہیں اور وہاں بھرپور نیند سے لطف اٹھایا جا رہا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' وہ دھیمی آواز میں فکر مندی سے بولی۔

''سمجھ نہیں آتا محبت میں دو انسانوں کی کیفیت اتنی الگ کیسے ہو سکتی ہے۔''

''آج مجھے بالکل تمہاری باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی؟''

''نیند کا نشہ اترے تو کچھ سمجھ آئے، میں صرف تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ یہاں دل مضطرب کو قرار نہیں وہاں تم چین کی میٹھی نیند سو رہی ہو، یہاں میری سوچیں تم سے شروع ہو کر تم

پر ختم ہوتی ہیں اور وہاں تمہیں پرواہ ہی نہیں، تم ایک تصویر تک نہیں بھیج رہی ہو اپنی۔'' وہ الفاظ چبا چبا کر بولا تھا، اسے اپنے دوستوں کے سامنے ندامت سی ہوئی کہ وہ ایک لڑکی کو نہ پٹا سکا۔

''میری آنکھ بھی بس ابھی لگی تھی، تمہارے بارے میں ہی سوچتے ہوئے، ایک تو تم خفا بہت جلد ہو جاتے ہو۔''

''ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، تم مجھ پر ٹرسٹ کر سکتی ہو عینی۔''

''مجھے تم پر ٹرسٹ ہے علی۔''

''ہاں جبھی تو تم نے اب تک اپنی تصویر تک نہیں بھیجی۔'' وہ مطلب پر آیا۔

''کہا تو ہے یار بھیج دوں گی۔''

''کب؟ اتنے دنوں سے تم مجھے ٹالے جا رہی ہو، بات کیا ہے، آج سچ سچ بتا دو، تم نے مجھ سے دوستی رکھنی بھی ہے یا نہیں۔''

''اف کیسے سمجھاؤں تمہیں آخر۔''

''تم نہیں جانتی عینی، جب بھی میں تم سے کال پر بات کرتا ہوں میری نظریں ہواؤں میں تمہارے دلکش خدوخال تراشتیں رہتی ہیں۔'' وہ لفظوں کا جادو جگانے لگا اور یہ جادو نور کی دھڑکنیں منتشر کر گیا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں مگر۔''

''نہیں تم نہیں سمجھتیں، اگر تم سمجھ سکتیں تو ہمارے درمیان کبھی اس مگر کی دیوار نہ کھڑی ہوتی، میں تو چاہ کر بھی تمہارے خواب نہیں دیکھ سکتا عینی، کہ جب بھی سیاہ رات میری پلکوں پر تمہارے خواب پیروتی ہے مجھے پر چھائیوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' وہ خاموشی سے ہونٹ کترنے لگی۔

''ہم پہروں ایک دوسرے سے فون پر بات کرتے ہیں، پھر آخر تصویر دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔'' اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ پھر بولا۔

''علی پلیز، میں تصویر نہیں بھیج سکتی میرا یقین کرو۔''

''جب میں نے تمہیں اپنی تصویر دیکھا دی، تو تم کیوں مجھے اپنی تصویر نہیں بھیج سکتیں؟''

''کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں اور......اور۔''

''اور تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں۔'' اس نے بات کاٹی۔

''پلیز میری پوری بات تو سنوں، ہم دوست ہیں اور دوست ایک دوسرے کی مجبوری سمجھتے ہیں۔''

''ہاں مگر جب اعتماد ہی نہیں، تو ایسی دوستی کا فائدہ، اوکے بائے۔'' وہ علی علی کرتی رہ گئی مگر اس نے کال کاٹ دی، تینوں دوست ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھنے لگے۔

''کھلاڑی تم کمال کے ہو، اور باتوں میں آج تک کوئی نہیں جیت سکا، مگر اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی کوئی اور لڑکی ہوتی تو کب کی مرمتی۔'' زاہد کی تعریف پر وہ مسکرایا۔

''دفعہ کرو یار، بہت لڑکیاں ہیں تمہارے لئے، یہ نہ سہی تو اور سہی، یہ تصویر بھیجنے والی نہیں، ٹائم نہ ضائع کر بس اب سم چینج کر لے۔'' حارث نے کہا۔

''نہیں ابھی نہیں، محبت کا جادو ایسا ہے کہ ہر ایک پر چل جاتا ہے، کسی پر جلدی تو کسی پر دیر سے، کچھ وقت تو ضرور لگے گا مگر، دیکھنا یہ اپنی تصویر بھیج دے گی اور ایک بار تصویر ہاتھ آ گئی تو سمجھو ہمارا کام آسان، باتوں سے ہی موٹی اسامی لگتی ہے، دس بیس ہزار تو آسانی سے ہاتھ لگ جائیں گے۔''

''چل یار جیسی تیری مرضی، تو باس ہے ہمارا

کبھی غلط کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا، ہم تو اب چلتے ہیں۔'' دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آج یہیں رک جاؤ یار، کوئی مووی شووی دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔'' علی نے انہیں روکا۔

''لگتا ہے آنٹی انکل گھر پر نہیں ہیں۔'' وہ دونوں واپس جھولے پر بیٹھ گئے۔

''ہاں اسلام آباد گئے ہیں، دو تین دن عیش ہی عیش ہیں اپنے۔'' تینوں ہنسنے لگے۔

☆☆☆

''آج کھانے میں کیا بنانا ہے مما؟'' ایشاع صبح کا کام ختم کر کے کچن سے باہر آئی اور لاؤنج میں بیٹھیں مما سے پوچھنے لگی۔

مما نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، ساتھ ہی ساتھ ہاتھ میں پکڑی بہشتی زیور بند کی۔

''بہن کب سے لگی ہے، کچھ خیال ہے تمہیں، چلو اٹھو، دوپہر کا کھانا آج تم بناؤ گی۔'' انہوں نے ذرا سا ترچھا ہو کر دائیں جانب صوفے پر سکڑ کر لیٹی نور کو دیکھا، نور جو موبائل کے بٹن پریس کرنے میں مصروف تھی مما کی بات نہ سن سکی۔

''نور! میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں۔'' مما نے سختی سے اور قدرے اونچی آواز میں کہا تو اس نے گردن گھما کر نا سمجھ انداز میں انہیں دیکھا۔

''اٹھو دوپہر کا کھانا تم بناؤ۔'' مما ضبط کرتے ہوئے بولیں، نور نے ہاتھ میں پکڑا موبائل سائیڈ پر رکھا اور سر پر بازو رکھ کر بولی۔

''مما! مجھے سر درد ہے۔''

''موبائل استعمال کرتے تو سر درد نہیں ہو رہا تھا تمہیں۔'' ایشاع ہنسنے لگی۔

نور نے بازو ہٹا کر ہنستی ہوئی ایشاع کو دیکھا پھر خفگی سے منہ پھلا کر بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا، اس کا انداز مما کو مزید تاؤ دلا گیا جبکہ ایشاع ہنس ہنس کر دہری ہوگئی۔

''یہ جھوٹے بہانے بنانا چھوڑ دو، اب تم بڑی ہوگئی ہو۔'' مما سختی سے بولیں۔

''مجھے سچ میں سر درد ہے مما اور آپ جانتی ہیں کہ مجھے کھانا بنانا نہیں آتا، ایشاع بنالے گی ناں۔'' اس نے اسی انداز میں جواب دیا، اسے آج واقعی یہ درد تھا، ایک ہفتہ ہوگیا، علی نے نہ تو اس کی کال اٹینڈ کی تھی اور نہ ہی اس کے ایس ایم ایس کا جواب دیا تھا۔

''کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے بڑی ہے وہ تم سے، آپی کہا کرو، مگر میں دیکھ رہی ہوں تم دن با دن ڈھیٹ ہوتی جا رہی ہو، کسی بات کا کوئی اثر نہیں تم پر۔'' اس بار نور خاموش رہی۔

''چلو اب اٹھ بھی جاؤ۔'' کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد مما پھر بولیں۔

''کوئی بات نہیں مما، میں بنالوں گی، آپ بتادیں، بس کیا بنانا ہے۔'' ایشاع بولی۔

''نہیں آج کھانا نور ہی بنائے گی، چلو اٹھو نور۔'' مما کے دوٹوک انداز پر نور کو بادل نخواستہ اٹھنا ہی پڑا، اس کی روہانسی شکل دیکھ کر ایشاع پھر سے ہنسنے لگی۔

''ہاں ہاں اڑالو میرا مذاق، اللہ پوچھے گا۔'' نور نے کچن کی جانب جاتے ہوئے ایشاع کے پیچھے لٹکتی ہوئی موتیوں کی لڑیاں ہٹا کر ڈائننگ ٹیبل پر موبائل رکھا، اس کی نظر سامنے لگی جالی کے پار پڑی۔

''دادو اور پھپھو۔'' اس کی آواز پر ایشاع نے بھی پلٹ کر دیکھا اور پھر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

دادو اور پھپھو سے باری باری ملنے کے بعد وہ دادو کو سہارا دے کر اندر لے آئی، مما اور نور بھی

ان سے ملنے لگیں۔

مما نے نور کو کتاب تھمائی، کتاب مما کے کمرے میں رکھنے کے بعد وہ کچن میں چلی گئی اور جب وہ چائے بنا کر لائی تو ایشاع دادو کے سر میں تیل لگا رہی تھی جبکہ مما اور پھپھو کا بازار جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔

''مما! مجھے بھی آپ لوگوں کے ساتھ جانا ہے۔'' اس نے چائے دادو کو دینے کے بعد ٹرے مما اور پھپھو کے سامنے رکھی۔

''کس لئے؟'' مما نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، پھپھو نے ٹرے تھام کر ٹیبل پر رکھ لی۔

''اس لئے کہ اس بار مجھے اپنی شاپنگ خود کرنی ہے۔'' وہ دائیں جانب موجود صوفے پر جا بیٹھی۔

''وہ کیوں؟'' اس بار ان کے لہجے میں سختی در آئی۔

''کیوں کیا مما، آپ ہمیشہ ڈل کلرز اور آؤٹ فیشن ڈیزائن لے آتی ہیں۔'' اس نے اپنا لائٹ گرین دوپٹہ پھیلا دیا۔

''بس مجھے اس بار اپنی شاپنگ خود کرنی ہے۔''

''قطعی ضرورت نہیں ہے۔''

''اب وہ اتنا اصرار کر رہی ہے، تو لے چلو، ویسے بھی اس میں حرج ہی کیا ہے، آج کل سب ہی لڑکیاں اپنی پسند کی شاپنگ کرنا پسند کرتی ہیں۔'' مما کے صاف انکار پر پھپھو نے اس کی حمایت کی۔

''لے جانے کو تو میں لے جاؤں، مگر تم جانتی ہو اپنے بھائی کو، وہ کبھی پسند نہیں کریں گے۔''

''ہونہہ، انہیں پسند ہی کیا ہے، ان کا بس چلے تو ہمارے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دیں۔'' وہ ٹھنک کر بولی اور ڈائننگ ٹیبل پر سے اپنا موبائل اٹھا کر دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''تم دیکھ رہی ہو اس کے انداز۔'' مما نے پھپھو سے کہا۔

''بچوں پر بے جا سختی بھی اچھی نہیں ہوتی۔'' اس نے آخری سیڑھی پر پہنچ کر پھپھو کو کہتے سنا۔

''ہمارے لئے کیا برا ہے، کیا بھلا، یہ تو صرف ہمارے باپ کو پتا ہے۔'' وہ غصے سے بھری چھت پر ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔

''کسی کو بھی میری فکر نہیں، کیا تھا جو مما مجھے بازار لے جاتیں، وہ بھی دو سوٹ اپنی پسند کے خرید لیتی اور وہ گھنی ایشاع دادو کے آتے ہی ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی، ایک بار بھی میری حمایت میں نہ بولی اور تو اور حنظلہ بھیا کو بھی میری پروا نہیں، اتنے دن گزر گئے پاپا سے بات نہیں کی، سب کو بس پاپا کی فکر ہے، ٹھیک ہے جب کسی کو میری فکر ہیں تو مجھے بھی کسی کی پروا نہیں، میری اپنی دنیا ہے اور میں اسی میں خوش ہوں۔'' اسی اگنت سوچوں کے ہمراہ اس کی انگلیوں نے حرکت کی اور ایک ایس ایم ہوا کے دوش پر سفر کرنے لگا۔

موبائل فون پر دوستوں سے باتیں کرتے علی نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے موبائل پر کھلا ایم ایس ایم دائیں جانب بیٹھے حارث اور بائیں جانب بیٹھے زاہد کو دکھایا۔

''دیکھا میں نہ کہتا تھا، ایم ایس ایم آئے گا اس کا، یہ سبھی لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں، محبت کے چند دعوؤں اور وعدوں پر سب کچھ قربان کر دینے والی، تھوڑی سی توجہ سے لفظوں کے جال

میں قید ہونے والی۔'' خباثت سے کہتا وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور کال ملانے لگا۔

نور پلاسٹک کی سفید کرسی پر آ بیٹھی، موبائل میز پر رکھنے کے بعد اس نے سورج کی جانب رخ موڑتے ہوئے کرسی گھمائی، بے حد مضطرب انداز میں دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے وہ بے بسی سے گردن موڑے میز پر رکھے موبائل کی سکرین کو دیکھ رہی تھی جہاں اب علی ان کالنگ لکھا نظر آ رہا تھا۔

''ہیلو۔'' اس نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور کال رسیو کی۔

''ہائے عینی کیسی ہو؟''

''تم سے مطلب۔'' اس نے روٹھے ہوئے انداز میں کہا اور ٹانگ پر ٹانگ جما کر کرسی سے ٹیک لگا لی۔

''ناراض ہو؟''

''کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' موبائل کو دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس نے چہرے پر آئی لٹ کو انگلی پر لپیٹا۔

''نہیں بالکل نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ دوستوں کے درمیان ناراضگی نہیں بلکہ پیار ہونا چاہیے، صرف پیار۔''

''ہاں جان گئی ہوں، جس قدر پیار کرتے ہو تم۔''

''نہیں، تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔''

''جس طرح ایک ہفتہ تک تم مجھے اگنور کرتے رہے ہو، اس سے باخوبی اندازہ ہو گیا ہے مجھے۔''

''تو اس میں قصور بھی تو تمہارا اپنا ہے ناں، ایک تصویر ہی تو دیکھانے کو کہا تھا میں نے اور ایک تم تھیں کہ۔''

''چلو اب تو دیکھ لی تم نے میری تصویر، ہو گئی تمہاری تسلی۔''

''ہاں یار تھینکس، مگر اب سوچ رہا ہوں، تم جو نہیں دیکھا رہی تھیں خود کو، تو ٹھیک ہی کر رہی تھیں۔''

''کیا مطلب، میں سمجھی نہیں۔''

''اتنا خوبصورت چہرہ دیکھ کر تو کسی کا دل بھی بے ایمان ہو سکتا ہے، میری تو پھر اوقات ہی کیا ہے۔'' علی نے اپنے دونوں دوستوں کو دیکھتے ہوئے آنکھ ماری تو انہوں نے انگوٹھے دیکھائے اور ہنسنے لگے۔

''بکو مت۔'' وہ جھنجھلائی، اس انداز میں اپنی تصویر پر ریمارکس سن کر اسے عجیب سا لگا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں عینی تم واقعی سراپائے حسن ہو، میرے خیالوں میں تراشے گئے پیکر سے بھی بڑھ کر حسین و دلکش۔'' اس نے علی کی باتیں سن کر مسکراتے ہوئے انگلی پر لپٹی لٹ کان کے پیچھے اڑاسی اور آسمان کی وسعتوں کے درمیان اڑتے کبوتر کو دیکھنے لگی، جو اپنے غول سے بچھڑ کر انجانی راہوں پر بھٹک رہا تھا اور ادھر سے ادھر بھٹکتا منزل کا راستہ تلاش کر رہا تھا، مگر وہ ننھا کبوتر نہیں جانتا تھا کہ منزل پر پہنچنا ہر ایک کے لئے اتنا آسان نہیں ہوتا، کبھی کبھی تو عمر بیت جاتی ہے مگر راستہ نہیں ملتا۔

''ہیلو...... ہیلو۔'' خاموشی محسوس کر کے علی نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا، وہ سمجھا شاید کال کٹ گئی۔

''جج...... جی۔''

''کیا بات ہے یار، کیا سوچنے لگیں۔'' اس کی آواز سن کر علی نے گہری سانس بھری۔

''میں سوچ رہی ہوں، کہ آخر ہمارا یہ تعلق کہاں تک جائے گا۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز

میں بولی۔

''جہاں تک تم چاہو گی۔'' علی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب، سیدھی سیدھی باتیں کرو، آج تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔''

''سیدھی بات یہ ہے کہ، تم سے چند دن کی دوری نے ہی مجھے اندازہ کروا دیا ہے، کہ تم میرے لئے کیا حیثیت اختیار کر گئی ہو، تمہاری فضول ضد کی وجہ سے میں نے خود کو بے حد مشکل میں پایا، بے حد مشکل سے خود کو سمجھایا کہ اب تم سے بات نہیں کرنی، اب تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا، ان کی دیوار کھڑی کی، کہ جب تم میری اتنی سی فرمائش پوری نہیں کر سکتیں تو میں بھی کیوں تمہارا خیال کروں، مگر تمہاری جانب سے آنے والا ہر ایس ایم ایس، ہر کال اس دیوار میں دڑاریں ڈال دیتی تھی، سوری عینی، آئی ایم سوری۔'' علی کا لہجہ پھوار بن کر اس پر برسنے لگا اور وہ اس میں سرتاپا بھیگنے لگی تھی۔

''اب تو تم سے ملنے کی ہی حسرت ہے، پلیز اب تم یہ مت کہنا، کہ یہ ناممکن ہے، تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں نے تمہارے گھر کے نجانے کتنے ہی چکر لگا لئے ہیں۔''

''کیا...... کیا...... تم ہمارے گھر آئے تھے۔'' وہ ایک دم خوفزدہ ہوئی۔

''ہاں جی اور وہ بھی پورے تین بار، عتیق الرحمان نام ہے ناں تمہارے والد کا اور سیاہ سفید سنگ مرمر سے بنا ہے ناں تمہارا گھر؟''

''تمہیں...... تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' اس کی باتوں نے نور کے اوسان خطا کر دیئے۔

''ان باتوں کو چھوڑو، بس یہ بتاؤ تم آؤ گی ملنے یا پھر میں آجاؤں۔'' علی کی باتوں سے اس کا پسینے میں شرابور وجود لرزنے لگا تھا۔

☆☆☆

انصار جونہی لاؤنج میں داخل ہوا، اس کی نظریں ڈبل صوفے پر بیٹھے منجھلے ماموں اور چھوٹے ماموں پر پڑیں۔

باری باری مصافحہ کرنے کے بعد وہ بڑے ماموں عتیق الرحمان کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اور کیا حال ہے انصار۔'' بڑے ماموں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے ماموں جان، آپ کی دعاؤں سے حال بالکل ٹھیک ہے۔'' حنظلہ کے بتائے گئے کام کے لئے وہ مصروفیت کے باعث ٹائم نہیں نکال پا رہا تھا، آج جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد ڈیوٹی پر جانے سے پہلے ماموں سے ملنے کا فیصلہ کیا، اس نے دیکھا کہ تینوں ماموں سفید لباس اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

''جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری؟ کہو کیسے آنا ہوا؟ سب خیریت تو ہے ناں؟''

''کیا مطلب ماموں، کیا میں بغیر خیریت کے آپ سے ملنے نہیں آسکتا؟'' اسے تعجب ہوا۔

''آسکتے ہو برخودار، کیوں نہیں آسکتے، مگر پولیس گھر آئے تو ڈر ہی لگتا ہے کہ سب خیریت ہو۔'' انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''نہیں ماموں! ایسا کچھ نہیں، ڈیوٹی کے لئے نکل رہا تھا، آپ کی یاد آئی، تو ملنے چلا آیا۔'' اس نے سر جھکا کر اپنے یونیفارم کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

منجھلے ماموں جز بز ہونے لگے، ایسی ہی کیفیت چھوٹے ماموں کی بھی تھی جیسے انہیں انصار کا آنا پسند نہ آیا ہو۔

''بھائی صاحب پھر کیا سوچا ہے آپ

نے؟" منجھلے ماموں پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

"کس بارے میں؟" بڑے ماموں کے اس طرح انجان بننے پر دونوں ماموں حیرت سے گردن گھما کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے اور انصار ان تینوں کو۔

"اسی بارے میں بھائی صاحب، جس بارے میں انصار کے آنے سے پہلے باتیں ہو رہی تھیں۔" چھوٹے ماموں بولے۔

"ہے تو ناانصافی کی بات مگر۔"

"کیسی ناانصافی بھائی صاحب، آپ کے پاس اس وقت مین مارکیٹ میں چلتی ہوئیں چار دکانیں ہیں، اگر ان میں سے ایک دکان آپ چھوٹے بھائی کو دے دیتے ہیں تو آپ کا کیا جائے گا۔"

"مت بھولو، یہ دکانیں ابا حضور کی وارثت سے نہیں، ابا حضور کی صرف ایک دکان ہی میرے پاس ہے۔"

"اور میں اسی ایک دکان کی بات کر رہا ہوں۔" منجھلے ماموں نے بڑے ماموں کی بات کاٹی تو بڑے ماموں کی پیشانی پر ناگواری کی بڑی واضح لکیریں نمودار ہوئیں۔

"میں پچھلی باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا مگر اب جب تم مجھے مجبور کر ہی رہے ہو تو میں تمہیں بتا دوں، کہ ابا جی کی وہ دکان جو اپنے اعلیٰ و بہترین خالص سونے اور دیدہ زیب ڈیزائنوں کی وجہ سے پورے شہر میں مشہور تھی وہ اس وقت تم دونوں کے پاس ہے، حالانکہ ابا حضور وہ دکان میرے سپرد کر گئے تھے، مگر کچھ ہی عرصہ بعد تم بھائیوں کو شک ہونے لگا کہ آمدنی کا زیادہ تر حصہ میں خود رکھتا ہوں اور تم لوگوں کو کم دیتا ہوں، ایسا ہی اختلاف تم دونوں کی بیویوں کو بھی ہوا تھا، میں نے سوچا دلوں میں دیواریں کھڑی ہونے سے بہتر ہے گھروں میں دیواریں کھڑی کر لی جائیں، کہ اینٹ مٹی کی دیواریں گرانا آسان ہے، دلوں میں کھڑی دیواروں کے، میں نے وہ چلتی ہوئی دکان تم دونوں کو دے دی اور خود، سالوں سال سے خالی پڑی دوسری دکان لے کر الگ ہو گیا، اس وقت تم لوگوں نے کچھ نہیں سوچا، خالی دکان میں نئے سرے سے سب شروع کرنا آسان نہ تھا، مگر اللہ نے بہت برکت دی، میرا کام جم گیا اور پندرہ سالوں میں، میں نے ایک سے چار دکانیں بنا لیں اور تم دونوں اسی ایک دکان کو ہی لئے بیٹھے ہو، اس بھری دکان کو دیمک کی طرح چاٹ کر بھی تم لوگوں کا گزارہ نہیں ہوتا۔" ان کا لہجہ کافی ہتک آمیز تھا۔

دونوں ماموں اس طرح ان کی صاف گوئی اور آئینہ دکھانے پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے مگر معاملہ چونکہ ان کے اپنے مفاد کا تھا اس لئے خون کے گھونٹ بھر گئے۔

"جو کچھ بھی ہے بھائی صاحب، آپ ہمارے بڑے ہیں، ہم اپنے کھلونے لے کر آپ کے پاس نہیں آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔" چھوٹے ماموں اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ بولے اور ان کی بات پر بڑے ماموں کچھ نرم پڑ گئے۔

"تم لوگوں کا حق تو نہیں بنتا اب، کیونکہ ابا حضور کا بنایا گھر بھی تم ہی لوگوں کے استعمال میں ہے، بڑا بھائی ہونے کی وجہ سے چلو مان لیتا ہوں تمہاری بات، مگر میری ایک شرط ہے؟"

"وہ کیا بھائی صاحب۔" منجھلے ماموں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ دکان میں اپنی مرضی سے دوں گا، مرحوم ابا حضور کی کوئی نشانی تو میرے پاس بھی ہونے چاہیے۔"

''جی...... جی بھائی صاحب، جیسے آپ کی مرضی، ہمیں اعتراض نہیں۔'' چھوٹے ماموں نے منجھلے ماموں کی جانب دیکھا اور دونوں بڑے ماموں کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

یہ تینوں بھائیوں کے آپس کا معاملہ تھا، اس لئے انصار نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، وہ سوچ رہا تھا کہ جس مقصد کے لئے وہ آیا ہے وہ کرے یا نہ کرے، جبھی نور چائے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی، اس نے آہستہ سے سلام کیا اور خاموشی سے چائے ٹیبل پر رکھ کپوں میں ڈالنے لگی، سرمئی دوپٹے کو حالت نماز کی مانند اپنے گرد لپیٹے ہوئے وہ بہت معصوم اور چھوٹی دیکھائی دے رہی تھی، انصار نے باغور اس کا چہرہ دیکھا، وہ اسے کچھ کنفیوژسی لگی، آنکھوں کے نیچے پڑے سیاہ حلقے بھی اس کی پریشانی کی نشاندہی کر رہے تھے۔

''شاید اپنی پڑھائی ختم ہونے کی وجہ سے پریشان ہے، آج اسے لازمی بات کرنا ہو گی۔'' اس نے سوچا، نور کے جانے کے بعد ماموں نے ٹرے آگے کی جانب کرتے ہوئے سب کو چائے لینے کا کہا۔

''وہ ماموں، حنظلہ بتا رہا تھا کہ آپ نے، نور کا تعلیمی سلسلہ ختم کر دیا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

وہ ایک باصلاحیت آفیسر تھا مگر اپنے بڑوں کا ادب، لحاظ اور رعب انسان کے بڑی سے بڑی پوسٹ پر پہنچنے کے باوجود ختم نہیں ہوتا۔

ماموں نے تیوری چڑھا کر اس کی جانب دیکھا، جیسے کہنا چاہتے ہوں۔

''تو پھر۔''

''میرا مطلب ہے ماموں، میٹرک تک کی پڑھائی کیا اہمیت رکھتی ہے بھلا؟''

''کیوں اہمیت نہیں رکھتی، تعلیم انسان کو شعور اور آگہی دیتی ہے، میٹرک تک پہنچتے پہنچتے بچے اور خصوصاً بچیاں اتنی باشعور تو ہو ہی جاتی ہیں کہ گھر، گھرہستی سنبھال سکیں، ویسے بھی ہم نے اپنی بچیوں سے کوئی جاب تو کروانی نہیں، اس لئے میرے خیال سے گھر میں رہنے والی بچیوں کے لئے اتنی تعلیم بہت ہے۔'' انہوں نے نہایت آرام سے کہتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا جیسے یہ بات ان کے لئے مطمئن اہمیت کی حامل نہ ہو۔

''معاف کیجئے گا ماموں جان، مجھے یہاں آپ سے اختلاف ہے، انسانی شعور، آگہی کی کوئی حد متعین نہیں کہ اتنا پڑھ لو تو انسان اتنا باشعور ہو جاتا ہے، کبھی کبھی تا عمر کی پڑھائی بھی اس کے لئے ناکافی ہوتی ہے، ویسے بھی نور آگے پڑھنا چاہتی ہے، ڈاکٹر بننا چاہتی ہے، تو اس میں ہرج بھی کیا ہے، یہ تو اچھی بات ہے۔''

''اپنی اولاد کی اچھائی، برائی ہم باخوبی جانتے ہیں برخودار۔'' ماموں کی آواز میں تعفن در آیا اور الفاظ کی شیرنی تلخی میں بدل گئی۔

''وہ تو ٹھیک ہے ماموں، مگر خاندان کی سبھی لڑکیاں تو تعلیم حاصل کر رہی ہیں...... تو۔''

''خاندان کی سبھی لڑکیاں، دیکھا تھا کل میں نے، ردا کو۔'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے بڑے ماموں کی سمت دیکھا۔

''رستوران میں ایک لڑکے کے ہمراہ اونچے، اونچے قہقہے لگا رہی تھی، سب پتا ہے مجھے جو یہ کالج اور یونیورسٹی والے آج کل تعلیم دے رہے ہیں، نئی نسل کی بے راہ روی میں، ان اداروں کے آزاد ماحول کا بڑا ہاتھ ہے، مگر نہیں۔'' انہوں نے گہرا سانس بھرا پھر بولے۔

''ان اداروں سے زیادہ تو ان والدین کا قصور ہے جنہوں نے لڑکیوں کو ڈھیل دی ہوئی

ہے، بھئی لڑکیوں کو ڈھیل دو گے تو وہ تو بگڑیں گی ہی۔'' ان کی باتوں پر بڑے ماموں نے بہت برداشت کرتے ہوئے خود پر قابو رکھا کہ وہ ہاتھ آئی دکان گنوانا نہیں چاہتے تھے۔

''جن لڑکیوں نے بگڑنا ہوتا ہے، وہ گھر کی چار دیواری میں بھی بگڑ جاتی ہیں اور جنہوں نے نہیں بگڑنا ہوتا، آپ انہیں چاہے جتنی بھی آزادی اور کھلا ماحول دے دیں، وہ کبھی نہیں بگڑتیں۔'' انصار خاموش نہ رہ سکا اور اس کی بات نے ماموں کے جلال کو آواز دے دی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا، تم کہنا چاہتے ہو کہ میری بیٹیاں بگڑی ہوئی ہیں۔''

''معاف کیجئے گا ماموں، میرا یہ قطعی مطلب نہ تھا، مگر......''

''بس۔'' ماموں نے گرج دار آواز میں ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ بولنے سے روکا اور تنبیہی نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

''میں اپنے گھریلو معاملات میں کسی کی بھی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا، اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ بات پکی کر دی ہے میں نے نور کی، دو تین ہفتے میں وہ یورپ سے آ جائے، پھر ایشاع کی طرح نور کا بھی نکاح کر دوں گا اور دونوں کی اکٹھی رخصتی، کان کھول کر سن لو تم لوگ، آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ اپنی محنت کی وجہ سے ہوں، مجھے اپنی محنت پر فخر اور میری بیٹیاں میرا غرور ہیں۔'' پر جوش انداز میں بولتے ماموں یہ بھول گئے یہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

دونوں ماموں گھر میں داخل ہوئے، ڈرائینگ روم میں رکھے صوفے پر مجھلی ممانی نازش بیٹھی تھیں، ان کے سامنے ٹیبل پر پھلوں کی ٹرے رکھی تھی، کیلا کھاتے ہوئے وہ فل والیم سے چلتا ہوا ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھیں، نیچے کارپٹ پر بیٹھی چھوٹی ممانی غزالہ دعا کو سریلیک کھلا رہی تھیں، دائیں جانب کونے میں رکھے کمپیوٹر کے سامنے رکھی راکنگ چیئر پر سولہ سالہ راحیل بیٹھا چیٹنگ میں مصروف تھا، اس سے کچھ فاصلے پر رکھے تخت پر ردا اور ندا ہاتھ میں ایک پھولدار کپڑا لئے الجھ رہی تھیں، دونوں بہنوں کی عمروں میں دو سال کا فرق تھا مگر خود غرضی کا عنصر دونوں میں برابر کا تھا، کوئی بھی ایک چیز دوسری کو دینے پر راضی نہ ہوتی، ذرا ذرا سی بات پر دونوں میں خوب بحث ہوتی اور جو جیت جاتی وہ چیز اسی کی ہو جاتی۔

''تمہیں اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے، جب دیکھو کمپیوٹر کے سامنے جمے ہی نظر آتے ہو، کبھی اپنی پڑھائی پر بھی توجہ دے لیا کرو۔'' چھوٹے ماموں نے سب سے پہلے رک کر اپنے بیٹے راحیل کی کھنچائی کرنا چاہی مگر ہیڈ فون لگا ہونے کی وجہ سے اس پر کچھ اثر نہ ہوا، ماموں سر جھٹک کر آگے بڑھے اور نازش ممانی کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئے جس کے ایک جانب سعید الرحمٰن پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔

''ردا! ادھر آؤ ذرا۔'' سعید الرحمٰن نے اپنی بڑی بیٹی کو بلایا، وہ کپڑا پھینک کر منہ بناتی اٹھی، ندا نے لپک کر کپڑا اٹھایا اور اسے زبان دکھائی، کپڑا اب اس کا تھا۔

''جی!'' ردا بیزاری سے باپ کے قریب کھڑی ہوئی۔

''وہ تمہارے ساتھ لڑکا کون تھا؟''

''کب پاپا؟'' اس نے اطمینان سے پوچھا۔

''کل۔''

''کل کس ٹائم کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہ آیا۔
''کل دوپہر کی۔'' وہ درشتی سے بولے۔
''اوہ...... وہ۔'' اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔
''وہ تو......فواد تھا، کیوں کیا ہوا؟''
''اسے کہو اپنے والدین کو بھیجیں۔''
''وہ کس لئے؟''
''تمہارے رشتے کے لئے۔''
''واٹ پاپا۔'' وہ بری طرح چونکی۔
''اگر تمہیں اس طرح اس کے ساتھ گھومنا پھرنا ہے تو اسے تمہارا رشتہ بھجوانا ہوگا۔''
''پاپا...... یونو...... ہم صرف دوست ہیں، اچھے دوست اور یونیورسٹی کے آدھے سے زیادہ لڑکے میرے دوست ہیں، تو کیا میں ان سب کو اپنا رشتہ بھیجنے کے لئے کہوں۔'' وہ ہنسی۔
''یہ تمیز سکھا رہی ہو تم بیٹیوں کو، یہ یونیورسٹی پڑھنے کے لئے جاتی ہے...... یا۔'' انہوں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ہاتھ جھٹکا۔
غزالہ ممانی نے گھبرا کر ٹی وی بند کیا جبکہ نازش ممانی نے نہایت آرام سے ہاتھ کے اشارے سے ردا کو اندر جانے کا کہا، ماں کا اشارہ پاتے ہی وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔
''کیا بات ہے؟ کیوں آتے ہی بچوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟''
''پیچھے نہ پڑوں تو کیا آرتی اتاروں تمہاری نالائق اولاد کی، حنظلہ اور انصار بھی تو ہیں، انہی کے ہم عمر، کس طرح اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں اور ایشاع، نور کو دیکھوں تو دل میں آگ سی لگ جاتی ہے، کہ میری بیٹیاں کیوں ایسی نہیں، کتنے طریقے سلیقے سے رہتی ہیں۔''
''ارے چھوڑو، ان دقیانوسی لوگوں کو، اٹھارویں صدی کی پیدائش ہیں، انہیں کیا خبر فیشن اور سٹائل کی۔'' نازش ممانی سے ان کی تعریف برداشت نہ ہوئی تھی چاہے وہ حسد کی آگ میں لپٹی ہوئی ہی کیوں نہ ہوتی۔
''آپ لوگ جب بھی بڑے بھائی کے گھر سے آتے ہیں، اسی طرح غصے میں بھرے آتے ہیں، ان باتوں کو چھوڑیے یہ بتایئے جس کام کے لئے گئے تھے، وہ ہوا کہ نہیں۔'' غزالہ ممانی نے بچے ہوئے سریلیک کی کٹوری صوفے کے نیچے کی اور اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں۔
''کام تو بن گیا، مگر بڑے بھیا نے آج اتنی بے عزتی کی ہے کہ بس۔'' سعید الرحمٰن منہ بنا کر بولے۔
''تو آپ کیوں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے، دینا تھا ناں جواب۔'' نازش ممانی بولیں۔
''جواب تو میں خوب دیتا، مگر کیا کریں، مطلب اپنا تھا، اس لئے خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔''
''ہر بار یہی ہوتا ہے، وہ بے عزتی کرتے ہیں اور آپ لوگ منہ بنا کر آ جاتے ہیں۔''
''سو سنار کی تو ایک لوہار کی، بس مجھے ایک بار موقع ملنے دو، پھر دیکھنا کیسے گن گن کر بدلے لیتا ہوں۔'' سعید الرحمٰن آہ بھر کر بولے۔

☆☆☆

''کیا بات ہے ایشاع، کیا ابھی تک کھانا نہیں بنا؟'' مما نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
''ڈنر تو ریڈی ہے مما، بس پاپا کا انتظار ہے۔'' اس نے بریانی کا دم چیک کرنے کے بعد چولہا بند کر دیا۔
''ان کا فون آیا تھا، صدیقی صاحب کا بیٹا آ رہا ہے آج، اس لئے وہ دیر سے آئیں گے، ایسا

کرو تم کھانا لگا دو۔'' مما ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھیں، ایشاع کھانا لگانے لگی۔
''یہ نور کہاں ہے؟'' انہوں نے ٹیبل پر برتن رکھتی ایشاع کو دیکھا۔
''وہ تو دوپہر سے چھت پر ہے۔''
''اتنی دیر سے وہاں کیا کر رہی ہے وہ؟''
''پتا نہیں مما، آپ کھانا شروع کریں، میں بلا کر لاتی ہوں اسے۔''
''ہاں بلا کر لاؤ اور اماں کو کھانا دے دیا تھا ناں۔''
''جی مما، وہ تو مغرب کے بعد ہی دے دیا تھا، دادو کا پرہیزی کھانا۔''
''ٹھیک ہے۔'' مما اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی تو وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔
''اس بار تو ہماری پارٹی ہی جیتے گی۔'' سیڑھیوں کے نیچے بنے دروازے سے ایک لڑکے کی آواز سنائی دی۔
''ہاں کیوں نہیں، آخر ہمارے راجا کی دہشت ہی کافی ہے۔'' دوسرا لڑکا بولا اور پھر مردانہ قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں، وہ سر جھٹک کر آگے کی جانب سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
''نور کہاں ہو بھئی، مما بلا رہی ہیں، چلو جلدی نیچے چلو۔'' ہوا کے سرجھونکوں نے اسے آخری سیڑھی پر ہی رکنے کو مجبور کر دیا، یہ جنوری کی ایک سرد رات تھی، آسمان پر آج چاند کچھ زیادہ ہی روشن اور دلکش دیکھائی دے رہا تھا، ستارے قطار در قطار لگائے چاند کو دیکھنے میں محو تھے، جس سے چھٹتی روشنی نے ہر چیز کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا، اس طلسمی رات کی دلکشی کو بھرپور انداز میں محسوس کرتے ہوئے اس نے چھت پر قدم رکھا، سفید لباس میں ملبوس نور کرسی پر پاؤں سکیڑے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی، اس کی دبی دبی سسکیوں اور جھٹکے کھاتے وجود نے ایشاع کے پاؤں جہاں تھے وہیں روک دیئے۔
''نور! میری بہن، کیا ہوا تمہیں، تم ایسے کیوں رو رہی ہو۔'' وہ تڑپ کر آگے بڑھی، ایشاع کی آواز پر نور نے آہستہ سے سر اٹھایا، اس کی سرخ آنکھیں پانی سے لبریز تھیں اور چہرے پر مایوسی چھائی تھی۔
''کیا بات ہے نور، کیا ہوا ہے؟'' وہ اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی، نور خاموشی سے سامنے دیکھتی رہی۔
''کچھ بولو بھی، آخر ہوا کیا ہے؟'' ایشاع نے اس کا شانہ جھنجھوڑا، آنسو بہاتی آنکھوں سے نور نے اس کی جانب دیکھا اور پھر میز پر پڑے موبائل کو دیکھ کر سسکی بھری، ایشاع نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور پھر لپک کر موبائل اٹھایا، پہلا بٹن پریس کرتے ہی موبائل کی سکرین روشن ہو گئی جہاں ایک ایم ایس ایم کھلا تھا، بے ربط بولتے اور بے آواز روتے ہوئے نور نے اسے جو کچھ بتایا تھا اسے سنتے ہوئے اس کی پیشانی پر بل پر بل پڑنے لگے۔
''اوہ میرے خدایا۔'' کبھی نور اور پھر ایم ایس ایم کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنا سر تھام لیا۔
ایم ایس ایم میں نور کی ایک انجان لڑکے کے ہمراہ نہایت قابل اعتراض حالت میں تصویر تھی، صرف یہی ایک تصویر نہیں بلکہ ان بکس میں اس طرح کے بیس ایم ایس ایم اور بھی موجود تھے، اس نے سن ہوتے دماغ اور بے جان ہوتے ہاتھوں سے چند اور ایم ایس ایم دیکھے۔
''یہ...... یہ تم۔'' اس میں بولنے کی ہمت نہ رہی، نور نے دونوں ہاتھ اس کے گلے میں ڈالے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
''اب کیا چاہتا ہے وہ؟'' ایشاع نے

پوچھا۔

''ملنے کا کہتا ہے، اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ نہ صرف یہ سب ہمارے گھر بھجوا دے گا بلکہ میرا بہت برا حشر کرے گا، پتا نہیں کیسے اس نے ہمارے گھر کا پتہ بھی معلوم کر لیا ہے، میری ایک تصویر کا اس نے یہ حال کیا ہے، تو ملنے پر۔'' اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔

''تم اس قدر بیوقوف بھی ہو سکتی ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' اس نے سختی سے اسے خود سے دور کیا۔

''غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے ایشاع۔''

''غلطی تم اسے غلطی کہتی ہو۔'' اس نے تاسف سے اسے گھورا۔

''تمہیں اندازہ بھی ہے، تمہاری اس ذرا سی غلطی نے، نہ صرف تمہارا بلکہ پورے خاندان کی عزت داؤ پر لگا دی ہے۔'' نور کا سر جھک گیا اور ندامت سے اس کی بھیگی آنکھیں مزید بھیگنے لگیں۔

''یہ دنیا صرف ایک دھوکہ ہے، فریب اور کچھ نہیں یہاں اگر کچھ کر کے دیکھانا ہے تو کچھ ایسا کر کے دیکھاؤ جس سے گھر والے تم پر فخر کریں، جس سے دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں، جسے تم غلطی کہہ رہی ہو، وہ غلطی نہیں گناہ ہے اور گناہ کی ترغیب شیطان دیتا ہے، شیطان کے کہنے پر چلو گے تو اس کے پیروکار کہلاؤ گے، جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اسلام میں مرد و عورت کی دوستی کی نہ اہمیت ہے نا گنجائش، دونوں نا محرم ہیں ایک دوسرے کے لئے، چہرے کے ساتھ ساتھ آواز کا پردہ بھی کیوں ضروری ہے، یہ تمہیں آج اچھی طرح سمجھ آ گیا ہو گا، اسی دن کے لئے سمجھاتی تھی تمہیں، مگر تم نے میری کوئی بات نہ مانی، تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے، نور بہت مایوس کیا ہے، میری ایک نصیحت کا بھی اثر تم پر نہ ہوا، میرے اتنے سمجھانے پر بھی تم نہ پلٹیں، ابھی تو پاپا نے تم پر اتنی سختی رکھی ہے تب تم نے یہ کیا، اگر وہ تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق آزادی دے دیتے تو تم کیا کرتیں۔''

''بس کرو، خدا کے لئے بس کرو، میں نادم ہوں، مجھے احساس ہو گیا ہے، کہ کتنا بے اعتبار کر دیا ہے مجھے اس انجان شخص نے، میرے کردار پر کیچڑ مل کر مجھے بے مول کر دیا، آسمان کی بلندیوں سے پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے، میرا دل کرتا ہے یہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں، اگر پاپا نے یہ تصویریں دیکھ لیں تو، اب میں کیا کروں ایشاع، اب میں کیا کروں۔'' اسے درد، اذیت، پشیمانی اور ندامت کی دلدل میں پھنسے دیکھ کر ایشاع کا دل پگھلنے لگا، تقدیر کی ایک ہلکی سی ٹھوکر ہی نور کو سب اچھا برا سمجھا گئی تھی، مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ اس ٹھوکر سے حاصل کیے گئے سبق کے بعد نور سنبھلتی بھی ہے یا نہیں۔

''تم پریشان نہ ہو نور، میں مما سے بات کروں گی۔'' ایشاع نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''انہیں بتاؤں گی سب۔'' ایشاع نے دیکھا کہ اس کی تسلی سے نور کی آنکھوں میں آس کے دیپ جلنے لگے تھے۔

''مما کو۔''

''ہاں مجھے یقین ہے، وہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں گی۔'' نور نے پرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھا، دیپ کی لو بجھنے لگی تھی۔

''مما نے اگر پاپا کو بتا دیا تو پھر، پھر کیا ہو گا؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

ایشاع نے اس کی آنکھوں کے بجھتے ہوئے

دیپ دیکھے اور نرمی سے اس کے ہاتھوں کو دبایا۔
''اللہ پر یقین رکھو نور، وہ ضرور کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا، نماز اللہ کی طرف سے ایک پلیٹ فارم ہے، جہاں انسان اپنے لیے سکون اور اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ سکتا ہے، اپنے رب سے مل سکتا ہے، تم بھی باقاعدگی سے نماز ادا کرو اور اس سے دعا مانگو، وہ کبھی بھی تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔'' ایشاع نے سمجھاتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کی بھیگی آنکھیں خشک کیں، نور نے اپنے لبوں کو باہم پیوست کیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایشاع نے کمرے کا دروازہ کھولا اور پریس کیے ہوئے کپڑے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی، الماری کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے ایک نظر بیڈ پر بیٹھی نور پر ڈالی جو بہت مگن انداز میں کچھ بنانے میں مصروف تھی، اس نے تمام کپڑے بیڈ پر رکھے اور الماری کھول کر ہینگر نکالے، کپڑے ہینگر کرنے کے بعد اس نے ہینگرز کو ترتیب سے الماری میں لٹکا دیا اور الماری کا دروازہ بند کر کے نور کی جانب آ گئی۔
''صبح سے کیا بنایا جا رہا ہے جناب۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر نور کے سامنے رکھا بڑا سا چارٹ اٹھا لیا، نور نے کھلے کھلے انداز میں بیڈ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔
''واہ بیوٹی فل۔'' ایشاع نے ہونٹ سکوڑے، نور نے پنسل اور کلرز مارکر کا استعمال کرتے ہوئے کافی خوبصورت پینٹنگ بنائی تھی۔
''مگر یہ ہے کیا؟'' اس نے تصویر کو مکمل اپنی جانب گھماتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔
یہ ایک تھری ان ون تصویر تھی، پہلے حصہ میں ایک بہت ہی خوبصورت پنجرہ بنایا گیا تھا، جس میں دانے بکھیرے تھے، پیارا سا پانی کا برتن رکھا تھا، جس کے قریب ایک چڑیا بنی تھی، چڑیا کے چہرے پر اداسی رقم تھی، جیسے وہ اس خوبصورت پنجرے سے ناخوش تھی، اور سر اٹھائے حسرت بھری نگاہوں سے اوپر کی جانب دیکھ رہی تھی اوپر جہاں اونچے پربتوں پر برف پگھل رہی تھی، جہاں چارسو ہریالی بکھری تھی اور پرندے آزادی کے گیت گائے ادھر سے ادھر اڑان بھر رہے تھے، چڑیا بھی آزادی چاہتی تھی، پربتوں کی اونچی چوٹیوں کو چھونا چاہتی تھی اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آزادی کے گیت گانا چاہتی تھی مگر چونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی، تو اس کی آنکھوں میں حسرت پانی بن کر ابھر آئی تھی، تصویر کا دوسرا حصہ بالکل ایسا ہی تھا بس اس میں ایک سیاہ ہاتھ نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا تھا، چڑیا پر پھیلاتی آزادی کے گیت گاتی آسمان کی جانب اڑنے لگی تھی، تیسرے حصے میں چڑیا کے پیچھے ایک بڑا عقاب لگا تھا جو اسے اپنے پنجوں میں جکڑنا چاہتا تھا، چڑیا چیختی چلاتی واپس پنجرے کی جانب بڑھ رہی تھی جہاں وہ قید تو ضرور تھی مگر اس کی جان محفوظ تھی۔
''یہ کیا ہے؟'' ایشاع نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا، نور نے آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
''کیا مطلب کیا ہے، سب کچھ تو واضح ہے۔'' اس نے تصویر ایشاع کے ہاتھوں سے لے لی اور خود دیکھنے لگی۔
''کیا خاک واضح ہے، تمہیں معلوم ہے پرندوں کو قید کرنا بری بات ہے۔'' ایشاع نے ہاتھ ہلا کر کہا اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔
''یہ چڑیا نہیں بلکہ میں ہوں۔'' نور نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا۔

''تم۔'' ایشاع نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

''ہاں میں اور مجھ جیسی وہ تمام نادان لڑکیاں جو گھر کو قید سمجھتی ہیں۔'' اس نے گہرا سانس ہوا کے سپرد کیا۔

''گھر کی مانوس فضا میں جن کا دم گھٹتا ہے اور وہ انجان مگر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی ہیں، مگر وہ نہیں جانتیں کہ باہر کتنے ہی عقاب ان کی تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ کوئی چڑیا بھولے سے ہی اس جانب آئے تو وہ اسے جھپٹ لیں۔''

اس نے بوجھل پلکیں اٹھائیں، بے شمار آنسو اس کی آنکھوں کے نیچے کھینچتے اس کی تھوڑی پر سے قطرہ قطرہ ٹپکنے لگے۔

''شاید تمہیں میری بات سمجھ نہ آئے، مگر میں تجربے کی بھٹی میں جلی ہوں اور اس تجربے نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ ایک لڑکی کے لئے گھر کی چار دیواری سے بڑھ کر محفوظ اور کوئی پناہ گاہ نہیں۔''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ایشاع نے تصویر ایک جانب کی اور دونوں بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔

''میں جانتی ہوں کہ میں نے وہ غلطی کی ہے جس کی اجازت نہ ہمارا مذہب دیتا ہے اور نہ ہماری فیملی، گھر کا ماحول اور یہ بات مجھے سکون نہیں لینے دیتی۔''

''تم شرمندہ ہو نور، تم نے توبہ بھی کر لی ہے اور اللہ پاک معاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں، بلکہ ان سے محبت بھی کرتے ہیں، انہوں نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہو گی، مجھے یقین ہے وہ مزید تمہیں کسی آزمائش میں نہیں ڈالے گا۔''

''ہاں میں جانتی ہوں، پھر بھی مجھے ہر لمحہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر اس نے اپنی دھمکی پوری کر دی تو نہیں...... نہیں مجھے کچھ کرنا ہو گا، مجھے لازمی کچھ کرنا چاہیے، مگر کیا، سمجھ نہیں آتا۔'' اس سے پہلے کہ ایشاع اسے کوئی جواب دیتی دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلتا چلا گیا، دونوں بہنیں سیدھی ہو بیٹھیں اور نور نے جلدی سے اپنا چہرہ دوپٹے سے صاف کیا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی۔'' کھلے دروازے سے مما اندر داخل ہوئیں۔

''کچھ خاص نہیں مما ویسے ہی۔'' ایشاع نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

''اوکے میں یہ بتانے آئی تھی کہ کل صدیقی صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ آ رہے ہیں اور تم دونوں کان کھول کر سن لو، خصوصاً تم نور۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر اس کی جانب اشارہ کیا۔

''میں کوئی بھی فضول حرکت یا بات نہ سنوں۔''

''جی مما۔'' دونوں نے آہستہ سے سر ہلائے، اپنی بات کہہ کر وہ مطمئن سی واپس مڑ گئیں کہ اچانک ایشاع نے پکارا۔

''مما!''

''جی!'' وہ پلٹیں اور سوالیہ نظروں سے ایشاع کو دیکھنے لگیں۔

''وہ ہمیں آپ سے کچھ بات کرنی تھی؟'' ایشاع نے کہا تو نور نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔

☆☆☆

صدیقی صاحب کی فیملی آئی اور پندرہ دن بعد نکاح کی تاریخ رکھ دی گئی، رشتہ تو پہلے ہی طے تھا، اب تو صرف رسمی کاروائی کی گئی تھی، مما پھپھو اور دادی کو نور کی اتنی جلد شادی پر اعتراض تھا مگر پاپا کے سامنے کسی کی نہ چلی، جو فیصلہ وہ ایک بار کر لیتے اس کے خلاف جانا کسی کے بس میں نہ تھا، آہستہ آہستہ ان پر دن گزرنے لگے، نور جلے

پیر کی بلی کی مانند سارے گھر میں چکراتی پھرتی پھر نکاح سے ٹھیک دو دن پہلے حنظلہ کی آمد پر ایشاع نے اسے مسکراتے پایا، شدید بے چینی اور اضطراب کی جس لہر نے اسے پچھلے دنوں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، وہ ٹھہر گئی تھی، ایشاع نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

نکاح والے دن سرخ جوڑے میں اس چھوٹی سی خوبصورت دلہن نے سب کا دل موہ لیا اور پھر نکاح کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد عباد کی بسم اللہ کی تقریب میں وہ ہو گیا جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆☆☆

''انصار، یہ کیا تماشا ہے؟'' پھپھو آگے بڑھیں اور اس کا بازو تھاما۔

''یہ تماشا نہیں مما، حقیقت ہے، اور یہ حقیقت میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔'' اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑوایا اور اس کی جانب مڑا۔

''کبھی کبھی آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو جاتی ہے، آنکھیں بھی دھوکا کھا سکتیں ہیں۔'' وہ برہمی سے گویا ہوئیں۔

''وہ عام انسانوں کی آنکھیں ہوں گی مما، ایک فرض شناس پولیس انسپکٹر کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتیں۔'' اس کا لہجہ چٹان کی مانند مضبوط تھا۔

''جو کچھ بھی ہے میں تمہیں کبھی یہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دوں گی۔''

''مجھے معاف کیجئے گا مما، مگر میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا، میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے یہ جرم کرتے دیکھا ہے اور اس کا حلیہ بھی اس بات کی تصدیق کر رہا ہے۔'' اس نے پہلے اس کے خون سے بھرے کپڑوں کی جانب اشارہ کیا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔

''میری ممتا یہ سب تسلیم نہیں کرتی۔'' وہ با ضد تھیں۔

''نو...... نو...... میں نے اسے موقع واردات پر آلہ قتل کے ہمراہ پایا ہے، اس لئے اب آپ مجھے میرے فرض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتیں۔'' گیٹ کے باہر پولیس موبائل آکر رکی، دو سپاہی اور دو لیڈی کانسٹیبل اندر آئیں، انصار کو سلوٹ کرنے کے بعد اس کے ہمراہ اندر گئے، جائے واردات کا معائنہ کرنے لگے، معائنہ کے دوران کچن کی کھلی کھڑکی نے انصار کو چونکا دیا، تمام پوائنٹ نوٹ کروانے کے بعد اس نے احتیاط سے رومال میں لپیٹ کر چھری کو اٹھایا اور بغور دیکھتا ہوا باہر نکل آیا، اس کے ایک اشارے پر لیڈی کانسٹیبلز حرکت میں آئیں اور ایشاع کو ہتھکڑی پہنانے لگیں۔

ایشاع کے پتھر وجود میں حرکت ہوئی اور آنکھیں چھلک پڑیں۔

''ہٹو...... ہٹو...... میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ لیڈی کانسٹیبل کو جھٹکتے ہوئے پیچھے ہٹی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا، خدا کے لئے میرا یقین کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔

''تم نے نہیں تو پھر کس نے کیا، بولو، تمہارے اور نور کے علاوہ وہاں کوئی اور تھا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ہاں تھا، وہ کوئی اور تھا۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کوئی اور تھا، تو کون تھا؟'' انصار نے بھنویں اچکائیں۔

''پتا نہیں، میں نہیں جانتی۔'' وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"بیوقوف کسی اور کو بنانا، یہ چھری تم دیکھ رہی ہو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی چھری اس کے سامنے کی۔

"یہ کچن کی چھری ہے، بالفرض تمہاری بات مان بھی لی جائے تو کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ قاتل قتل کرنے آیا اور ہتھیار بھی ساتھ نہ لایا۔" وہ ہنسا اور پھر بولا۔

"بس افسوس تو اس بات کا ہے میرے گھر میں، میری موجودگی میں اتنا سب ہو گیا اور میں......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھٹکا۔

"لے چلو اسے۔" وہ آگے بڑھا۔

حکم ملتے ہی لیڈی کانسٹیبل نے بازو سے پکڑ کر جھٹکے سے اسے کھڑا کیا اور گاڑی کی جانب لے جانے لگیں، دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے ہی مما منہ پر دوپٹہ رکھے سسک رہی تھیں، ان کی آنسوؤں بھری آنکھوں نے سب کہہ ڈالا تھا۔

"میرا یقین کریں، میں نے کچھ نہیں کیا۔" اس نے التجاء بھری نظروں سے اپنے بڑے چچا، ماموں اور سب کزنز پر ڈالی مگر سب نے منہ پھیر لئے، ان کی نظروں میں اس کے لئے ہتک تھی، اسے لگا ان سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ سب مرد تھے، صرف مرد، ایسے مرد جو کبھی عورت کی نہیں سنتے، جو کبھی عورت کی بات کو اہمیت نہیں دیتے، ہمیشہ سے مرد کی بات اور دلیل کو عورت پر فوقیت دی جاتی ہے، اس وقت بھی اس کا رونا دھونا کسی نے نہیں دیکھا تھا، نہ اس کی التجائیں کسی نے سنی تھیں، لیڈی کانسٹیبل نے اسے کھینچا تو وہ بے جان قدموں سے چل دی۔

انصار ڈرائیور کے ہمراہ بیٹھا تھا اسے پیچھے کی جانب بٹھایا گیا، جھٹکے سے موبائل سٹارٹ ہوئی اور پھر چل پڑی۔

تمام رستہ وہ روتی رہی، دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا، آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، وہ لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی زمین کو دیکھتی رہی، اس کی نظریں موبائل کی جالیوں سے گھر کے رستے کو دیکھتی رہیں کہ شاید کوئی آئے اور چلتی موبائل رکوا کر اسے نیچے اتار لے، شاید یہ سب خواب ہو، بھیگی آنکھیں اور سن ہوتا ذہن یہی سوچتا رہا، مگر کچھ نہ ہوا، موبائل پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہو کر رکی، لیڈی کانسٹیبل نے اسے لاک اپ میں لے جا کر بند کر دیا جبکہ انصار اپنے آفس کی جانب چلا گیا، سب سے پہلے اس نے ارجنٹ ریکوسٹ پر چھری کو فنگر پرنٹس کے لئے بھجوایا، چند ضروری کام نمٹانے کے بعد ایشاع کو انویسٹی گیشن روم میں لانے کو کہا، وہ خود بھی اپنی کیپ اور اسٹک اٹھا کر انویسٹی گیشن روم کی جانب جانے لگا کہ پی ٹی سی ایل بجنے لگا۔

ڈی ایس پی صاحب کا فون تھا، فون سننے کے بعد وہ انویسٹی گیشن روم کی جانب بڑھ گیا، جونہی وہ روم میں داخل ہوا ایشاع تیزی سے اس کی جانب لپکی۔

"نور کیسی ہے اب؟ ہوش آیا اسے؟" وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"پلیز مجھے اس کے پاس لے چلیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کر کے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹھو وہاں۔" اس نے سختی سے کہا تو وہ خوفزدہ سی واپس کرسی پر جا بیٹھی، وہ اسٹک میز پر رکھتا ہوا اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا، ایک سپاہی اور لیڈی کانسٹیبل مودب کھڑے تھے، سیور بلب کی سفید روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

''پلیز مجھے لے چلیں ناں نور کے پاس۔''
اسے خاموش دیکھ کر اس نے ایک بار پھر التجاء کی، سرمئی سوٹ میں کچھ دیر پہلے دمکتی ہوئی اس کی دودھیا رنگت اس وقت سرسوں کے پھول کی مانند زرد تھی اور سیاہ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، گلابی پنکھڑی سے ہونٹوں پر بار بار دانتوں سے کاٹنے کی وجہ سے خون کی لائنز بنی تھیں، ایک لمحہ کے لئے انصار کا دل نرم پڑ گیا مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی نظر اس کے کپڑوں پر جا بجا لگے نور کے خون پر پڑی تو سب کچھ پھر سے یاد آ گیا۔
''میرے سامنے زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں کانچ چیخ رہے تھے، ایشاع نے ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا، اس وقت اس کے سامنے بیٹھا شخص کہیں سے بھی اس کا پھوپھو زاد نہیں لگ رہا تھا، وہ تو کوئی انجان اور کرخت پولیس انسپکٹر تھا جس کے سامنے بڑے سے بڑے مجرم بھی کانپتے تھے۔
''تم نے نور کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟ کس بات پر تمہارا اس سے جھگڑا ہوا تھا؟'' وہ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اس کی جانب جھکتا ہوا گرجا۔
''نہیں...... نہیں...... میں نے نہیں۔'' وہ خوفزدہ سی کرسی کی بیک سے جا لگی۔
''جھوٹ مت بولو، میں نے خود تمہیں چھری نکالتے دیکھا تھا۔'' اب کی بار وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر شدت سے رو پڑی۔
''رونے سے کچھ حاصل نہ ہو گا، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنا جرم قبول کر لو۔'' وہ پیچھے ہٹا اور کرسی پر بیٹھ گیا، لہجہ بے حد سفاکیت لئے ہوئے تھا۔
''آخر آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتے۔'' اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔
''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات کا یقین کر بھی لیتا ہوں تو تم وہاں کیا کرنے گئیں تھیں؟''
''میں نور کو ڈھونڈنے گئی تھی، کچن میں، میں نے دیکھا وہ شخص نور کو مار رہا تھا، اس نے چہرہ سیاہ کپڑے سے چھپا رکھا تھا، میں نے وہ کپڑا ہٹا دیا وہ کوئی اور تھا، پھر وہ مجھے بھی نور پر دھکا دے کر بھاگ گیا، کچن کی کھڑکی سے۔'' وہ دونوں پاؤں کرسی پر رکھے سکڑی بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔
''اچھی کہانی بنائی ہے تم نے۔'' اٹھ کر کھڑا ہوا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا، جہاں ڈر اور خوف کے ہمراہ اسے سچ کی پرچھائی دیکھائی دی۔
''میرا یقین کریں، میں سچ بول رہی ہوں۔'' انصار کے بار بار اس کی بات رد کرنے اور شک کرنے نے اسے توڑ ڈالا تھا۔
''سچ تو یہ ہے کہ تم جانتیں تھیں کہ تمہارا بھائی باہر سیٹل ہو جائے گا اور نور کو رستے سے ہٹانے کے بعد سب کچھ تمہارے نام ہو جائے گا۔''
''نہیں...... نہیں۔'' وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر شدت سے چلائی۔
''یا پھر سچ یہ ہے کہ تم کہیں اور انوالو تھیں کسی کے ساتھ چکر تھا تمہارا اور نور کو خبر ہو گئی، کہیں وہ سب کو بتا نہ دے اس ڈر سے تم نے اس کو مارنے کی کوشش کی، ہے ناں۔'' وہ چلتے چلتے رک گیا، وہ بار بار اس پر نفسیاتی دباؤ ڈال رہا تھا مگر اس بار وہ برداشت نہ کر سکی، تڑپ کر اٹھی، گردن گھما کر بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر دائیں جانب گرتی چلی گئی۔
لیڈی کانسٹیبل نے فوراً اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھایا، سپاہی پانی لینے گیا اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا، ایشاع کا اس طرح دیکھنا اسے شرمسار

کر گیا۔

''کیا یہ سچ کہہ رہی ہے؟'' وہ الجھا۔

''سر مجھے لگتا ہے یہ لڑکی سچ بول رہی ہے۔'' لیڈی کانسٹیبل بولی۔

''یہ سچ کہہ رہی ہے یا جھوٹ، اس کا فیصلہ فنگر پرنٹس کی رپورٹ آنے کے بعد ہوگا، فی الحال ہوش میں آنے پر اسے واپس لاک اپ میں لے جاؤ۔'' نجانے کیوں اس میں مزید ایشاع کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ الجھا الجھا روم سے باہر آ گیا، کبھی کبھی سچ سامنے ہونے کے باوجود سات پردوں میں جا چھپتا ہے اور انسان سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان رہتا ہے، کہیں دور تقدیر یہ سارا منظر دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں بڑی راز درانہ سی چمک ابھری، سچ کو اب کیسے منظر عام پر لانا تھا وہ باخوبی جانتی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن اسے انصار کو کچھ ضروری کاموں کے سلسلے میں ہائی کورٹ جانا پڑا، صبح دس بجے کے قریب اس کے پاس چھوٹے ماموں کا فون آیا کہ نور کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور نماز جنازہ عصر میں ہے، وہ جلد از جلد کام نمٹانے کے باوجود خاصا لیٹ ہو گیا، گھر پہنچتے ہی اس نے چینج کیا اور جنازہ میں شرکت کے لئے پہنچا، لوگوں کے درمیان ہونے والی چہ موگوئیاں سن سن کر وہ حیران رہ گیا، ایشاع پر جرم ثابت تو نہیں ہوا تھا ابھی، ابھی تو صرف شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا اسے مگر لوگوں کی باتوں نے اسے قاتل بنا ڈالا تھا اور یہ باتیں پھیلانے میں بڑا ہاتھ نازش ممانی اور سعید الرحمٰن ماموں کا تھا، جنہیں اپنا حسد نکالنے اور بدلا لینے کا موقع مل گیا تھا، لوگوں کی سرگوشیاں سن سن کر اس کا ذہن بار بار ایشاع کی جانب جاتا رہا، تدفین سے فارغ ہوتے ہی وہ سیدھا تھانے پہنچا، آفس میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں ٹیبل پر دوڑنے لگیں۔

''کرم داد!''

''یس سر!'' اس کی آواز پر سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔

''فنگر پرنٹس کی رپورٹ آنا تھی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے سپاہی کرم داد کی جانب دیکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہ سر ابھی ابھی پہنچی ہے۔'' سپاہی نے ایک سفید لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

اس نے لفافہ تھاما اور اسے کھولنے لگا، رپورٹ بغور پڑھتے ہوئے وہ چونک پڑا، رپورٹ کے مطابق چھری پر دو فنگر پرنٹس تھے، ایک تو ایشاع ہی کے تھے جبکہ دوسرے کے بارے میں گمان تھا کہ وہ کسی میل کے ہو سکتے تھے۔

''میں نے کچھ نہیں کیا، میں نے کچھ نہیں کیا، میرا یقین کریں وہ کوئی اور تھا۔'' اس کے کانوں میں ایشاع کی روتی ہوئی آواز آنے لگی۔

وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر دائیں ہاتھ کا انگوٹھا کنپٹی پر رکھے شہادت کی انگلی سے پیشانی کو رگڑتے ہوئے سوچنے لگا۔

''گھر کے کچن میں چھری صرف مما اور ماسی کے استعمال میں رہتی ہے اور اس دن تقریب کی تیاریوں کی وجہ سے کچن میں کوئی کام کیا ہی نہیں گیا تھا، تو ایسے میں ایشاع کے علاوہ کسی دوسرے کے فنگر پرنٹس ملنے کا مطلب یہ تھا کہ ایشاع سچ بول رہی تھی۔'' لمبی سانس بھرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات جو ملزم لائی گئی ہے اسے تفتیشی روم میں لاؤ۔''

''یس سر!'' سپاہی نے سلوٹ کیا اور پلٹ

گیا، وہ خود بھی تفتیشی کمرے کی جانب چل پڑا۔

ایک لیڈی کانسٹیبل اور سپاہی کی ہمراہی میں ایشاع داخل ہوئی تو وہ کمرے کے چکر لگا رہا تھا، اسے داخل ہوتے دیکھ کر رک گیا، لیڈی کانسٹیبل نے اس میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے کا کہا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی، انصار اس کے سامنے رکھی کرسی پر جا بیٹھا۔

''نور کیسی ہے؟'' ایشاع نے بے تابی سے پوچھا۔

انصار نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا جہاں پژمردگی، یاسیت، سنجیدگی اور دکھ کے گہرے تاثرات تھے، تاہم وہ رات کی نسبت خاصی حواسوں میں تھی، شاید اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

''نور کیسی ہے، وہ ٹھیک تو ہے ناں؟'' اس کی خاموشی پر اس نے جھنجھلاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' لمحہ بھر کو تو وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ اسے کیا جواب دے پھر سنجیدگی سے بولا۔

''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں، تم نے نور کو چھری کیوں ماری تھی۔''

''میں بہت بار آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''مگر میں نے تمہیں خود چھری نور کے پیٹ سے نکالتے دیکھا تھا۔''

''ہاں میں نے صرف چھری نکالی تھی۔'' اس نے اقرار کیا۔

''تو تم نے چھری کیوں نکالی، کیا تم نہیں جانتی تھیں اس طرح چھری پر تمہارے فنگر پرنٹس آ جائیں گے۔''

''اوہ تو آپ کا خیال ہے کہ میں اس ڈر سے اپنی بہن کو تڑپتے ہوئے دیکھتی رہتی، پولیس کے آنے کا انتظار کرتی، چاہے میری بہن اس حالت میں ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان دے دیتی۔'' اس نے سوالیہ اور طنزیہ انداز میں کہا۔

رشتے کا لحاظ کرتے اور اسے بے قصور سمجھتے ہوئے انصار اس کا لہجہ برداشت کر گیا، دائیں ہاتھ کی مٹھی کو سختی سے دباتے ہوئے وہ آہستہ سے اٹھا اور بائیں جانب چلا۔

''تو کیا واقعی تم نے نور کو مارنے کی کوشش نہیں کی۔'' وہ کچھ دور چل کر رکا۔

''نہیں...... نہیں...... نہیں...... کتنی بار بتاؤں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، وہ کوئی اور تھا؟'' وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''کون؟'' وہ پلٹ کر اس کی جانب مڑا۔

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''ہاں سچ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا، میں نہیں جانتی وہ کون تھا؟'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''تمہیں اس شخص کا چہرہ یاد ہے؟'' وہ واپس اس کی جانب آیا۔

''چہرہ۔'' اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوچا۔

''ہاں...... چہرہ...... کیسا دیکھتا تھا وہ شخص۔'' انصار اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔

''ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔'' وہ میز پر کچھ آگے کی جانب جھک آئی۔

''ایک منٹ۔'' اس نے اسے روکا اور پھر گردن گھما کر سپاہی کی جانب دیکھا، سپاہی سر کو جنبش دیتا مڑ گیا، کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہمراہ ایک شخص تھا جس کے ساتھ میں پنسل اور کاپی تھی، وہ شخص میز کے ساتھ رکھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ

گیا۔

''تمہیں اس شخص کا جو بھی حلیہ یاد ہے، وہ انہیں بتاؤ۔'' انصار نے اس کی جانب دیکھ کر آنے والے شخص کی جانب اشارہ کیا، ایشاع نے ایک نظر اس شخص پر ڈالی پھر خلا میں نظریں جماتے ہوئے آہستہ آہستہ حلیہ بتانے لگی۔

''سر یہ شخص تو کہیں...... دیکھا بھالا لگتا ہے۔'' کاغذ پر ابھرنے والی تصویر کو دیکھ کر سپاہی کرم داد بولا۔

اس کی بات پر انصار نے چونکتے ہوئے تصویر لی اور اسے اپنے سامنے کر کے دیکھنے لگا۔

''کیا خیال ہے؟ کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اصل پتا تو جناب کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ کے بعد ہی چلے گا۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

''او کے جلد از جلد پرنٹ آؤٹ کے لئے دو۔'' اس نے اسکیچ بنانے والے شخص کو مخاطب کیا اور اسکیچ اس کی جانب بڑھایا۔

''یس سر!'' وہ اسکیچ تھامے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب تم سب جا سکتے ہو اور ایشاع تم میرے ساتھ آؤ۔'' وہ کمرے سے نکل کر وقار سے چلتا ہوا تھانے کی حدود سے باہر آیا، جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی، ایشاع سر جھکائے اس کے پیچھے چلنے لگی۔

☆☆☆

لاؤنج میں بچھی سفید چادر پر مما، پھپھو، دونوں چچیاں اور دادو بیٹھی سپارے پڑھ رہی تھیں، حنظلہ اور پاپا ایک جانب کھڑے کوئی بات کر رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' ایشاع نے اندر داخل ہو کر سب کو مشترکہ سلام کیا، جواب میں خاموشی رہی تو وہ ٹھٹکی، انصار دروازے میں ہی رکا۔

''آپ سب یہاں ہیں، تو ہسپتال میں نور کے پاس کون ہے؟'' اس نے باری باری مما اور پھپھو کی جانب دیکھا جو خود پر بہت ضبط کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''چلیے ناں مما، نور کے پاس چلتے ہیں۔'' وہ کچھ انہونی ہونے کے خیال کو جھٹکتے ہوئے مما کے قریب جا بیٹھی، مما نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

''چلیے ناں پھپھو، آپ میرے ساتھ چلیے۔'' اس نے مما کے ساتھ بیٹھیں پھپھو کا گھٹنا ہلایا، پھپھو نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سپارے کو مزید مضبوطی سے خود سے لگایا۔

یہاں بھی جواب نہ پا کر وہ اٹھی اور حنظلہ کی جانب بڑھی۔

''چلو ناں بھیا، آپ ہی مجھے نور کے پاس لے چلو، وہ اکیلی ہو گی۔'' حنظلہ نے سر جھکا لیا، اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔

''کیا بات ہے، سب اتنے خاموش کیوں ہیں، کوئی مجھ سے بولتا کیوں نہیں ہے آخر۔'' اسے شدت سے کچھ غلط ہونے کا گمان ہوا۔

''مجھے نور کے پاس جانا ہے، مجھے نور کے پاس لے چلیں۔'' اب وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

مما اور پھپھو نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی دبائی، دادو کے آنسو بہنے لگے۔

''ہونہہ پہلے چھری گھونپ کر اسے مار ڈالا، اب بہت معصوم بنا جا رہا ہے، چلو بھئی غزالہ ہم سے تو یہ ناٹک دیکھے نہیں جاتے۔'' نازش نے غزالہ سے کہا اور پھر دونوں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔

پاپا کا سر شرمندگی سے جھک گیا اور غصے

سے ان کا دماغ کھولنے لگا۔

''بس کرو ایشاع، نور اب اس دنیا میں نہیں رہی اور اس کی وجہ ہو تم، میں آج ہی تمہارے سسرال فون کرتا ہوں کہ آ کر اپنی امانت لے جائیں، مجھ سے تو شرمندگی کا یہ بوجھ مزید اٹھایا نہیں جاتا اور نہ ہی میرے گھر میں کسی قاتل کے لئے کوئی جگہ ہے۔'' پاپا غصہ سے کہتے دروازے کی جانب بڑھے پھر رک کر سختی سے باہر کھڑے انصار کو گھورا اور چلے گئے، ایشاع وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی، اذیتوں کے بے شمار لشکر ایک ساتھ ہی اس کے وجود میں اتار دیئے گئے تھے۔

''نور!'' ایک سسکی بھری آواز اس کے منہ سے برآمد ہوئی اور وہ با آواز بلند رونے لگی۔

حنظلہ اس کے قریب زمین پر آ بیٹھا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر شفقت سے تھپکنے لگا، انصار سے مزید یہ منظر دیکھنا ناممکن ہو گیا، اسے شدت سے احساس ندامت نے آ گھیرا کہ اس نے ناحق ایشاع پر شک کیا، وہ دروازے سے ہی واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

کمپیوٹر پرنٹ آؤٹ کے بعد جو تصویر نکلی تھی وہ ایک سیاسی پارٹی کے کارکن شہزاد راجا کی تھی، انصار حیران تھا بھلا راجا سے نور کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہونے لگا تو اس نے تصویر میز پر پھینک دی۔

''کہیں ایشاع، جھوٹ تو نہیں بول رہی۔'' اس کے دماغ نے کہا۔

''نہیں وہ جھوٹ نہیں بول سکتی۔'' اس کے دماغ نے فیصلہ دیا۔

''کیا..... ایسا ہو سکتا ہے، کہ وہ کوئی اور شخص ہو، راجا سے ملتا جلتا، واقعی ایسا ہو تو سکتا ہے۔'' ایک سوچ اس کے ذہن کے پردوں پر لہرائی۔

''مجھے کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ تصویر ایشاع کو دکھا کر کنفرم کرنا چاہیے۔'' اس نے اسٹک اٹھائی اور کیپ سر پر رکھ کر باہر کی جانب بڑھا، جیپ اسٹارٹ کر کے ماموں کے گھر پہنچا، سفید گیٹ کے سامنے جیپ روک کر وہ اندر داخل ہو گیا۔

''لو آ گئے، لاٹ صاحب۔'' اسے کمرے میں قدم رکھتا دیکھ کر ماموں بولے، وہ حیران ہوتا آگے بڑھا۔

''کیا بات ہے ماموں؟'' اس نے کمرے میں موجود حنظلہ، مما، پھپھو اور دادو کی جانب دیکھا، دادو کے ساتھ ہی ایشاع سہمی بیٹھی تھی۔

''اب کون سی کسر باقی ہے، جسے پوری کرنے آئے ہو۔'' اس کی باتوں پر ماموں غصے سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔

''سب انہی کا قصور ہے، ناں یہ ایشاع پر شک کرتے نہ یہ سب ہوتا۔'' حنظلہ بھی خفگی سے بولا۔

''کیا ہوا ہے آخر، کیا کوئی مجھے بتائے گا؟''

حالات ناسازگار محسوس کر کے اس نے تصویر فولڈ کی اور جیب میں رکھ لی، جبھی اس کی نظر مما پر پڑی جو اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں، ماموں اور حنظلہ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے، تو ممانی اور ایشاع سر جھکائے بیٹھیں تھیں، ایشاع کے ہاتھ میں ایک قانونی کاغذ بھی اسے نظر آیا۔

''یہ پوچھیں، کیا نہیں ہوا؟'' حنظلہ فوں فوں کرنے لگا۔

''کوئی کچھ بتائے گا بھی۔'' اسے غصہ آنے لگا، حنظلہ نے ایشاع کے ہاتھ سے وہ قانونی کاغذ جھپٹا اور انصار کے سامنے کر دیا۔

''یہ ہوا ہے اور وہ بھی تمہاری وجہ سے۔''

انصار وہ کاغذ پکڑ کر دیکھنے لگا، وہ ڈائیورس پیپر تھا، ایشاع کے نام۔

''اوہ۔'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کس نے کہا تھا کہ تم ایشاع کو تھانے لے کر جاؤ۔'' ماموں نے اشتعال آمیز لہجے میں پوچھا۔

''کیونکہ مجھے اس پر شک تھا اور قانون کا محافظ ہونے کا یہ میرا فرض تھا۔''

''فرض تھا، تو فرض پورا نبھاتے ناں، واپس کیوں لے کر آئے اسے، وہیں پھانسی پر چڑھا دیا ہوتا۔''

''ماموں!'' اس سے آگے وہ مزید کچھ بول نہ پایا، اسے ماموں کی سوچ پر افسوس ہونے لگا، کیا کوئی باپ اپنی بیٹی کے لئے ایسا بھی کہہ سکتا ہے، غصہ انسان سے سب کہلوا دیتا ہے اسی لئے تو اسے حرام کیا گیا ہے۔

''کیسا قانون ہے تمہارا، جو گناہ گار اور بے گناہ کے درمیان فرق نہ کر پایا۔'' حنظلہ نے پوچھا۔

''یہ فرق نہیں تو اور کیا ہے، جو اس وقت ایشاع تمہارے سامنے موجود ہے۔'' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''کیا فائدہ ایسے فرق کا، تمہیں اندازہ بھی ہے، میری کتنی بدنامی ہوئی ہے، لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں، ایک بیٹی قتل ہو گئی، تو دوسری جیل ہو کر آ گئی ہے اور پھر یہ طلاق، کتنا ناز تھا مجھے ان پر۔'' انصار کا دل چاہا وہ کہے یہ سب آپ کے غرور کا ہی نتیجہ ہے، مگر مما کی التجا بھری نظروں نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

''ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو انصار ہی قصور وار لگتا ہے اور اس کی وجہ سے تم لوگوں کی بے عزتی ہوئی ہے تو اب یہی ایشاع کو عزت دے گا۔''

دادو کی بات پر سب نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

''ہاں ہاں بھائی صاحب، میں تو پہلے ہی ایشاع کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھی مگر آپ نے ہی بہت جلدی کی اور اب مجھے تقدیر نے خود یہ موقع فراہم کر دیا کہ میں ایشاع کو آپ سے ہمیشہ کے لئے مانگ لوں۔'' پھپھو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''ٹھیک ہے جو بھی کرنا ہے جلد از جلد کرو، مجھ سے بدنامی کا یہ بوجھ مزید نہیں سہا جاتا۔'' ماموں کچھ نرم پڑے۔

''مجھے ایک ہفتہ کا وقت دیں، ایشاع آپ کے لئے ایک بوجھ سہی مگر، ہم اسے محبت اور پوری عزت کے ساتھ لے کر جائیں گے۔'' انہوں نے انصار کا بازو تھاما اور بیرونی دروازے کی جانب چل پڑیں، انصار کو لگا سالوں پہلے مانگی گئی دعا آج قبولیت اختیار کر گئی تھی، اس نے بے پناہ سکون اپنے اندر اترتا محسوس کیا، مما کو گھر چھوڑنے کے بعد وہ خود تھانے پہنچا، جس مقصد کے لئے وہ گیا تھا وہ کام نہیں ہو سکا تھا اور اب اس کا ارادہ نادرا ڈیٹا بیس سے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کا تھا، کیونکہ پکے ثبوت کے بنا راجا پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔

☆☆☆

نادرا ڈیٹا بیس سے فنگر پرنٹس صحیح ہونے کے بعد انصار نے کاروائی شروع کر دی تھی، مگر مختلف جگہوں پر چھاپہ مارنے کے باوجود راجا کو کچھ پتا نہ چلا تھا کہ وہ کہاں جا چھپا تھا۔

پے در پے ہونے والے ان واقعات نے ایشاع کو بالکل خاموش کر دیا تھا، عتیق الرحمٰن تو بیٹی کی جانب دیکھتے بھی نہ تھے، مگر قدسیہ ماں تھیں ان سے ایشاع کی یہ حالت دیکھی نا جاتی تھی، اب وہ اسے کسی نہ کسی طرح بولنے پر اکسا رہی

تھیں مگر وہ ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہیں دے رہی تھی، حنظلہ دونوں ہاتھ باندھے چلا آیا، اس نے مما کو جانے کا اشارہ کیا اور ایشاع کے سامنے آ بیٹھا، قدسیہ اپنے کمرے میں چلی آئیں جہاں عتیق الرحمن دکان کا حساب کتاب چیک کر رہے تھے، ان کے ہاتھ میں پین اور کاپی تھی۔

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔'' قدسیہ نے بیڈ پر ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کس لئے؟'' انہوں نے پین سے کاپی پر کچھ لکھتے ہوئے پوچھا۔

''اگلے ماہ بیٹی کی رخصتی ہے اسے کچھ دینا لانا بھی ہے، یا یونہی خالی ہاتھ ہی رخصت کر دو گے۔''

''دینا لینا، میرا بس چلے تو ایسی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دوں جو ماں باپ کا سر جھکانے کا باعث بنتیں ہیں۔''

''کیا ہو گیا ہے آپ کو اور پھر لوگ کیا کہیں گے، بیٹی کو خالی ہاتھ ہی رخصت کر دیا۔''

''لوگوں نے تو اب بھی بہت کچھ کہا ہے، وہ بھی تو میں نے سنا اور برداشت کیا ہے، کہنے دو اور جو کہتے ہیں، ایک قاتل کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہے، میرے پاس۔''

''نہیں وہ قاتل، سنا آپ نے۔''

''ہونہہ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس، ساری دنیا کہہ رہی ہے۔''

''کہنے دو ساری دنیا کو میری ممتا نہیں مانتی، ان ہاتھوں سے پالا ہے اسے، نوالے بنا بنا کر کھلائے ہیں، وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی، نجانے آپ کی یادرانہ شفقت کہاں جا سوئی ہے۔'' اور پھر انصار نے بھی تو کہا ہے کہ اس نے ایسا صرف شک کی بنا پر کیا ہے۔

''تم جو کچھ بھی کہو، اس کی وجہ سے بہت بدنامی ہوئی ہے میری۔''

''آپ کچھ تو خیال کریں، جوان بیٹی ہے، اس کے بھی تو کچھ ارمان ہوں گے آخر۔''

''کوئی بیٹی نہیں ہے میری، ایک کے ساتھ دوسری کو بھی دفن کر آیا تھا، اب میرا صرف ایک بیٹا ہے، صرف ایک بیٹا، سنا تم نے اور ارمان...... لاؤ نکالتا ہوں میں اس کے ارمان، اسی دن کے لئے پال پوس کر بڑا کیا تھا انہیں۔'' وہ اٹھے اور تیزی سے ایشاع کے کمرے کی جانب بڑھے پھر اندر سے آتی حنظلہ کی آواز پر ٹھٹک کر رک گئے، قدسیہ بھی ان کے پیچھے تھیں۔

''باپ...... باپ کہلوانے کے لائق بھی ہیں وہ، نفرت محسوس ہوتی ہے مجھے ان سے، شدید نفرت۔''

''بھیا یہ کیسے بات کر رہے ہیں آپ، بڑے ہیں وہ ہمارے ان کے بہت حقوق ہیں ہم پر۔'' ایشاع کی آواز نے عتیق الرحمن کو سن کر دیا، اتنی سب باتوں کے باوجود ان کی بیٹی ان کی حمایت کر رہی تھی۔

''ہمارا فرض ہے بھیا، ان کی ہر بات ماننا، بچپن میں انہوں نے ہمارے بھی تو سب حقوق پورے کیے ہیں۔''

''حق کون سا حق ادا کیا ہے، انہوں نے ہمارا۔'' ایشاع کرسی پر بیٹھی تھی اور حنظلہ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

''تمہیں کھلایا پلوایا، پہننے کو اچھے کپڑے دیئے، تعلیم دلوائی، رہنے کو چھت دی، یہ سب کیا ہے۔''

''یہ تو سب والدین ہی کرتے ہیں، لیکن کوئی بات اپنی اولاد کی خوشیوں کو یوں پامال نہیں کرتا، جیسے انہوں نے کیا، پوری زندگی میں کوئی ایسا لمحہ کوئی ایک پل یاد ہے تمہیں، تو تم ہی بتا دو

مجھے، جب انہوں نے پیار سے بلایا ہو، اپنے پاس بلا کر محبت سے دو باتیں کی ہوں اور اب نور کے قتل میں بھی، وہ تمہیں قصور وار کر رہے ہیں، حالانکہ میں جانتا ہوں تم بے قصور ہو اور سارا کا سارا قصور ان کا ہے، قاتل ہیں وہ نور کے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔''

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں، یہ یہ موبائل دیکھو تم کتنے رونگ نمبرز سے دوستی تھی نور کی اور اس میں جو پکچرز ہیں اف مجھے یقین نہیں ہے، یقیناً انہی میں سے کسی نے نور کو قتل کیا ہوگا۔'' اس نے موبائل پوری قوت سے دیوار پر دے مارا، موبائل ایک زوردار آواز کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا اور پاش پاش ہو کر بکھر گیا۔

''انسانی سوچیں اور جذبات ایک سپرنگ کی مانند ہوتے ہیں، آپ انہیں جتنا دبائیں گے یہ اتنی ہی تیزی سے ابھر کر آپ کے سامنے آئیں گے اور پھر ایسی لڑکیاں جنہیں گھر میں پیار اور توجہ نہ ملے تو وہ توجہ باہر تلاش کرنے لگتیں ہیں اور آج کل کی دنیا ان کی معصومیت کو سمیٹنے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں کاش پاپا یہ سمجھتے اور نور پر بے جا سختی نہ کرتے تو آج نور ہمارے درمیان ہوتی۔'' باہر کھڑے عتیق الرحمٰن نے پیچھے کھڑی قدسیہ کی جانب دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

ان کے اپنے گھر والے ان سے اس حد تک متنفر تھے یہ بھید ان پر آج کھلا تھا، کیا واقعی یہ سب ان کی بے جا ضد اور سختی کا نتیجہ ہے، انہوں نے خود سے سوال کیا، تو ضمیر کو ملامت کرتے پایا۔

''مجھے معاف کر دو میرے بچوں، مجھے معاف کر دو۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑے کمرے میں داخل ہوئے تو ایشاع اور حنظلہ دونوں چونک پڑے۔

''پاپا۔'' ایشاع اٹھ کر ان کی جانب بڑھی اور ان کے بندھے ہاتھ پکڑ لئے۔

''شاید میں اچھا باپ نہ بن سکا، مگر میرا یقین کرو، میں نے ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے، تمہیں اچھی اور کامیاب زندگی دینا چاہی ہے، مگر شاید تقدیر کے فیصلے کچھ اور ہی تھے، مجھے معاف کر دو میرے بچوں کہ میں گنہگار رہوں تمہارا۔'' ان کی آنکھیں آنسو بھری اور بندھے ہوئے ہاتھ حنظلہ ایشاع کو شرمندہ کر گئے۔

''پلیز پاپا! ہمیں گنہگار مت کریں، والدین کی سختی میں ہی اولاد کی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ بات ہم جیسی نکمی اولاد کو بہت دیر سے سمجھ آئی ہے، معافی تو ہمیں مانگنی چاہیے، جو ہم نے آپ کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیے۔'' ایشاع نے ان کے جڑے ہاتھ کھول دیئے، عتیق الرحمٰن نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور واپس مڑ گئے۔

☆☆☆

بہت قلیل مدت کے باوجود پھپھو نے اس کی بہت خوبصورت بری تیار کی تھی، پاپا نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، اسے پوری محبت اور عزت کے ساتھ رخصت کیا گیا تھا تو سسرال میں اس کا استقبال پورے جوش و خروش اور دھوم دھام سے کیا گیا تھا، مگر سب ہی ایک دوسرے سے چھپتے اور نظریں چراتے محسوس ہو رہے تھے، گھر قریب ہونے کی وجہ سے بارات کی واپسی پر سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، گھر میں صرف سارا، پھپھو، ایشاع اور انصار رہ گئے، سارا اپنے بیٹے کو سلانے چلی گئی، پھپھو نے اسے کمرے میں پہنچایا اور اس کے ماتھے پر پیار کر کے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد سفید اور سنہری کلر کی شیروانی میں ملبوس انصار اندر داخل ہوا اور اس کے قریب صوفے پر آ بیٹھا، نروس ہوتی ایشاع مزید سکڑ گئی۔

سرخ لہنگے میں زیورات سے سجی ایشاع اس کے سامنے تھی، آنکھوں میں دم توڑتے نجانے کتنے ہی مہینوں کو آج تعبیر ملی تھی، وہ اس کی لرزتی پلکوں تو دیکھتے ہوئے اس کے خوبصورت تیکھے نقوش کو دل میں اتارنے لگا، اس کی گہری نظروں کی تپش سے گھبراتے ہوئے ایشاع نے پہلو بدلا، کلائیوں میں پہنی چوڑیاں کھنکنائیں تو وہ چونک پڑا اور اس کا ہاتھ تھام لیا، ایشاع نے تڑپ کر ہاتھ چھڑوانا چاہا مگر وہ گرفت مزید مضبوط کر گیا۔

''تم نے مہندی کیوں نہیں لگوائی۔'' وہ اس کے سفید نازک ہاتھوں کو دیکھتا ہوا بولا۔

''میرا دل نہیں چاہا۔'' اس کی آنکھوں میں شبنم بہنے لگی، اس نے ایک بار پھر ہاتھ کھینچنا چاہا۔

''مجھے حق ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''میں جانتی ہوں مگر۔'' وہ خاموش ہوئی۔

''کیا تم بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہو؟'' اس نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''میں بھلا کیا کسی کو قصور وار سمجھوں گی، میرے پاس تو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لئے نہیں۔'' وہ ٹوٹے لہجے میں بولی۔

''مجھے یقین ہے، تم بے قصور ہو، اپنی زندگی سے ان تلخ صفحوں کو پھاڑ دو ایشاع، یقین کرو، اب تمہاری زندگی میں کوئی دکھ نہیں آنے والا۔''

''زندگی کوئی ڈائری نہیں، کہ جس کے ناپسندیدہ صفحات کو پھاڑ کر پھینک دیا جائے، سب لوگوں کی، میرے اپنے رشتہ داروں کی کہی باتیں، مجھے سکون نہیں لینے دیتیں، اب تو مجھے لگنے لگا ہے، جیسے میں واقعی قاتل ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

''مجھ سے کیا چاہتی ہو اب تم۔''

''آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ پلیز، مجھے کچھ وقت دیں۔'' وہ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر بولی۔

''کتنا وقت؟''

''جب تک نور کا قاتل پکڑا جائے، اسے سزا مل جائے اور میرا اللہ مجھے معتبر کر دے۔'' وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

انصار کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھ پہلو میں گراتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا، میں نئی زندگی کی ابتداء دل ضمیر پر بوجھ لئے نہیں کر سکتی۔'' انصار نے الماری سے کپڑے نکالے، اٹیچ باتھ میں جا کر چینج کیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا، ایشاع دونوں بازوؤں میں سر دیئے رونے لگی۔

☆☆☆

اگلی صبح نماز ادا کرنے کے بعد وہ ہیئر ڈرائیر سے بال خشک کر رہی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہوا، ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اس نے انصار کا عکس ابھرتے دیکھا، سفید قمیض شلوار میں ملبوس، سر پر ٹوپی رکھے اس کے ہاتھ رک گئے۔

''یہ تمہاری منہ دکھائی، رات رہ گئی تھی۔'' اس نے ایک سنہری ڈبیہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی، سر سے ٹوپی اتار کر جیب میں رکھی اور ہیئر برش اٹھا کر بال سنوارنے لگا، وہ سر جھکائے بوجھل پلکوں اور لرزتے ہاتھوں پر کنٹرول کرتی رہی۔

''یہ اس کا کمرہ تھا اور وہ رات نجانے کہاں سویا تھا۔'' اسے شرمندگی سی ہونے لگی، مزید کچھ کہے بغیر وہ برش ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا تو اس نے گہرا سانس لیا، بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنائی، ہلکی سی میچنگ لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی اور سونے کے چند زیورات پہن کر باہر نکل آئی، کچھ ہی فاصلے پر ٹی وی لاؤنج تھا، جہاں ٹی وی اور

صوفے رکھے تھے، ایک جانب سے گول گھومتی ہوئی سیڑھیاں اوپر کی جانب جا رہی تھیں، لاؤنج سے کچھ فاصلے پر جالی کے خوبصورت سفید پردے لٹک رہے تھے جن کے پیچھے ڈائننگ ٹیبل پر اسے مما، سارا اور انصار بیٹھے نظر آئے، ٹیبل کے بائیں جانب خوبصورت امریکن سٹائل کچن تھا اور بائیں جانب دو سیڑھیاں اترنے کے بعد سٹنگ روم اور بیرونی دروازہ، ایک ہی نظر میں سب جائزہ لینے کے بعد وہ آگے بڑھی اور جالی دار پردہ ہٹایا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! ایشاع آؤ بیٹھو۔'' پھپھو نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑے اخبار میں گم ہوگئیں، اس نے ناشتے کے سامان سے سجی ٹیبل کو دیکھا اور انصار کے برابر والی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''یہ سوٹ تم پر بہت جچ رہا ہے ایشاع۔'' سارا نے اپنے بیٹے کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے کہا، وہ ہولے سے مسکرا دی۔

حلوہ پوری سے انصاف کرتے انصار کا موبائل بجنے لگا تو اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور جیب سے موبائل نکال کر بات کرنے لگا۔

''یس سر، جی سر، جی بہتر، جی ابھی حاضر ہوتا ہوں اوکے سر۔'' سلام کے بعد وہ دوسری جانب سے بات سن سن کر جواب دینے لگا، وہ تینوں اس کی جانب متوجہ تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' موبائل جیب میں رکھتا وہ کھڑا ہوا تو پھپھو نے پوچھا۔

''آئی جی صاحب کا فون تھا، مجھے جانا ہو گا۔'' اس نے مختصر بتایا۔

''مگر کہاں بیٹا، آج تو تمہاری چھٹی ہے۔''

''جی مما، ایک ضروری فائل پہنچانی ہے ابھی، کچھ دیر تک لوٹ آؤں گا۔'' اس نے کمرے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

''اف ایک تو یہ پولیس کی نوکری۔'' انہوں نے اخبار تہہ کر کے میز کے ایک جانب رکھا۔

''بچے نے ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہ کیا، تم کچھ لو ناں بیٹا۔'' ان کی نظریں خاموش ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ایشاع پر پڑیں تو وہ بولیں۔

''جی پھپھو لیتی ہوں۔'' وہ چائے کپ میں ڈالنے لگی۔

''لو جی یہاں تو پہلے ہی ناشتہ کیا جا رہا ہے، ہم نے صبح ہی صبح ناحق اتنی بھاگ دوڑ کی۔'' نازش ممانی بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئیں، ان کے ہمراہ مما، غزالہ ممانی اور ندا، ردا بھی تھیں، جن کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ٹوکریاں تھیں، وہ سب ایشاع کے لئے ناشتہ لائیں تھیں۔

''آیئے بھابھی، آپ بھی بسمہ اللہ کیجئے۔'' پھپھو نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، ایشاع اور سارا بھی کھڑی ہو کر باری باری سب سے ملنے لگیں، مما سے گلے ملتے بے اختیار ایشاع کی آنکھیں چھلک پڑیں، مگر اس نے خود پر کنٹرول رکھا، سب کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو ندا، ردا ناشتہ کے پیکٹس کھول کھول کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھنے لگیں۔

''واہ بھئی، مجرم نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔'' نازش ممانی نے ایشاع کو گھورتے ہوئے کہا، وہ دل ہی دل میں انصار کے لئے ردا کو سوچیں بیٹھیں تھیں اور آج اس جگہ پر ایشاع کو دیکھ کر ان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے تھے اور طنز کرنے سے باز نہ آئیں، ایشاع کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور مما کا سر جھک گیا۔

''بھابھی پلیز آپ میری بہو کے بارے

میں سوچ سمجھ کر بات کریں، ہمیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے، ایشاع نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' پھپھو نے اس کا دفع کیا۔

''اب پردہ داریاں کی جائیں تو الگ بات، ورنہ بھری محفل سے انصار اس کو آلہ قتل کے ہمراہ گرفتار کر لے گیا تھا۔''

''وہ سب صرف شک کی بنا پر کیا گیا تھا اور جب ایشاع بے قصور ثابت ہو گئی تو وہ اسے گھر لے آیا۔''

''بے قصور ثابت ہو گئی، یا راتوں رات نجانے کیا اسم پھونکا اس نے تمہارے بیٹے پر، کہ اس نے ایک ہی ماہ میں اسے یہاں لا بیٹھایا۔''

ان کی باتوں پر ایشاع کا چہرہ رنگ برنگ بدلنے لگا اور مما شرمندگی سے کبھی پھپھو کو دیکھتیں تو کبھی ممانی کو۔

''بھابھی...... پلیز۔'' پھپھو نے اس بار سختی سے ٹوکا۔

''کیا بات ہے، جیجا جی کہاں کی تیاریاں ہیں۔'' نک سک سے تیار ہاتھ میں فائل پکڑے کمرے سے نکلتے انصار کو دیکھ کر ندا چہکی، انصار کو دیکھ کر ممانی کا موڈ اور طنزیہ انداز یکسر بدل گیا، چہرے پر مسکراہٹ سج گئی۔

''ایک ضروری کام سے جانا ہے گڑیا۔'' سب کو سلام کرنے کے بعد اس نے غزالہ ممانی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ندا کو جواب دیا۔

''لیجئے ہم نے آپ کے لئے اتنا اہتمام کیا اور آپ جا رہے ہیں۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''کچھ دیر تک آ جاؤں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں، آپ کو ہمارے ساتھ ناشتہ کر کے جانا ہوگا۔'' وہ باضد ہوئی۔

''ہاں بیٹا، کچھ تو لو ناں۔'' غزالہ ممانی نے بھی اصرار کیا تو وہ مسکراتا ہوا ایک خالی کرسی دیکھ کر بیٹھ گیا، ہاتھ میں رکھی فائل ایک جانب رکھ کر اس نے ایک سینڈوچ اٹھا لیا۔

''اٹس مائی فیورٹ، وری ٹیسٹی۔'' پہلا نوالہ لینے پر ہی وہ تعریفی انداز میں بولا۔

''کس نے بنائے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بیکری والوں نے۔'' ندا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''واقعی تم دونوں سے اس کی امید نہیں کی جا سکتی۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''جی بالکل، مگر ایشاع آپ کو اس سے بھی زیادہ ٹیسٹی سینڈوچ بنا کر کھلا سکتی ہے۔''

''رئیلی۔'' ندا کی بات پر اس نے مما کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ایشاع کو دیکھا، وہ پزل سی مسکرا دی۔

اسی طرح ہلکی پھلکی ہنسی مذاق کے دوران سب ناشتہ کرنے لگے، انصار کا موبائل ایک بار پھر بجنے لگا۔

''یس سر!'' اس نے کال ریسیو کی اور اٹھ کر کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

''جی سر! بس ابھی کچھ ہی دیر میں پہنچتا ہوں۔'' باتیں کرتا وہ باہر کی جانب بڑھا۔

''ان کی فائل۔'' ایشاع بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جاؤ بیٹا دے آؤ۔'' پھپھو نے کہا تو وہ جلدی سے فائل اٹھا کر باہر لپکی مگر وہ گاڑی دوڑا لے گیا، وہ مایوسی سے فائل لئے پلٹی اور ایک انجان شخص کو پستول لہراتے سیڑھیوں سے اترتے دیکھ کر چیخی، اگلے ہی لمحے وہ باخوبی اس انجان شخص کو پہچان گئی، وہ راجا تھا، پستول والا ہاتھ بلند کیے ہنستا ہوا وہ سیڑھیوں سے نیچے چلا آیا تھا، اس کے ہاتھ سے فائل چھوٹ کر گر گئی۔

''کیا ہوا ایشاع، کیا بات ہے؟'' مما اور

پھپھو جو تیزی سے اٹھ کر اس کی جانب آ رہی تھیں ندا کی چیخ پر پلٹیں، ندا نے بھی راجا کو دیکھ لیا تھا، دونوں ممانیاں اور ندا ردا اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''کون ہو تم اور ایسے کیسے میرے گھر میں گھسے چلے آ رہے ہو۔'' راجا کھوجتی نظروں سے سب کو گھورتا آگے بڑھ آیا۔

''اے میں پوچھتی ہوں ہو کون تم اور کہاں چلے آ رہے ہو۔'' راجا کی نظریں ایشاع پر جا ٹھہریں اور وہ اس کی جانب آیا، پھپھو نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ پھپھو کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے ایشاع کی جانب بڑھا، اسے بالوں سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے سیٹنگ روم کے صوفے پر جا پٹخا۔

''بہت شوق ہے تمہیں میری شناخت کروانے کا، میرے خلاف گواہی دینے کا۔''

''قاتل ہو تم میری بہن کو مارا ہے تم نے۔'' وہ ہمت کر کے چلائی۔

''ہاں مارا ہے، میں نے اسے اور اب تمہاری موت بھی میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔'' اس نے پستول ہوا میں لہرائی۔

''کیوں مارا تھا تم نے نور کو؟'' نازش ممانی نے پوچھا، وہ آج اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتی تھیں۔

راجا تیزی سے پلٹا اور اس نے فائر کیا، گولی ردا کے سر پر سے گزرتی ہوئی دیوار میں جا گڑی، ندا، ردا چیختیں ہوئیں ممانی سے جا لپٹیں، خوف کی ایک شدید لہر نے سبھی کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

''آج تک راجا سے کسی کو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی، راجا کو کسی کی جان لینے کے لئے کبھی کسی وجہ کی ضرورت نہیں پڑی، یہ گولی اس لڑکی کے سر میں سوراخ بھی کر سکتی تھی۔'' اپنی بات کہہ کر راجا ہنسا اور پھر واپس ایشاع کی جانب مڑا، جو آنکھیں پھیلائے ممانی کی جانب دیکھ رہی تھی، جن کے چہرے پر راجا کی دہشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

''تم لوگوں کے لئے بھی یہی بہتر ہے کہ کیس واپس لے لو اور اس کے بدلے جتنی رقم چاہو گے میں دوں گا۔'' اس نے پستول سے ایشاع اور مما کی جانب اشارہ کیا۔

''یعنی اپنی مری ہوئی بہن کا سودا کر لیں۔'' ایشاع نے نفرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں، نہیں تو اپنی بہن کے پاس جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے پستول ایشاع پر تانی۔

''صرف میری گواہی ہی نہیں بلکہ پولیس کے پاس تمہارے فنگر پرنٹس کی رپورٹ بھی ہے۔'' وہ بے خوبی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''کسی بھی رپورٹ کو خریدنا راجا کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔'' اس نے بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

کب سے ساکت کھڑیں پھپھو اور مما کے وجود میں حرکت ہوئی اور وہ دونوں راجا پر جھپٹیں، مگر ایک ہی جھٹکے میں راجا نے انہیں زمین بوس کر دیا، وہ تڑپ کر اٹھی اور مما، پھپھو کی جانب بڑھنا چاہا مگر راجا نے پستول اس کی پیشانی سے لگا دی۔

''تمہارے پاس اب بھی وقت ہے سوچ لو۔''

''تم چاہے تو مجھے گولی مار دو، مگر میں اپنی بہن کے قاتل کو کسی صورت معاف نہیں کروں گی۔''

''ٹھیک ہے پھر مرنے کے لئے تیار ہو

جاؤ۔'' اس نے پستول کی نوک سے اس کی پیشانی پر دباؤ ڈالا۔
ایشاع نے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں اپنے رب کو پکارنے لگی۔
''اے اللہ! مجھے معتبر کر دے۔'' اس کے لب ایک ہی فقرہ بار بار دہرانے لگے۔
اور اس سے پہلے کہ راجا گولی چلاتا اس کے ہاتھ کو دو آہنی مردانہ ہاتھوں نے جکڑ لیا، راجا نے گردن گھما کر انصار کو دیکھا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے، کچھ دیر بعد بالآخر وہ راجا سے پستول چھیننے میں کامیاب ہو گیا اور سب کے رو کے ہوئے سانس بحال ہوئے۔
''سب ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے راجا کو کالر سے پکڑ کر باہر کی جانب دھکیلتے ہوئے پوچھا اور جھک کر راستے میں پڑی فائل اٹھائی، ایشاع نے جھک کر زمین پر بیٹھی مما اور پھپھو کو سہارا دے کر اٹھایا، پھر ممانی کی جانب دیکھ کر کچھ کہنا چاہا، ممانی شرم سے نظریں چراتے ہوئے پانی پانی تھیں، جو خود ہی نظریں ملاتے ہوئے شرمندہ ہوا سے مزید شرمندہ کیا کرنا، وہ خاموش رہی، ممانی جان کہتی تھیں کہ ایشاع واقعی بے قصور تھی اور نور کا قاتل راجا تھا، راجا جیسے لوگوں کے لئے انسانی جان لینا عام سی بات تھی۔

☆☆☆

راجا کو لاک اپ میں ڈالنے کے بعد انصار نے پہلے فائل آئی جی صاحب کو بھجوائی، پھر کاغذی کاروائی مکمل کی، بارہ بجے کے قریب وہ لاک اپ میں راجا کے قریب سامنے کھڑا نور کو قتل کرنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔
''وہ علاقہ میرا ہے، بڑی دہشت ہے راجا کی وہاں، راجا کسی کو جان سے مارنے کے لئے وجہ کی......'' باقی کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی انصار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھمایا اور پیچھے کی جانب موڑ دیا، راجا بری طرح چیخا، ایسا ہی اس نے اس کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی کیا۔
''جو پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔'' انصار نے اس کے موڑے ہوئے ہاتھوں پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔
راجا کے چہرے پر تکلیف کے واضح آثار تھے، اس نے سر اثبات میں ہلایا، تو انصار نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔
''ہاں اب بولو، کیوں مارا تھا نور کو؟''
''یہ تم اچھا نہیں کر رہے، مجھے زیادہ دیر یہاں نہیں روک سکو گے تم اور یہ سب بہت مہنگا پڑے گا تمہیں۔'' ہاتھ چھٹتے ہی وہ دھمکی دینے لگا تھا۔
انصار نے اپنی بیلٹ کھولی، ایک مار دو تین تیسری ضرب پر ہی راجا نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا۔
''سمجھ نہیں آئی، کیا کہا ہے میں نے۔''
''بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔'' راجا نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے مزید بیلٹ گھمانے سے روکا، دو سپاہیوں نے مل کر اسے اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔
''استعمال کیا تھا اس سالی نے مجھے، اپنے مقصد کے لئے۔''
''کیا مطلب، کیسا استعمال، کیا تعلق تھا تمہارا اس سے۔''
''محبت کی تھی، میں نے اس سے محبت، مگر وہ سالی دھوکے باز۔'' اس نے سر جھٹکا۔
''جھوٹ بولنے اور بات گھمانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انصار نے اسٹک اس کے بازو پر ماری۔
''میں جھوٹ نہیں بول رہا، وہ واقعی ایک دغا

باز لڑکی تھی، میری نیت اسے مارنے کی ہرگز نہ تھی، مگر اچھا ہوا مر گئی، زندہ ہوتی تو کسی اور کی زندگی خراب کر رہی ہوتی۔"

"نور جیسی پاکیزہ اور معصوم لڑکی کے بارے میں تمہیں ایسا بولتے ذرا شرم نہیں آ رہی، کمینے انسان۔"

"تمہاری طرح میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"مگر بعد میں اندازہ ہوا کتنا غلط تھا میں، مجھے سمجھنا چاہیے، معصوم لڑکیاں انجان لڑکوں سے چھپ چھپ کر فون پر بات نہیں کرتیں، پاکیزہ لڑکیاں گھر کے دروازوں میں کھڑے ہو کر اپنی اداؤں سے دوسروں کو نہیں لبھاتیں، دوسری بہن بھی تو ہے اس کی، تمہیں تو باخوبی علم ہوگا، تم نے بھی تو ہیرا ہی چنا اپنے لئے، حالانکہ طلاق یافتہ ہے پھر بھی، بھئی چاند پر لگا داغ کون دیکھتا ہے، سب ہی اس کی روشنی میں نہاتے ہیں۔"

"شٹ اپ، جسٹ شٹ اپ۔" انصار کا دائیاں ہاتھ اس کے بائیں رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔

"اپنے جواب کے دائرے کی حدود تک رہ اور ذرا تفصیل سے بتاؤ۔"

"تفصیل سے ہوں۔" اس نے کچھ لمحے ٹھہر کر گہرے سانس لئے پھر بولا۔

"آج سے کچھ دن پہلے رات گیارہ بجے گلی نمبر سات میں، میں روز کی طرح اپنے دوستوں کے ہمراہ بیٹھا تھا، جنوری کا آغاز ہوتے ہی سردی کا زور ٹوٹنے لگا تھا، مگر راتیں ابھی بھی سرد تھیں، چاند اپنی پوری آب و تاب سے جگمگاتا ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا، سرد ہوا جسم سے ٹکرا کر کپکپی طاری کر دیتی، گپ شپ کے بعد میرے دوست اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے، میں بھی جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ عتیق الرحمن کے گھر کا دروازہ کھلا، میں نے چونک کر اس جانب دیکھا، کہ یہ دروازہ تو ہمیشہ بند ہی رہتا تھا، کیونکہ وہ لوگ آمد و رفت کے لئے مین گیٹ استعمال کرتے تھے، جو روڈ پر کھلتا تھا، آدھ کھلے دراوزے سے ایک ماہ جبین نے جھانکا، جس کا چہرہ سیاہ نقاب میں ڈھکا تھا، صرف دودھیا ہاتھ اور براؤن آنکھیں نظر آ رہی تھیں، مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے ایک سفید کاغذ میری جانب اچھالا اور دروازہ بند کر لیا، میں نے گھبرا کر سنسان گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا، تیزی سے آگے بڑھا اور جھک کر وہ پرچی اٹھا لی، کھول کر دیکھا تو اس پر ایک کال نمبر اور پلیز کال می لکھا تھا، خوشی کی ایک انجانی لہر نے مجھے آ گھیرا، بھورے بال، بھوری بڑی بڑی آنکھیں اور لمبے چوڑے وجود کے ساتھ باہر سے سخت نظر آنے والا راجا کے اندر بھی ایک سخت انسان چھپا تھا، جو ایک محبت کرنے والی خوبصورت بیوی اور ننھے بچوں کا خواہش مند تھا، اس رات اس کاغذ کے ٹکڑے کو مٹھی میں دبائے دبائے گھر کی سمت جاتے ہوئے میں نے ان گنت خواب بن ڈالے، کمرے میں آ کر لیٹا تو تنہا کمرہ مجھے کاٹنے لگا، شاید یہ ان خوابوں کا اثر تھا جو کچھ ہی دیر پہلے میری آنکھوں میں بنا دستک دیئے چلے آئے تھے، میز پر رکھا ٹی وی، فریج، صوفے سب میری تنہائی پر قہقہے لگانے لگے اور ان سب قہقہوں سے گھبرا کر میں نے مٹھی میں دبے اس کاغذ کو کھول کر دیکھا اور اس پر لکھے نمبر پر کال ملا دی عینی، ہاں عینی ہی نام بتایا تھا اس نے۔" ہوا میں دیکھتے ہوئے راجا نے ایک نظر انصار پر ڈالی اور پھر سے ہوا میں کچھ تلاشنے لگا، اس کی آواز کی لہروں اور چہرے کے بدلتے رنگوں کی سچائی کو انصار باخوبی جانچ رہا تھا۔

''اس روز عینی سے بات کر کے میرے دل کی کلی کھل گئی اور مجھ پر بے تحاشا قہقہے لگاتی چیزیں بھی خود بخود خاموش ہو گئیں، اب دن رات عینی سے باتیں کرتے گزرنے لگے، مجھے وہ بہت ہی معصوم لڑکی لگی تھی، پھر ایک دن اس نے روتے ہوئے بتایا کہ۔''

''راجا...... راجا آج میں بے حد پریشان ہوں۔'' عینی کی بھرائی ہوئی آواز سپیکر میں ابھری تو میں پریشان ہو اٹھا۔

''کیا ہوا میری جان، کیا بات ہے؟''

''وہ...... وہ راجا، ایک لڑکا مجھے بلیک میل کر رہا ہے؟''

''کیا مطلب؟ کیسے؟'' مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ تعجب بھی ہوا۔

''میرے علاقے میں ایسا ہوا اور وہ بھی میری عینی کے ساتھ اور مجھے خبر نہیں۔''

''وہ اس لڑکے کے پاس میری تصویریں ہیں، وہ کہہ رہا ہے یا تو میں اس سے ملوں یا پھر دس ہزار اسے بھجوا دوں، تب ہی وہ میری تصویریں مجھے لوٹائے گا۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''کون ہے وہ؟ جس نے ہماری عینی کو تنگ کرنے کی جرأت کی ہے۔''

''پتا نہیں، میں اس کو زیادہ نہیں جانتی۔'' وہ کافی پریشان تھی اور بات بھی پریشانی کی ہی تھی۔

''پھر تمہاری تصویریں اس کے پاس کیسے پہنچیں؟''

''میری دوست نے موبائل سیل لیا تو وہ تصویریں اور نمبرز وغیرہ ڈلیٹ کرنا بھول گئی، مجھے پورا یقین ہے، اس نے وہیں سے میری تصویر اور نمبر حاصل کیا ہے، ایک تصویر کی بیس تصویریں بنا ڈالیں۔''

''یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔'' میں نے اس کی بات پر فوراً یقین کر لیا، محبت واقعی اندھی ہوتی ہے۔

''ہاں میں پریشان ہوں، بہت پریشان۔'' وہ رو دی۔

''پلیز...... پلیز تم روؤ مت، میں کچھ کرتا ہوں۔'' اس کے آنسوؤں نے میری جان ہی تو نکال دی تھی، ویسے بھی یہ کام میرے لئے مشکل نہ تھا، عینی کے بتائے گئے نمبر کی وجہ سے میں جلد ہی اس علی نامی لڑکے کو ڈھونڈ نکالا تھا اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ عینی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا، وہ تصویر علی نے کسی موبائل سے حاصل نہیں کی تھی، بلکہ خود عینی نے اسے بھیجی تھی، علی، حارث اور زاہد کا کام ہی یہی تھا، موبائل اور فیس بک پر لڑکیوں سے دوستی کرنا، وہ محبت اور دوستی کے بہانوں سے لڑکیوں کی تصویریں حاصل کرتے تھے، پھر ان کو بلیک میل کر کے رقم حاصل کرتے، انہوں نے فیک تصویروں اور ویڈیوز کی ویب سائیڈ بھی بنائی ہوئی تھی، جہاں وہ یہ تصویریں اور ویڈیوز اپ لوڈ کرتے اور دوسرے اپنے جیسے لوگوں کو سیل کرتے، اس طرح انہیں خاصی آمدنی حاصل ہوتی، مگر اس وقت میں سب بھول گیا، بھول گیا کہ عینی نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا، یاد رہا تو صرف اتنا کہ یہ شخص میری عینی کو پریشان کر رہا ہے، یاد رہے تو صرف وہ آنسو، جو اس شخص کی وجہ سے، میری عینی کی آنکھوں سے بہے تھے اور میں نے علی کے دوستوں کے سامنے ہی اس کو مار ڈالا۔''

''کیا تم نے علی کو مار ڈالا؟''

''ہاں ایک ہفتہ پہلے جس علی کی بوری بند لاش تم نے کنڈے نالے سے برآمد کی تھی، یہ وہی علی تھا، جسے میں نے مار ڈالا تھا۔''

''خبیث آدمی اتنی سی بات پر تم نے ایک نوجوان کی جان لے لی۔''
''یہ ذرا سی بات ہے انسپکٹر، وہ صرف عینی ہی نہیں بلکہ اور نجانے کتنی لڑکیوں کو......'' وہ رو کا اور پھر بولا۔
''اور تم کہتے ہو ذرا سی بات، میں گلی کا غنڈا سہی، مگر ماں، بہن کی عزت کرنا جانتا ہوں اور عینی بھی اگر مجھے خود سے نہ بلاتی، تو میں کبھی اس کے راستے میں نہ آتا اور انسپکٹر سچ تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف تمہیں کاروائی کرنی چاہیے، یہ لوگ نہ صرف اپنے مسلمان ہونے کا مذاق اڑاتے ہیں، بلکہ معاشرے میں بگاڑ اور شر پھیلانے کا باعث بھی بنتے ہیں، مگر تف ہے تم لوگوں پر کہ تمہارا یہ کام بھی ہمیں کرنا پڑتا ہے، علی کو کیا مارا، اس کے دوستوں کو خود ہی نصیحت ہو گئی۔''
''قانون اپنے ہاتھوں میں لینے کی بجائے تمہیں چاہیے تھا کہ تم تھانے اطلاع کرتے۔''
''اگر تمہاری پولیس کو خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے تو معاشرے میں پھیلی آدھے سے زیادہ برائیاں خود ہی ختم ہو جائیں۔''
''تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئے، میں نے پوچھا تھا کہ تم نے نور کو کیوں مارا؟''
''بتا تو رہا ہوں سب آہستہ آہستہ، علی کے دوستوں سے عینی کی وہ تصویروں والی سی ڈی حاصل کر کے عینی کو کیا دی، وہ تو ایک دم بدل گئی، مجھ سے منہ موڑ گئی، نہ میری کال اٹھاتی، نہ ایس ایم ایس کا ہی جواب دیتی، مجھے ٹینشن ہوئی کہ کہیں بیمار نہ ہو اور پھر جب میں نے پتا کروایا تو معلوم ہوا، عینی عینی نہیں بلکہ نور ہے، عتیق الرحمن کی چھوٹی بیٹی اور ایک دن پہلے اس کا نکاح ہوا ہے پھر ایک کے بعد ایک پردہ میری نگاہوں سے ہٹتا چلا گیا اور اس دن مجھے سمجھ آ گئی کہ اس نے تو مجھے بیوقوف بنایا تھا، مجھے استعمال کیا تھا، وہ معصوم نہیں بلکہ بہت ہی چالاک نکلی، اس دن میں بیٹھا صبح سے شام تک کال ہی ملاتا رہا، بس کی طرح وہ ایک پر کال پک کر لے اور پھر رات گیارہ بجے اس نے کال ریسو کی اور روتے ہوئے بتانے لگی کہ اس کے والد نے اس کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کر دیا ہے، اب میں اسے معاف کر دوں اور ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں، میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ سب چھوڑ کر میرے پاس آ جائے مگر وہ نہ مانی، مانتی تو تب ناں جب اسے میری پروا ہوتی، مجھ سے محبت ہوتی، میں اس کی تمام چالاکیاں اور ڈرامے سمجھنے کے باوجود اس کی محبت کو اپنے دل سے نہ نکال سکا اور مسلسل اس کی منتیں کرتا رہا مگر وہ نہ مانی، میں نے کہا، ٹھیک ہے وہ مجھ سے مل لے، صرف ایک بار، آخری بار، پہلے وہ مسلسل انکار کرتی رہی پھر چار دن کی منتوں کے بعد اس نے مجھے کہا، پھپھو کے گھر بسم اللہ کی تقریب والے دن آنے کو کہا، پھپھو کے گھر کے کچن کی کھڑکی باہر گلی میں کھلتی ہے وہاں آ جانا، میں اس دن تقریب شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں جا کھڑا ہو گیا، اس دوران ایس ایم ایس کے ذریعے میرا اس سے مسلسل رابطہ رہا اور پھر اس نے آ کر کھڑکی کھول دی، میرا ارادہ تھا کہ مل کر اسے کہیں اپنے ساتھ چلنے کے لئے راضی کر لوں گا، اگر نہ مانی تو کسی بھی طرح زبردستی سے اپنے ساتھ لے آؤں گا اور میری توقع کے عین مطابق وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی اور میرے زبردستی کرنے پر اس نے کچن میں رکھی چھری نکال لی اور مجھے وہاں سے دفعہ ہو جانے کا کہا، شدید تذلیل اور توہین کے احساس نے مجھے متوحش کر ڈالا اور پھر

غصے سے کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ میں نے وہی چھری کھینچ کر اسی کو گھونپ دی، اسی لمحے اس کی بڑی بہن وہاں آگئی،۔ وہ مجھ پر جھپٹی مگر میں اس کو دھکا دے کر بھاگ نکلا، میں نور کو نہیں مارنا چاہتا تھا، کبھی نہیں مارنا چاہتا تھا، بھلا جس سے ہم محبت کرتے ہیں کیا اس کو بھی مارتے ہیں، مگر وہ سالی اوپر سے عمر کی اتنی لکھوا کر آئی تھی۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"علی کا قتل، نور کا قتل، ایشاع پر قاتلانہ حملہ، اب تمہیں پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" انصار نے انگلی سے راجا کی جانب اشارہ کیا اور پھر سپاہی تو اس کا بیان لے کر سائن کروانے کے بعد آفس میں لانے کو کہا، خود وہ آفس میں آیا کرسی پر گر کر اس نے بیک سے سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں، اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار ایشاع کا چہرہ گھومنے لگا۔

"بچپن سے لے کر اب تک کی تمام زندگی میرے سامنے تھی، پھر بھی، میں نے اتنی آسانی سے اس پر شک کیا، اس کے ساتھ اتنی سختی سے پیش آیا جیسے وہ واقعی مجرم ہو، ناحق تکلیف پہنچائی اسے، اس شک کی وجہ سے کتنی بدنامی اٹھانی پڑی اسے، کتنی باتیں سننا پڑیں۔" اسے شدید ملال نے آگھیرا۔

کچھ دیر بعد کرم داد اندر داخل ہوا اس نے جھک کر ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر اس کے سامنے رکھ دی۔

"حارث اور زاہد کو لے آؤ۔" اس نے راجا کے بیان پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا۔

"لیس سر!" کرم داد سلوٹ کرتا ہوا پلٹ گیا اور وہ دوبارہ فائل پر جھک گیا، شام پانچ بجے کرم داد نے آفس میں داخل ہو کر سلوٹ کیا۔

"سر زاہد اور حارث آگئے ہیں۔"

"ہاں بھیجو انہیں اور راجا کو بھی لے کر آؤ۔"

"لیس سر!" کرم داد واپس چلا گیا۔

زاہد اور حارث نے اندر داخل ہو کر سلام کیا، انصار نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک ہی نظر میں ان کا بھرپور جائزہ لیا، وہ دونوں چوبیس پچیس سال کے نوجوان تھے، دونوں کے بال بڑے تھے، سفید اور نیلی ٹی شرٹ کے ساتھ کالی اور نیلی جینز زیب تن کیے، ہاتھوں میں فرینڈ شپ ربن، گلے میں چین اور کان میں بالی ڈالے وہ دونوں ہی گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے تھے، راجا آیا تو دونوں نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا، انصار نے ان کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دیکھی۔

"اس کو جانتے ہو؟" اس نے ان دونوں سے پوچھا، انہوں نے سر اثبات میں ہلائے۔

"اس نے تم دونوں کے سامنے علی کو قتل کیا تھا؟" انصار کے اس سوال پر انہوں نے خوفزدہ نظروں سے راجا کو دیکھا، پھر ایک دوسرے کو اور سر جھکا لیا۔

"دیکھو تم دونوں کو اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اب یہ ہماری حراست میں ہے اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" انصار اٹھ کر ان کے قریب آیا، دونوں ہی سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

"تمہیں راجا کے خلاف گواہی دینا ہوگی۔"

"ہمیں معاف کر دیں سر، یہ پولیس عدالت کے چکر ہم نہیں کاٹ سکتے۔" حارث نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"بہت شرم کی بات ہے، تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے دوست کا قتل ہو گیا اور تم اس کے قاتل کو انجام تک بھی نہیں پہنچانا چاہتے۔"

دونوں اب بھی خاموش رہے۔

''راجا کا کہنا ہے تم لوگوں نے فیک تصویروں اور ویڈیوز کی ویب سائٹ بنا رکھی ہے، سیل کرتے ہو تم لوگ یہ سب فضولیات۔''

''وہ تو...... وہ تو کب کی ڈیلیٹ کر دی سر جی۔'' زاہد نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''پکی بات ہے۔'' انصار نے چھڑی گھماتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... جی سر جی، بے شک جو مرضی چاہئیں قسم لے لیں۔'' حارث تیزی سے بولا تو راجا ہنسنے لگا۔

''علی کا حال دیکھنے کے بعد ان میں اتنا دم کہاں، میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا، کہ یہ اب سدھر گئے ہیں، آپ نے ناحق......''

''خاموش۔'' انصار نے گرجتے ہوئے اسٹک راجا کی جانب کر کے میز پر ماری، جہاں راجا ایک دم خاموش ہوا، وہ دونوں کانپنے لگے۔

''اسے لے جاؤ۔'' انصار کے بولتے ہی سپاہی راجا کو واپس لاک اپ کی جانب لے گئے۔

''یوسف خان۔'' انصار نے دوسرے سپاہی کو آواز دی۔

''یس سر!'' سپاہی فوراً حاضر ہوا، اس نے کچھ نمبر لکھ کر کاغذ اسے تھمایا۔

''ان کا ڈیٹا نکلواؤ۔''

''یس سر!'' سپاہی واپس چلا گیا، انصار پھر ان کی جانب متوجہ ہوا۔

''ہاں بھئی، اب تم لوگ بولو۔'' دونوں سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

''تمہیں پتا ہے اس جرم کی کیا سزا ہے، چاہوں تو تمہیں ابھی لاک اپ کی سیر کرتے نظر آؤ۔'' انہوں نے چھڑی ان دونوں کے چہروں کے قریب کی۔

''نہیں سر! پلیز ایسا نہ کرنا، ہم نے تو اب اپنی پڑھائی بھی دوبارہ شروع کر دی ہے، اس طرح تو ہمارا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا، ویسے بھی اب تو ہم نے وہ سب چھوڑ دیا ہے توبہ کر لی ہے، خدا کے لئے آپ بھی ہمیں معاف کر دیں۔''

''ہوں ٹھیک ہے، مگر تمہیں راجا کے خلاف گواہی دینا ہو گی، عدالت میں سب کچھ بتانا ہو گا، بولو منظور ہے۔''

''جی سر! جی ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔'' زاہد جلدی سے بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے ایسا پہلی بار ہوا ہے، اس لئے میں تم لوگوں کو معاف کرتا ہوں، لیکن یاد رکھو، آئندہ مجھے تم لوگوں کے خلاف کوئی رپورٹ ملی تو تم دونوں کا وہ حشر کروں گا کہ علی کی موت بھول جاؤ گے۔''

''نہیں سر! اب آپ کو ہمارے متعلق کوئی بھی شکایت نہیں ملے گی۔'' انصار کی جانب سے دی گئی اتنی سی دھمکی ان کے لئے کافی تھی۔

''نوجوان قوم کے معمار ہوتے ہیں، وطن کی شان ہوتے ہیں، نجانے کیوں تم جیسے نوجوان، اپنی اصلیت کو پہچاننے کے بجائے، گمراہی کے راستوں کے مسافر بن جاتے ہو، مگر اب چونکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو اپنی غلطی کا ازلہ کرنا، اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کرنا اور کچھ بن کر دکھانا، تاکہ یہ وطن یہ قوم تم پر فخر کر سکے۔'' قریب آ کر اس نے دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''یس سر!'' دونوں یک زبان بولے، انصار کی باتوں نے جیسے ان میں نئی روح پھونک

دی تھی۔

''او کے یو مے گو ناؤ۔'' انصار نے اپنی کرسی کی جانب جاتے ہوئے کہا، تو دونوں نے اسے سلوٹ کیا اور پلٹ کر باہر نکل گئے، انصار پھر سے فائل پر جھک گیا۔

رات نو بجے تک اس نے اپنا کام مکمل کرلیا اور راجا کے خلاف اس کے تمام اگلے پچھلے کارناموں کی اتنی مضبوط فائل تیار کی کہ اب کوئی بھی اسے اس کے انجام تک پہنچنے سے نہیں بچا سکتا تھا۔

میز پر رکھا اس کا موبائل بجنے لگا، اس نے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا اور سلام کیا۔

''دولہا بھائی کہاں ہیں آپ؟'' دوسری جانب حنظلہ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھنے لگا۔

''تھانے میں ہی ہوں، کیوں کیا ہوا، خیریت؟'' اس نے کھڑے ہو کر میز پر رکھی چیزیں سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

''الحمدللہ، سب خیریت ہے، مگر آپ کو یاد دلوا دوں کہ آج آپ کے ولیمے کی تقریب ہے سب مہمان باری باری پہنچ رہے ہیں اور دولہا جناب غائب ہیں، کام میں کہیں آپ اتنی اہم تقریب بھول تو نہیں گئے۔''

''ارے نہیں یار، ایسا قطعاً نہیں مجھے یاد ہے، میں بس نکل ہی رہا تھا۔'' اس نے فائل اٹھا کر میز کے نچلے دراز میں ڈالی اور لاک لگا دیا، چابی جیب میں ڈالتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔

''جی بھیا، بس اب جلدی آ جایئے۔''

سپاہی نے کچھ کاغذ اس کی جانب بڑھائے، حنظلہ کی بات سنتے ہوئے اس نے کاغذ کو تھام کر اثبات میں سر ہلایا، سپاہی سلوٹ کرتا ایک جانب ہو گیا۔

''ہاں میں بس پہنچ رہا ہوں۔''

''او کے بھیا۔''

''او کے۔'' اس نے کال کٹ کر کے موبائل پینٹ کی جیب میں رکھا اور کاغذات کو کھول کر پڑھتا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

☆☆☆

جس وقت وہ تیار ہو کر ہوٹل پہنچا تقریباً سب مہمان ہی آ چکے تھے، وہ بلیک تھری پیس سوٹ میں باوقار چال چلتا ہوا اس جانب بڑھا جہاں ایشاع پنک اینڈ پرل لہنگے میں سجی سنوری کرنوں کے جھرمٹ میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''ہر تقریب میں پارلر سے تیار ہو کر دلہن لیٹ پہنچتی ہے، مگر یہ پہلی تقریب ہے جس کا دولہا لیٹ پہنچا ہے۔''

''لگتا ہے انصار نے دلہن سے بھی زیادہ تیاریاں کی ہیں، تبھی اتنا چمک رہا ہے۔'' سب اسے چھیڑنے لگے، کل کی نسبت آج سب کے چہرے کھلے کھلے تھے اور سب مسکرا رہے تھے۔

رات کو کل کی طرح آج بھی پھپھو اسے روم میں پہنچا گئیں تھیں، ان کے جانے کے بعد اس نے سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں کہیں بھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا، سوائے بیڈ کے جہاں سرخ و سفید گلاب کے پھول بچھائے گئے تھے جن کی خوشبو چار سو بکھری ہوئی تھی، یہ پھول کل بھی بچھے تھے مگر کل وہ ذہنی طور پر اتنی ابتر تھی کہ محسوس ہی نہ کر پائی تھی، کمرے میں خوبصورت فرنیچر ترتیب سے سجا تھا، باری باری ہر چیز کو دیکھتے ہوئے اس کی نظریں ڈریسنگ ٹیبل پر جا ٹھہریں، جہاں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

"سب کہہ رہے تھے کہ آج وہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے بیڈ پر رکھے گاؤن سے ٹیک لگا کر آنکھ موند لیں۔

"چہرے کی خوبصورتی سے زیادہ اہم انسان کی شخصیت اور کردار کی خوبصورتی ہوتی ہے، راجا تنہائی میں بھی آ کر اس کو قتل کر کے جا سکتا تھا، مگر یہ خدا کا فیصلہ تھا کہ وہ سب کے سامنے آیا اور اس پر لگا داغ دھل گیا، خدا نے اسے سب کی نظروں میں معتبر ٹھہرایا تھا۔" اس نے کھل کر سانس لیا، آج اس کے وجود سے سب تھکن اتر گئی تھی، آج وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، شکرانہ خدا ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر دلکش تبسم بکھر گیا۔

انصار اس کے قریب آ کر کھنکھارا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی، اپنی سوچوں میں اتنی مگن تھی کہ اسے انصار کے کمرے میں داخل ہونے کا احساس تک نہ ہوا، وہ خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پھر ایک کاغذ اس کی جانب بڑھایا، ایشاع نے حیرانی سے پہلے اسے پھر اس کاغذ کی جانب دیکھا، اپنا عنابی ہاتھ بڑھا کر کاغذ تھاما اور بوجھل پلکیں اٹھائے اسے پڑھنے لگی، یہ نور کے نمبر کا تمام ریکارڈ ڈیٹا تھا، اس کے نمبر پر آنے والی ہر کال ایسا ایم ایس اور ایم ایس ایم کی تفصیل درج تھی۔

"یہ...... یہ آپ کو کیسے؟"

"ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ سب معلوم ہونے کے باوجود تم نے مجھ سے چھپایا۔" وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتا ہوا بولا۔

پانی اس کی آنکھوں سے نکلا اور رخساروں پر پھسلتا چلا گیا۔

"ارے ارے۔" وہ گھبرا اٹھا۔

"کیسے بتاتی، پرسوں ہی تو حنظلہ بھیا نے موبائل دیکھا، تب سب سمجھ آیا، مگر میں کیسے اپنی مری ہوئی بہن کی حرمت پر کوئی داغ آنے دیتی، کیسے کہتی کہ میری بہن بگڑ گئی تھی، وہ موبائل کا غلط استعمال کرنے لگی تھی، ویسے بھی اس سب میں اس کا قصور نہ تھا، پاپا کی بے وجہ سختی اسے گھر سے متنفر کر دیا تھا۔"

"سختی تو سبھی والدین کرتے ہیں اور اس میں اولاد کی ہی بھلائی ہوتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اچھائی برائی کا فرق ہی بھول جائیں، کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو وقتی طور پر ہمیں بہت پرکشش معلوم ہوتی ہیں، ہم اس چیز کو حاصل کرنے اور اپنی خواہش پوری کرنے کے چکر میں اس کے نقصانات کو پہلے ہی بھانپ جاتے ہیں اور ہمیں اس نقصان سے بچانے کے لئے سختی سے کام لیتے ہیں۔"

"جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر آپ جانتے ہیں، زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے، وہ سختی نہیں پہنچاتی جتنا بلاوجہ کی سختی اور ہر وقت کی روک ٹوک بچوں کو باغی کرتی ہے، المیہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے بے شمار گھروں کے اصول ایسے ہی ہیں، رہی سہی کسر ان موبائل اور نیٹ ورک کمپنیوں کی جانب سے دیئے گئے فری پیکیجز، معلوم نہیں، نور جیسی کتنی ہی لڑکیاں اس برائی کا شکار ہو جاتی ہوں گی۔"

"فری پیکیجز کا استعمال اور بھی بہت لوگ کرتے ہیں، کیا وہ سب انہیں غلط استعمال کرتے ہیں، نہیں ایسا نہیں ہے نجانے کب ہم خود غلطی کرنے کے بعد الزام مختلف چیزوں پر ڈالنا کب چھوڑیں گے، اللہ پاک نے ہر انسان کے اندر ضمیر رکھا ہے جو ذرا سی غلطی اور برائی پر ہمیں ریڈ

سنگل دیتا ہے، مگر ہم میں سے بہت سے لوگ اس کی بات پر کان نہیں دھرتے اور برائی کی راہ پر چل پڑتے ہیں پھر، آج کل کے ماحول میں بچوں کو کھلی چھٹی بھی نہیں دی جا سکتی کہ مغربی تقلید اور بہت سارو پیہ کمانے کی ہوس انسان کو اخلاق کی کس قدر پستی میں جا پھینکتی ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا اور یہ سب مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے، کہ بچپن میں ہی بچے کو نہایت نرمی سے خدا کی محبت کا درس دیا جائے، اخلاقیات سکھائی جائیں تاکہ بڑے ہونے پر کسی قسم کی سختی یا آزادی کی ضرورت ہی نہ پیش آئے، بلکہ انہیں خود اپنی حدود کا اندازہ ہو، بہر حال برائی ہر صورت میں اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔'' بات ختم کرتے ہوئے انصار کی نظر ایشاع کے چہرے پر پڑی تو ہنسی فوارے کی مانند اس کے لبوں سے نکلی۔

''کیا ہوا؟'' ایشاع نے کنفیوژ ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

''ادھر دیکھو۔'' انصار نے ہنستے ہوئے آئینہ کی جانب اشارہ کیا، ایشاع نے تھوڑا سا آگے کی جانب جھک کر دائیں جانب گردن گھمائی اور آئینہ میں اپنا عکس دیکھا تو ہنسی اس کے لبوں پر بھی چیخ پڑی، رونے کی وجہ سے آنسو میک اپ کی تہہ پر لائنز بنا گئے تھے، کاجل پھیل کر آنکھوں اور گالوں کو سیاہ کر گیا تھا۔

انصار نے ہاتھ بڑھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی سنہری ڈبیہ کو اٹھایا جو صبح سے وہیں رکھی تھی جہاں وہ رکھ کر گیا تھا، جبکہ دوسرے ہاتھ سے ایشاع کا ہاتھ تھاما تو اس نے کسمسا کر ہاتھ چھڑوانا چاہا۔

''نو وائف نو، اب مزید نہیں، تمہارا مانگا وقت پورا ہو گیا، تمہاری خواہش پوری ہو گئی، اب ہماری باری ہے، اب تا حیات تمہیں ہماری بات ماننا ہو گی، نور کے جانے کا افسوس تو بہت ہے، مگر شاید تمہیں اسی طرح میری زندگی میں شامل ہونا تھا۔'' ایشاع کے چہرے پر پھیلنے والی سرخی کو دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا، تقدیر نے بے شمار خوشیاں ان کے حصہ میں لکھنا شروع کر دیں، نئی زندگی اپنی تمام تر سچائی اور دلکشی کے ہمراہ ان کی منتظر تھی۔

☆☆☆

فرح بخاری

وہ جو دل و نظر کا سکون تھی مسلسل اسے امتحان سے دو چار کر رہی تھی، کتنا مشکل تھا اس کے سامنے ٹھہرنا، اس نے بات کرنا اور اب اندرونی کیفیت چھپا کر خود کو نارمل ظاہر کرنا، جہاں دل حقیقی خوشی محسوس کرنے لگتا وہاں اسے خود کو کمپوز کرنا پڑتا اور جہاں کسی مایوس کن جملے کی وجہ سے دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب جاتا اسے خود کو مسکراتے ہوئے ابھارنا پڑتا۔

''اوہ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، حالات اور مواقع انسان کی خواہشات کے مطابق ڈھلتے چلے جائیں اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو گی۔'' اس نے فوراً اپنی کیفیت پہ قابو پا کر بڑے

ناولٹ

پرسکون انداز میں اسے دیکھا۔

''لیکن میرے سکون کی وجہ یہ خبر نہیں ہے۔'' اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بات مزید آگے بڑھائی۔

''میں خوش ہوں کیونکہ میں نے اپنی کنفیوژن کا جواب پا لیا ہے۔'' اس کے جواب نے ایکبار پھر مبین کو چونکا دیا۔

''عجیب نا قابل فہم لڑکی تھی، انداز کچھ اور بتا رہے تھے، الفاظ کچھ اور۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''دراصل......'' اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

''میرا رشتہ سعد سے میرے گھر والوں کی مرضی سے ہو رہا ہے، میں ہرگز اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''جی......؟'' وہ حیران حیران سا اسے دیکھے گیا، دل پر پڑا بوجھ کچھ لمحوں میں ہوا ہوا لیکن

مبین کو یہ خوشی خود تک محدود رکھنا تھی۔
''اس روز آپ نے کہا تھا کہ آپ خوش ہیں۔''
''جی بالکل کہا تھا لیکن سعد سے رشتے کے حوالے سے نہیں بلکہ چچا کی فیملی سے تعلقات بحال ہونے کی وجہ سے کہا تھا۔''
''اوہ......'' بات کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی، اس کا دل بڑی ترنگ میں دھڑکا۔
''تو ارما کی شوخی میری یہاں موجودگی سے مشروط ہے نہ کہ۔'' آگے وہ سوچ نہیں پایا، ایک فسوں سا ابھر گیا تھا ماحول میں، جو مبین کے نرم و نازک دل کو موم کے قطروں کی طرح پگھلائے جا رہا تھا، اس فسوں کا پردہ چاک کرنے کی از حد ضرورت تھی، وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔
''مجھے آفس کا بہت سا کام کرنا ہے، معذرت چاہوں گا۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔
''مبین!'' ارما نے اس کا نام لیا اور شاید پہلی مرتبہ لیا، مبین کے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لئے۔
''جی......!'' اپنی آواز کی جھیلوں جیسی روانی اسے خود بھی حیران کر گئی۔
''میرے آس پاس بے شمار ایسے لوگ ہیں جو میرا بھلا چاہتے ہیں اور صحیح معنوں میں میرے مخلص ہیں، میں بلا جھجک اپنی ہر پرابلم پر بے چینی ان سے شیئر کر سکتی ہوں، لیکن کیا بہتر یہ نہیں ہوگا کہ میری کنفیوژن کا جس سے تعلق ہے میں براہ راست اسی سے بات کروں۔''
''ہوں تو آپ سعد سے ڈائریکٹ بات کرنا چاہتی ہیں۔'' مبین نے جانتے بوجھتے اسے الجھانے کی کوشش کی، یا شاید اپنے آپ کو۔
''سعد وہ شخص نہیں ہے جس کا میری الجھن سے تعلق ہے۔'' ارما نے فوراً ہی کہہ دیا۔
''تو......؟'' مبین کا دل بیٹھنے لگا۔
''کیا آپ نہیں جانتے؟'' وہ آہستہ سے بس اتنا ہی کہہ سکی، مبین نے خود کو سنبھال کر گہرا سانس لیا۔
''میں نے اس دن بھی کہا تھا ارما، کچھ باتوں کو دل میں رہنے دیں، مت الجھائیں خود کو، نہ حالات کو۔''
''آپ کے لئے شاید یہ آسان ہو، میرے لئے صرف کہنا بھی مشکل ہے۔'' وہ کرسی سے اٹھی کھڑی ہوئی۔
''آپ کی مجبوریاں میں نہیں جانتی، اپنے متعلق اب اتنا کہہ سکتی ہوں کہ سعد سے شادی مجھے کسی طور منظور نہیں ہے۔''
''پلیز۔'' ارما نے باہر جانے کا راستہ مانگا، مبین کا دھیان الفاظ کے بجائے اس کی آنکھوں پر تھا، پانی سے جھلمل کرتی آنکھیں مبین سے چھپانے کے لئے وہ راہ فرار اختیار کرنا چاہتی تھی، لیکن جب راستہ نہیں ملا تو فوراً پیٹھ موڑ لی، ٹیبل کا کونا تھامے سر جھکائے وہ بے آواز رو رہی تھی۔
''کیوں خود کو مشکل میں ڈال رہی ہیں، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے، کچھ انہی حالات کے پیش نظر میں نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے اور یہی ٹھیک ہے۔'' مبین کا انداز اتنا قطعی تھا کہ وہ سب بھول بھال گھبرا کر مڑی۔
''آ......آپ یہاں سے جا رہے ہیں، لیکن کیوں......کب؟''
''کہیں یہ دل احسان فراموشی اور ضد پر نہ اڑ جائے، میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''
''آپ یہاں سے نہیں جا سکتے۔'' وہ بے چین ہو اٹھی۔
''میں آپ کو نہیں......'' الفاظ اس کے منہ

میں رہ گئے، مبین نے اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا پھر فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

''خاموشی کا بھرم مت توڑو ارما، میں انسان ہوں، فرشتہ مت سمجھو۔''

''پلیز آپ یہاں سے مت جائیں۔'' وہ ایکبار پھر رونے لگی۔

''جانتی ہیں ارما.....'' اس نے دروازے سے ٹیک لگا کر ہاتھ سینے پر لپیٹے۔

''خدیجہ آنٹی میری دادی کی دوست ہیں، کہتا تو میں انہیں آنٹی ہوں لیکن میری نظر میں ان کی عزت اور محبت دادی امی سے کم نہیں ہے، میں یہاں خالص اسی نیت سے رہائش پذیر ہوا تھا کہ ان کے اکیلے پن کے مسئلے کو کسی حد تک حل کر سکوں، کچھ اس فیصلے میں دادی امی کی خصوصی ہدایت بھی شامل تھی، وہ چاہتی تھیں جب تک میں اسلام آباد ہوں ان کی خدمت کا حق ادا کروں، حالانکہ خدمت کرنے کا ایسا کچھ خاص موقع ملتا بھی نہیں، کون سا میں ان کی تیمارداری میں رات رات بھر جاگتا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے اسی نیت سے یہاں رہنے کو وہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، بزرگ انسان کو یہی تسلی کافی ہے کہ آس پاس والے انہیں اگنور نہیں کر رہے، وہ مجھ سے خوش ہیں اور بہت پیار کرتی ہیں پھر منصور بھائی، جن کی غیر موجودگی میں، میں ان کے گھر میں رہ رہا ہوں، فقط اس لئے کہ وہ آنکھیں بند کر کے مجھ پہ بھروسا کرتے ہیں، گھر کی ذمہ داری، یہاں کی خواتین کی حفاظت کی ذمہ داری جو انہوں نے میرے کندھوں پر ڈالی ہے، بہت بھاری ہے شرافت اور انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ یا تو میں یہ ذمہ داری پوری طرح نبھاؤں اور اگر نہ نبھا پاؤں تو دستبردار ہو جاؤں۔'' مبین نے بغور اس کا چہرا دیکھا جو نظریں جھکائے اب خاموشی سے صرف اسے سن رہی تھی۔

''اگر خدانخواستہ کوئی آکورڈ سچویشن پیدا ہو گئی تو ہم کیا جواز پیش کریں گے، ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔''

''جواب تو ہے لیکن آپ اس پر بات ہی نہیں کرنا چاہتے۔'' شکوہ بے ساختہ ارما کے لبوں سے پھسلا تھا، مبین کو اس ٹف سچویشن میں بھی ہنسی آ گئی۔

''وہ کیا سمجھا رہا تھا اور محترمہ کیا سن رہی تھیں۔''

''دل کی کہانیاں کچھ اور ہوتی ہیں، حالات کے تقاضے کچھ اور، مجھے آنٹی سے بات کر لینے دیں، میرے یہاں سے جانے میں سب کی بھلائی ہے۔''

''وہ کبھی نہیں مانیں گی۔'' ارما کے لہجے سے بھرپور یقین جھلک رہا تھا۔

''میں پھر بھی اپنی بات منوالوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' ارما نے سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نانو مان گئیں تو آپ جیتے، پھر جو آپ کا دل چاہے آپ کر سکتے ہیں، لیکن اگر وہ نہ مانیں تو جیت میری ہوگی۔''

''یعنی پھر وہ ہوگا جو آپ چاہیں گی۔'' مبین نے مسکرا کر اضافہ کیا۔

''جی تو منظور ہے؟'' وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔

''اوکے۔'' اس نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر ارما کے لئے راستہ چھوڑا۔

☆☆☆

''تم کچھ لے کیوں نہیں رہے بیٹا! روزانہ بھی سادہ سا ناشتہ کر کے چل پڑتے ہو۔'' خدیجہ حیات نے پراٹھا مبین کے آگے رکھا، اتوار کے دن وہ انہی کے اصرار پر ناشتہ نیچے کیا کرتا تھا۔

''بس آنٹی لائٹ ناشتہ کرنے کی عادت ہو گئی ہے، ویسے بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ سب مہمانوں کی طرح میری خاطر کریں۔'' اس نے اپنی طرف سے بات کا آغاز کیا۔

''کیسی غیروں والی باتیں کر رہے ہو، ماں اپنے بچوں کا خیال رکھتی ہے تو کیا مہمان سمجھ کر رکھتی ہے۔'' انہوں نے محبت سے خود ہی آملیٹ مبین کی پلیٹ میں ڈالا تو وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

''بچوں کا بھی تو فرض بنتا ہے کہ ماں کی خدمت کریں، لیکن میں تو آپ کے لئے وقت بھی نکال نہیں پاتا، اس سے اچھا تھا کمپنی کی رہائش میں رہ جاتا اور......''

''ضرورت بھی نہیں ہے وقت نکالنے کی۔'' خدیجہ بیگم نے اس کی بات کاٹی۔

''جانتے ہو، آٹھ سال ہو گئے ہیں منصور کی جاب کو، یعنی آٹھ سالوں سے اس کی یہاں وہاں ٹرانسفر کی وجہ سے میں مسلسل تنہائی کا شکار ہوں، مہینے میں ایک آدھ بار شکل دکھا جانے کو کوئی آنا کہتا ہے، فرید جب سرونٹ کوارٹر میں رات گزارتا تھا تو اس پورشن میں ہم دو بوڑھی عورتوں کی چوکیداری کا کام بھی مجھے انجام دینا پڑتا تھا، جب سے تم آئے ہو یقین مانو سکون کی نیند میسر آئی ہے مجھ سے پوچھو کہ تمہارے یہاں ہونے سے ہمیں کتنی تسلی کتنی خوشی ہوتی ہے۔'' وہ اپنے خلیق لہجے میں اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے بولتی چلی گئیں اور مبین لب بھینچے چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔

''ویسے بھی پچھلے دو سال سے منصور جہلم میں تم لوگوں کے ہاں رہائش پذیر ہے تو کیا تمہارے گھر والوں پر بوجھ ہے۔'' وہ قدرے خفگی سے بولیں۔

''ارے نہیں آنٹی، منصور بھائی کا اپنا گھر ہے۔'' وہ بوکھلا گیا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں، بھلے ہمارا رشتہ خون کا نہیں ہے لیکن دوستی کا رشتہ خون کے رشتوں سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے، آئندہ ایسی پرایوں والی بات کی تو منصور سے کہوں گی وہ بھی تم لوگوں کے گھر نہ رہے۔'' وہ باقاعدہ غصہ ہو گئیں، ارما اسی وقت گرم چائے لئے ڈائننگ ٹیبل کے پاس آئی، مبین نے ایک اڑتی پڑتی نظر اس پر ڈالی وہ لب دبائے ہلکے ہلکے مسکرائے جا رہی تھی۔

''یہ بات نہیں ہے آنٹی، آپ میری باتوں سے کچھ اور مطلب اخذ نہ کریں، دراصل آفس میں کام کر برڈن آج کل ذرا زیادہ ہو گیا ہے، آنے جانے میں کافی وقت صرف ہو جاتا ہے، میں نے سوچا وہیں رہوں گا تو قریب ہونے کی وجہ سے سہولت ہو جائے گی، ٹریولنگ سے بچ جاؤں گا تو آفس کا کام کرنے کے لئے وقت نکل آئے گا۔'' وہ ہرگز ہار ماننے کے ارادے پر نہیں تھا، ارما کا بری طرح خون کھول اٹھا وہ نتھنے پھلا کر واپس مڑ گئی۔

''رہنے دو، یہ دور نزدیک۔'' خدیجہ بیگم نے لاپروائی سے ہاتھ لہرایا۔

''جانتے بھی ہو اکیلے رہنے میں کتنے مسائل ہیں، آنے جانے کا ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو بچا لو گے پر دس دوسری ذمہ داریوں کا بوجھ سر پہ آ پڑے گا، پھر اتنے کام سے بھی جاؤ گے جتنا یہاں آ کر کر لیا کرتے ہو۔'' وہ اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر بولتی چلی گئیں، مبین کو سمجھ نہیں آ رہی

تھی مزید کیسے انہیں قائل کرے۔

''ارے بھئی ہاتھ کیوں کھینچ لیا، کھانا کھاؤ اور ہاں اگر مزید اس بارے میں سوچا تو سیدھے جہلم فون لگاؤں گی تمہاری ماں کو، پوچھ لیں گی تم سے کہ کیوں اتنے جلدی تنگ آگئے آنٹی کی خدمت سے۔'' وہ اب ہنس رہی تھیں مبین شرمندہ ہوگیا۔

''سوری آنٹی آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔'' کچن میں کھڑی ارما نے سن تو لیا لیکن دل جانے کیوں بے طرح اچاٹ سا ہوگیا، مبین کے آفس جانے کے بعد وہ خود بھی گھر واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

منصور کا رشتہ طے پا گیا تھا، وہ تین دن کے لئے اسلام آباد آیا ہوا تھا، لڑکی کا نام مدیحہ تھا، جسے نفیسہ اور فریال نے پسند کیا تھا، باقی سب کو بھی وہ سوبر سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی تبھی چند دنوں میں سارے معاملات طے پا گئے تھے، نانو امی کے ہاں شادی کی تیاریوں کا آغاز بھی ہوگیا تھا لیکن ارما اس دن کے بعد دوبارہ وہاں نہیں گئی، فریال سے فون پر سارا حال احوال مل رہا تھا بلکہ اتوار کے دن اس کی امی اور صبا نانو کو مبارکباد دینے گئیں تب بھی وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر پر رک گئی، اپنی عجلت پر وہ شدید پچھتاؤں سے دوچار تھی، اپنی انا کو مار کر اس نے مبین سے بات کرنے کے لئے جو ڈھیروں ڈھیر حوصلہ اپنے اندر پیدا کیا تھا، اس کے نتیجے نے انتہائی تکلیف پہنچائی تھی، وہ سنگدل پتھر تو پگھلنا چاہتا ہی نہیں تھا، ارما کا دل چاہا کہہ دے اس سے کہ مت دیکھا کرو میری طرف اتنی اپنائیت سے، مت مسکرایا کرو چپکے چپکے میری باتوں پر، نہ کیا کرو مجھے مخاطب، مت آیا کرو میرے سامنے، فریب ہیں یہ آنکھیں، یہ ہنسی، یہ دل لگی، میں ہی پاگل تھی، وہ تکیوں میں منہ چھپائے بے آواز روتی رہتی، فریال اور نانو بلا بلا کر تھک گئیں لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی، تبھی منصور خود ان سے ملنے گھر آگیا۔

''کیوں بچیوں، ماموں سے ملنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔'' اس نے ارما کے سر پہ پیار سے چپت لگائی۔

''سوری ماموں، مجھے رات ہی پتہ چلا آپ کب تک یہاں ہیں۔'' وہ شرمندہ ہوگئی۔

''بس چندا، کل شام واپسی ہے، دوست وغیرہ ٹریٹ مانگ مانگ کر پریشان کر رہے تھے، مجبوراً آنا پڑا۔'' وہ قدرے شرما گیا۔

''ٹریٹ تو ہمیں بھی چاہیے ماموں، ایسے تو بالکل چھٹی نہیں ملے گی۔'' وہ پوری طرح موڈ میں آگئی۔

''تو ٹھیک ہے، پھر چلو میرے ساتھ، کیوں صبا؟'' اس نے دونوں کو ساتھ چلنے کی آفر کی۔

''سوری ماموں میرے تو سمسٹر چل رہے ہیں۔'' صبا نے منہ بنایا۔

''اور تم؟'' منصور نے اس کی طرف دیکھا، تو وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر سے اس بے مہر کا خیال آ گیا۔

''چلی جاؤ ارما، ماموں کے اتنے مہمان آ رہے ہیں، عظمت اکیلی پریشان ہو جائے گی۔'' آمنہ نے اصرار کیا ارما نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کام کاج کا زیادہ مسئلہ نہیں ہے آپا، دوستوں کی فرمائش ہے کہ سب کچھ باہر سے منگوایا جائے، البتہ گیدرنگ وہ گھر پر ہی کرنا چاہتے ہیں۔''

''چلو کوئی بات نہیں، سرونگ وغیرہ میں مدد کردیں گی۔''

''آ جاؤ پھر، یہاں سے نفیسہ آپا کے گھر جاؤں گا وہاں سے فریال کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔'' منصور اٹھ کھڑا ہوا تو ارما ضروری سامان لینے اپنے کمرے میں آ گئی۔

''کام کاج تو یہاں واقعی زیادہ نہیں تھا۔'' لیکن فریال اور اس نے خود ہی ڈرائینگ روم کی سیٹنگ تبدیل کرنے کا ارادہ کرلیا۔

مہمانوں نے رات کو آنا تھا، منصور، خدیجہ بیگم کو روٹین چیک اپ کے لئے ہاسپٹل لے گیا، دو گھنٹے کی طویل محنت کے بعد دونوں نے ڈرائینگ روم کا نقشہ کافی حد تک تبدیل کر دیا تھا اور اب فریال بی بی تھک کر صوفے پر لمبی ہو چکی تھی اور بنا چائے کافی پیے ہرگز ہلنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ارما، بوا کو کافی کا کہنے کے لئے کچن کی طرف جا رہی تھی جب مبین سیڑھیاں اتر کر لاؤنج میں آیا، ارما ٹھٹک کر حیرت سے دیکھنے لگی کیونکہ اس کے حساب سے تو مبین کو اس وقت آفس میں ہونا چاہیے تھا، مبین نے اس کے بے ترتیب حلیے پر ایک لاشعوری نگاہ ڈالی تو ارما کو ہوش آیا، فوراً آستینیں نیچی کر کے دوپٹہ درست کیا اور اس سے پہلے ہی کچن میں داخل ہوگئی، وہ بھی شاید ادھر ہی آ رہا تھا، ارما کو بوا کہیں نظر نہیں آئی تو واپسی کے لئے پلٹی لیکن وہ اب کچن کے دروازے تک آ چکا تھا ارما نے نظریں چرا کر سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ سینے پہ ہاتھ باندھے دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا، اس نے غصے سے نظر اٹھائی۔

''ناراض ہیں؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''راستہ چھوڑیں۔'' وہ سخت بگڑی ہوئی تھی۔

''سوری فار وہاٹ؟'' اس نے چیخ کر نظر اٹھائی، مبین کا دل جیسے سارے اختیار کھونے لگا، لیکن جگہ اور ماحول آکورڈ تھے، کوئی بھی آ سکتا تھا۔

''آپ اتنے دنوں سے آئی نہیں تو......''

''میرے آنے جانے سے آپ کو کچھ سروکار نہیں ہونا چاہیے، میری نانو کا گھر ہے جب میرا دل چاہے میں آؤں گی، پلیز مجھے جانے دیں۔'' بنا نظر اٹھائے اس نے قطعی انداز میں کہا۔

''جی!'' اس بار سنجیدگی سے مبین نے راستہ چھوڑ دیا اور وہ ڈبڈباتی آنکھوں کا پانی پیتی تیزی سے اندر بڑھ گئی۔

بارہ بجے کے قریب منصور اور خدیجہ بیگم ہاسپٹل سے واپس آئے، رپورٹس وغیرہ سب ٹھیک تھیں، صرف لو بلڈ پریشر کا مسئلہ آج کل ذرا زیادہ ہو رہا تھا، ڈاکٹر نے دواؤں کے کورس میں تھوڑا ردوبدل کیا تھا۔

منصور کو ڈرائینگ روم کی سیٹنگ کافی پسند آئی تھی، دونوں کو باقاعدہ انعام سے نوازا گیا، کھانا وہ باہر سے لائے تھے کیونکہ بوا کپڑے دھو رہی تھیں فریال نہا کے نکلی تو وہ خود فریش ہونے چلی گئی، بالوں میں کنگھی کرتے وہ آئینے کے سامنے آئی، لائٹ گلابی ڈریس بلاشبہ بہت جچ رہا تھا لیکن آنکھوں کی اداسی کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی، جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا، وہ ایک سرد آہ کھینچ کر سامنے سے ہٹ گئی، نانو لنچ کے لئے بلا رہی تھیں، اس نے کافی جھجکتے ہوئے لاؤنج میں قدم رکھے لیکن تسلی ہوئی یہ دیکھ کر کہ مبین ڈرائینگ ٹیبل پر موجود نہیں تھا۔

''مبین کو تو بلائے کوئی۔'' اس نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا کہ نانی کی آواز پر بے ساختہ

وہیں رک گئی۔

''میں نے کال کی تھی ابھی۔'' منصور نے ماں کو دیکھا۔

''کہہ رہا تھا ناشتہ آج لیٹ کیا ہے، بھوک نہیں ہے فی الحال۔''

''میں نے ان کا کھانا علیحدہ سے رکھ دیا ہے نانو۔'' فریال نے مزید بتایا۔

''ہاں اچھا کیا۔'' وہ بھی کھانے میں مصروف ہوگئیں۔

نانو اور ماموں کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے وہ اور فریال اس مشترکہ کمرے میں آگئیں جو یہاں ان کے استعمال میں رہتا تھا، فریال تھک کر لیٹی تو ارما نے اس کے ارادے بھانپ لئے۔

''پلیز سونا مت، مجھے سخت بوریت ہوگئی۔''

''خبردار جو میری نیند میں خلل ڈالا۔'' اس نے دور سے تنبیہ کی۔

''یار باتیں کرتے ہیں ناں، دیکھو کتنے دنوں بعد آج ہم اکٹھے ہوئے ہیں، ماموں کی شادی کے پروگرام بنائیں گے۔'' ارما نے اس کی دلچسپی بڑھانے کی کوشش کی۔

''ہاں، لیکن رات کو۔'' اس نے لمبی سی جمائی لی۔

''اور خبردار جو شام کو گھر جانے کا سوچا بھی، آج ہم دونوں یہیں رہیں گے، رات کو لان میں واک بھی کریں گے اور شادی کی تیاریوں کے پلانز بھی بنائیں گے۔''

''پر ابھی سونے دو پلیز۔'' اس نے کشن منہ پہ رکھا۔

''اور ہاں۔'' دو سیکنڈ میں ہی دوبارہ سر نکالا۔

''باہر ٹی وی لاؤنج میں سینٹر ٹیبل کے نیچے دو نئے ڈائجسٹ رکھے ہیں، چاہو تو پڑھ لو، ٹائم اچھا گزرے گا۔''

''بدتمیز کمینی۔'' وہ اسے گھورتی ڈائجسٹ کے لالچ میں باہر نکل آئی، تبھی عظمت بوا دھلے کپڑوں کی ٹوکری ہاتھوں میں لئے پچھلے دروازے سے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

''اے بیٹا! شکر ہے جاگ رہی ہو، یہ بڑی چادریں چھت پر پھیلانی ہیں، میری تو سوچ سوچ کر ہمت جواب دے رہی تھی کہ کیسے اتنی سیڑھیاں چڑھوں گی۔'' عجیب بے چارگی تھی بوا کے انداز میں اور اس سے سوا ارما کے چہرے پر۔

''ایسے وقت چھت پر جانا جب مبین بھی وہیں تھا۔'' اب وہ بوا کو کیا سمجھاتی جو تشکر بھری نظریں اس پر جمائے کھڑی تھیں۔

''جی بوا، آپ جائیں آرام کریں، صبح سے کام کر کر کے تھک گئی ہیں۔''

''ہاں بیٹا! اب ذرا لیٹوں گی۔'' وہ کمر پہ ہاتھ رکھے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، ارما نے ٹوکری نیچے رکھ کر پہلی مدد کے طور پر کمرے میں جھانکا کہ شاید فریال جاگ رہی ہو لیکن وہ تو آدھے کھلے منہ کے ساتھ سریلے خراٹے مار رہی تھی، شاید اس سے گہری نیند وہ آج تک نہیں سوئی تھی، ارما باسکٹ اٹھا کر مرے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی، سیڑھیوں کے اختتام پر لمبا کوریڈور آتا تھا جس کے بائیں ہاتھ پر مبین کا کمرا اور دائیں طرف باتھ روم اور اسٹور تھے، کوریڈور سے نکلتے ہی کھلا برآمدہ اور صحن آجاتے تھے، کمرے کی بند دروازے پر ایک چور نگاہ ڈالتی وہ تیزی سے صحن میں نکل آئی۔

''اللہ جانے ہاتھ کیوں کانپ رہے تھے اور یہ کم بخت دل، جو کسی طور قابو نہیں آ رہا تھا۔'' اس نے خاصی عجلت میں چادریں الگنی پر پھیلائیں اور

باسکٹ اٹھا کر واپسی کے لئے پلٹی، جونہی قدم کوریڈور میں رکھے، کمرے کا دروازہ کھلا، وہ بنا نظر اٹھائے آگے سے گزر گئی۔

''ایک منٹ ارما۔'' بھاری گمبھیر لہجے پر اس کا دل دھڑک اٹھا، قدم بھی بے ساختہ رک گئے لیکن وہ پلٹی نہیں۔

''بات کیا ہے؟ اتنی خفا کیوں ہیں؟۔''

''دیکھیں...... آپ...... آپ۔'' وہ غصے سے مڑی اور انگلی اٹھا کر تنبیہ کے انداز میں کچھ کہتے کہتے جانے کیوں اٹک گئی، مبین دروازے کی چوکھٹ سے پشت ٹکائے مکمل اسی کی جانب متوجہ تھا۔

''جی جی دیکھ رہا ہوں، غصہ کرتی آپ اور بھی اچھی لگتی ہیں۔'' کچھ دیر پہلے کی سنجیدگی کا شائبہ تک نہیں تھا، نرم پھوار برسائے لہجے پر اس کا مزید دل بھر آیا۔

''اُف یہ اشکوں کا سمندر۔'' وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

''ارے بھئی اس طرح بیچ راستے میں مت روئیں۔'' اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا دیئے زارو قطار رونے لگی، مبین نے کچھ دیر سوچا پھر شانوں سے تھام کر برآمدے تک لایا جہاں ایک چھوٹی چیئر پر بٹھایا اور خود دوسری چیئر گھسیٹ کر سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے ارما، مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں کم از کم اور خدا کے لئے اس بن بادل برسات کو ذرا دیر کے لئے موقوف کریں، اس روز میں شرط ہار گیا تھا آپ جیت گئی تھیں، معاہدے کی رو سے اب وہی ہونا تھا جو آپ چاہیں لیکن بارہ دن گزر گئے اور آپ کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، اب بتائیں میں کیا کرتا سوائے آپ کا انتظار کرنے کے۔'' وہ نہایت رسان سے وضاحت دینے لگا۔

''مجھے نہیں یاد اس دن ہمارے بیچ کیا بات ہوئی تھی اور نہ ہی میں کسی ہار جیت کے کھیل میں الجھنا چاہتی ہوں۔'' وہ اب دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور چہرا صاف کر رہی تھی، اس کا نکھرا صبیح چہرہ کپڑوں سے زیادہ گلابی لگ رہا تھا، مبین کو یہ تازگی اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی، وہ چیئر سے اٹھ کر برآمدے کے ستون کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

''جنہیں اظہار کا سلیقہ آتا ہے وہ بڑی خوبصورتی سے ذاتی الفاظ اور جملوں کا انتخاب کر لیا کرتے ہیں، لیکن مجھ جیسے بدسلیقہ آدمی کو تو یہ ڈھنگ بھی نہیں آتا۔'' وہ اپنے آپ میں مسکرایا تو ارما نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔

''اظہار۔''

''ایک غزل کے چند اشعار آج کل مجھے کافی حسب حال سے لگتے ہیں بلکہ میرے جذبات کی اس سے بہتر ترجمانی شاید ہو نہیں سکتی۔'' اس نے گلا کھنکھارا۔

کہیں یہ شام ملاقات سے بہت پہلے
ملا تھا وہ مجھے دن رات سے بہت پہلے
سنا ہے چاروں طرف پیار کا اجالا تھا
وجود ارض و سماوات سے بہت پہلے
یہی سخن یہی مضمون آنکھوں آنکھوں میں
میں کہہ چکا تھا تیری بات سے بہت پہلے
کہیں ملے تھے ستارے ہم ہوئے تھے نصیب
تمہارے میرے خیالات سے بہت پہلے

نرم رواں لہجے میں اس نے کہنا شروع کیا تو ارما بغور اسے سننے لگی اور غزل کے اختتام پر وہ اچانک ہی پورا گھوما تو دھیان سے اس کی طرف دیکھتی ارما گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، مبین چند قدم چل کر بالکل اس کے سامنے آیا۔

''جو حقیقت ہے وہ تو بس یہی ہے اور ایک

وضاحت جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی پہل کا ذمہ دار خود کو کبھی مت سمجھنا، آپ نے جو کہا وہ ردعمل تھا اس عمل کا جو مجھ سے سرزد ہوا، احساس تھا اس جذبے کا جو میری نگاہوں سے آپ تک پہنچا، پیغام تھا اس محبت کا جو میری مسکراہٹ میں آپ کو چھپا نظر آیا، آج سے ہر نفع ونقصان سے مشروط ہے جو میں نے آپ سے کی ہے، ہاں میری پہلی نظر کی محبت جو ہرگز کسی وقتی ابال کا نتیجہ نہیں اور جس کا احساس مجھے بھی بہت بعد میں ہوا، جانتی ہیں کب؟'' اس نے پہلی مرتبہ اسے مخاطب کیا، ارما نے بمشکل پلکیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میں نے وہ دو گھنٹے کانٹوں پر گزارے تھے جو اس رات آپ نے اپنی دوست کی شادی میں گزارے، میرا دل چیخ چیخ کر بس ایک ہی بات کہے جارہا تھا کہ ارما کو اس شادی میں جانے سے روک لو، کیونکہ کچھ ایسا ہونے والا ہے جو تمہیں اس سے جدا کر دے گا، جانے کیسے کیسے وہم ستا رہے تھے، آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر جان میں جان آئی تھی، لیکن اس روز جب آپ نے بتایا کہ وہاں آپ کی ملاقات پہلی مرتبہ آپ کے کزن سعد اللہ سے ہوئی جس نے دیکھتے ہی نہ صرف آپ کو پسند کر لیا بلکہ گھر میں اس حوالے سے آپ کی شادی کی باتیں بھی ہونے لگی ہیں، تب مجھے سمجھ آئی کہ جدائی کے اس وہم کی حقیقت کیا تھی اور تب ہی پہلی مرتبہ اپنی سنجیدگی کی بھی۔''

ایک سرد آہ کھینچ کر اس نے ارما کی طرف دیکھا جس کی ساری ناراضی، سارے گلے شکوے پل میں ہوا ہو گئے تھے اور غصے کی جگہ اب ایک حیا آمیز سرخی نے لے لی تھی، وہ خوش تھی، اور اتنی خوش کہ چہرے کی رعنائی ہر بھید کھول رہی تھی، مبین کا دل ایک انجانے خدشے سے کانپ اٹھا۔

بھلے محبت کا اظہار اب ہو چکا تھا جو اس کی ہار سے مشروط تھا لیکن حالات کی سنگینی اور نزاکت اس سے بدل نہیں جاتی تھی۔

''میں نے بہت کوشش کی تھی ارما کہ دامن بچا کر چلوں تاکہ کسی خرابی کا امکان پیدا نہ ہو لیکن شاید میرا عمل میری سوچ کے منافی تھا۔''

''لیکن ہماری سوچ اور نیت اگر دونوں صاف ہیں تو ہم پچھتاوؤں میں کیوں گھریں؟'' ارما نے بہت دیر بعد گفتگو میں حصہ لیا۔

''کیونکہ میں نے کہا تھا کہ میں بغاوت اور بے حسی کا متحمل نہیں ہو سکتا، آپ دعا کرنا کہ حالات ہمیشہ موافق رہیں، آئیں۔'' اس نے کوریڈور کی سمت اشارہ کیا باسکٹ اٹھا کر وہ بھی ساتھ چلنے لگی۔

''آج چلی جائیں گی؟'' مبین نے موضوع بدلا۔

''جی نہیں، کل صبح ماموں جائیں گے تو اس کے بعد میں بھی چلی جاؤں گی۔''

''یعنی میرے آفس آنے تک آپ یہاں نہیں ہوں گی۔'' اس نے ہلکا سا شکوہ کیا ارما مسکرانے لگی۔

''اس بار تو نہیں، اگلی مرتبہ البتہ ویک اینڈ کے آس پاس آؤں گی تاکہ آپ کی چھٹی ہو۔''

''ہوں تھینکس۔'' وہ مسکرا کر سیڑھیوں سے قدرے پہلے رک گیا اور ارما نیچے اتر گئی۔

☆☆☆

''کیا ہوا، ارما سے بات نہیں ہوئی؟'' رابعہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر بیٹے کو دیکھا جو خاصے آف موڈ کے ساتھ ریسیور کریڈل پر رکھ رہا تھا۔

ہاں، وہ اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی ہے، بلکہ موسٹ آف دا ٹائم وہیں پائی جاتی ہیں، سعد کا

موڈ واقعی کافی خراب تھا۔

''بھئی اس کی نانی امی بیمار ہیں، وہ ان کا خیال رکھتی ہے، آمنہ بھابھی بتا رہی تھیں کہ دو تین دن وہیں رہ بھی جاتی ہے، تم اسے موبائل فون پہ کال کرلو۔''

''موبائل نمبر نہیں ہے، لینا بھول گیا تھا۔'' وہ شوز کے تسمے باندھنے لگا۔

''کہیں جا رہے ہو؟'' رابعہ نے اس کی تیاری پہ دھیان دیا، وائٹ جینز کے ساتھ اس نے بلیک اینڈ وائٹ چیک کی شرٹ پہنی تھی، ہلکے ہلکے کولون کی خوشبو بھی اس کی آمد کے بعد روم میں پھیل گئی تھی اور رسٹ واچ جو وہ گھر میں کبھی نہیں باندھتا تھا۔

''ہاں ایک دوست کی طرف جانا ہے، لیکن اس کی کال کا ویٹ کروں گا، اندازاً پندرہ بیس منٹ یہیں ہوں، خیریت؟'' سعد کو لگا وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔

''ہاں میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم ارما سے شادی کرنے میں واقعی انٹرسٹڈ ہو؟''

''واقعی مطلب؟'' وہ حیرت سے ہنسا۔

''بھئی ان لوگوں سے ملے ہمیں بہت کم وقت ہوا ہے اور تم نے بہت جلدی بہت بڑا فیصلہ سنا دیا تو۔''

''کیا آپ کو ارما پسند نہیں، یا آپ کسی اور کو میرے لئے پسند کر چکی ہیں۔'' سعد نے قدرے پھیل کر آرام سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی، وہ بھی کھل کر اس موضوع پہ بات کرنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔

''ارما میں کوئی کمی نہیں، وہ ہر لحاظ سے بہت آئیڈیل بہت نائس ہے اور نہ ہی میں کسی اور کو پسند کر چکی ہوں، مجھے ڈر صرف تمہاری سوچ سے ہے، اگر چند روز بعد تمہاری رائے تبدیل ہو گئی تو تمہارے بابا بہت ڈسٹرب ہو جائیں گے، ایز یو نو کہ وہ رابطوں کی اس بحالی پر کتنے خوش اور مطمئن ہیں۔''

''یعنی آپ کو لگتا ہے میں سیریس نہیں ہوں۔'' اس نے مسکراتی نگاہ ماں پر ڈالی۔

''میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اچھی طرح وقت لے کر سوچ بچار کرو تب ہی ہم باقاعدہ رشتہ لے کر جائیں۔'' رابعہ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

''تو سمجھیں میں نے وقت لے بھی لیا اور سوچ بھی لیا، اینڈ رزلٹ یہ ہے کہ میں بہت سیریس ہوں اور شادی مجھے صرف ارما سے ہی کرنی ہے۔''

''اتنی پسند آگئی ہے؟'' وہ بھرپور شوخی سے ہنسیں۔

''ہاں...... اتنی کہ میں چاہتا ہوں آپ لوگ جلد از جلد رشتہ لے کر جائیں، تا کہ ہم لیٹ نہ ہو جائیں۔'' اس کا لہجہ قطعی اور اعتماد قابل دید تھا۔

''اللہ تمہاری سنجیدگی برقرار رکھے، مجھے اور کیا چاہیے۔'' وہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئیں، سعد نے دونوں بازو گردن کے پیچھے باندھے اور ٹانگیں سامنے ٹیبل پر پھیلا دیں۔

''حیرت ہے میری ماں، آپ اس معاملے پر بے اعتباری کا اظہار کر رہی تھیں، جس کا میں نے برسوں انتظار کیا، ارما کو وقت اور حالات نے ٹھیک ایسے موڑ پر میرے سامنے لاکھڑا کیا ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی، وہ اب میرے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی، بائے ہوک آر کروک، شی از فائن اونلی (وہ صرف میری ہے، اب یہ جیسے بھی ممکن ہو)۔''

عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چمکی اور آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

منصور کی شادی کے دن قریب آ گئے تھے، بری تیار کرنے میں نفیسہ خالہ اور فریال نے بہت مدد کی تھی۔

''یہ گولڈ اور کندن والا سیٹ بہت پیارا ہے نانو۔'' ارمانے ہاتھ میں لے کر توصیفی نظر ڈالی۔

''میری پسند ہے جی۔'' فریال نے اترا کر ابرو چڑھائے۔

''لیکن نانو! آپ نے ہال میں شادی سے منع کیوں کر دیا۔'' تارا نے پیچھے سے نانو کے گلے لگتے ہوئے دلار سے پوچھا۔

''ارے ہال میں وہ لوگ شادیاں کروائیں جنہیں گھر میں گنجائش کا مسئلہ ہو، اللہ کا شکر ہے جس نے اتنا بڑا گھر دیا ہے، دو دو لازہیں، مہمانوں کے بیٹھنے رہنے کی تمام سہولیات ہیں، ویسے بھی شادی بیاہ جیسی بابرکت رسمیں اپنے گھر میں ہی کرنی چاہئیں۔'' خدیجہ حیات بالکل قائل نہیں تھیں۔

''ہمارے زمانوں میں کیسے اہتمام سے گھروں میں شادیوں کا انعقاد ہوتا تھا۔''

''جی اماں!'' سفینہ نے بھی تائید کی۔

''چھوٹے چھوٹے گھروں میں کئی خاندان سما جایا کرتے تھے، پھر بھی برکت ماشاء اللہ کسی طور کم نہیں ہوتی تھی۔''

''لو بھئی تم سب کی ٹریٹ کا سامان۔'' فہد نے ڈھیروں ڈھیر کھانے کے شاپر سامنے رکھے تو وہ سب بری کو بھول بھال ادھر متوجہ ہو گئیں، جب سے منصور کی تاریخ طے ہوئی تھی اور تیاریوں کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا وہ سب آج پہلی مرتبہ اماں کے ہاں جمع ہوئے تھے۔

''نانو امی! میں بری کی تصویریں ماموں کو بھیج دوں۔'' صبا نے موبائل نکالا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، پر کیسے بھیجو گی۔'' وہ

حیران ہوئیں۔

''وٹس ایپ سے، مطلب موبائل سے ہی بھیجوں گی۔'' اس نے زیورات کے ڈبے کھول کر تصویریں لینا شروع کر دیں۔

''کھانے کے بعد ہم سب بھی باہر لان میں اپنی تصویریں بنوائیں گے۔''

''ہاں اسی بہانے تمہارے ''فولڈر فادی'' میں بھی نیا اضافہ ہو جائے گا۔'' فریال نے چھیڑا تو تارا نے بری طرح اسے گھورا۔

''شٹ اپ۔''

''اور آج تو بلو شرٹ میں اور بھی ہینڈسم لگ رہا ہے میرا بھائی۔'' ارما شرارت سے ہنسی تو تارا نے باقاعدہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے چپ کرایا، ارما کی سانس بند ہونے لگی، زور سے چیخ مار کر خود کو چھڑوایا۔

''کیا مصیبت آ گئی ہے؟'' آمنہ غصے سے مڑی۔

''کسی کا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔'' صبا آہستہ آواز میں کہہ کر ہنستی چلی گئی، تارا فہد کو پسند کرتی تھی اور وہ تینوں ہی یہ بات جانتی تھیں لیکن بھاری بھرکم قسموں کی وجہ سے مجبور تھیں۔

''عظمت ذرا مبین کو تو آواز دینا۔'' خدیجہ بیگم نے کچن میں کھڑی بوا کو پکارا۔

''مبین بھائی گھر پر ہیں؟'' فہد چونکا۔

''میں تو سمجھا آفس ہوں گے۔''

''ہاں، آج وہ گھر پر ہے، کہہ رہا تھا لکھنے کا بہت سارا کام ہے، کوئی ریکارڈ ترتیب دینا ہے تو باس نے کہا کہ گھر پر آرام سے کر لے۔''

''اچھا میں خود چلا جاتا ہوں، مل بھی لوں گا اور نیچے بھی لیتا آؤں گا۔'' وہ فوراً سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا، دور بیٹھی ارما کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں، اسے بھی ہرگز اندازہ نہیں تھا

کہ مبین کی آج چھٹی ہو گی، وہ تو ہفتہ بھر ہوا اس سے شاید ناراض تھی، چھت والی آخری گفتگو میں اس نے مبین کو بتایا تھا کہ وہ اتوار کے دن دوبارہ آئے گی اور بجائے اس کے وہ ہفتہ کی شام کو ہی یہاں آ گئی تھی لیکن یہاں پہنچنے پر نانو سے پتہ چلا کہ وہ دو دن کے لئے جہلم چلا گیا ہے، اس کی لاپروائی اور بے حسی پر ارما کو خوب خون کھولا تھا، دل اس بری طرح ہرٹ ہوا کہ اس نے مبین کا سامنا نہ کرنے کا پختہ عہد کر لیا، لیکن ظاہر ہے نانو کے ہاں آئے بنا تو چارہ نہیں تھا اور آج تو وہ یہاں رہنے کے لئے آئی تھی کیونکہ فریال پچھلے تین دن سے یہاں تھی، آج اس نے اپنی امی وغیرہ کے ساتھ واپس چلے جانا تھا۔

مبین اور فہد باتیں کرتے نیچے آنے لگے تو ارما جلدی سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی اور وہ جو موقع غنیمت جان کر فرصت سے اسے دیکھتے ہوئے آ رہا تھا ایکدم ٹھٹک گیا، تو وہ ناراض تھی، اندازہ تو مبین کو پہلے سے تھا کہ وہ خفا ہو گی، بس شدت کا اندازہ اس کا چہرا دیکھ کر لگانے کی کوشش کر رہا تھا، لائم یلو اور رائل بلو بے حد فریش امتزاج والے ڈریس کے ساتھ اس کا ستا چہرا بالکل صحیح ناراضگی کی عکاسی کر رہا تھا۔

''گلابوں کی تازگی آپ کے چہرے کا حسن ہے محترمہ، اسے تو واپس لانا ہی پڑے گا۔'' وہ اپنے آپ میں مسکراتا سب کے درمیان آ کر بیٹھ گیا، لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی، جس کی خاطر اس نے آج چھٹی کی تھی فریال چونکہ پچھلے تین روز سے یہیں تھی تو فون پر زور وشور سے بنتے پروگرام اس کے کانوں میں بھی پہنچ رہے تھے، تبھی ارما کو منانے کی خاطر وہ گھر پر رک گیا، لیکن وہ بھی جانے کیا ٹھانے بیٹھی تھی، کھانے کے دوران بس پانچ منٹ کے لئے باہر آئی، پلیٹ میں اپنا کھانا

نکالا اور واپس چلی گئی، بلکہ جاتے جاتے فریال کے کان میں کچھ ایسا کہہ گئی جس سے مبین کا دل ہی جلا تھا، اس نے آئیڈیا دیا تھا کہ یہاں سے سب لوگ مارکیٹ چلتے ہیں اور ماموں کی شادی کے لئے اپنی ذاتی شاپنگ کا آغاز کرتے ہیں، آئیڈیا سب کو پسند آیا سوائے مبین کے، کھانے سے فراغت پا کر آدھے گھنٹے میں ہی وہ سب روانہ ہو گئے، مبین تھکے قدموں سے واپس اوپر چلا گیا، یہ جانے بغیر کہ ارما نے واپس یہیں آنا ہے، اسے اگر ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ واپس آئے گی تو ہرگز اتنا اداس اور دلگرفتہ نظر نہ آتا۔

چار بجے فہد اور امی وغیرہ نے اسے نانو کے گھر ڈراپ کیا اور آگے بڑھ گئے، نانو امی کو شاپنگ دکھانے کے بعد وہ فریش ہونے چلی گئی، کیونکہ خوب تھکی ہوئی تھی دوسرے اہتمام سے تیار ہونے کا موڈ بھی ہو رہا تھا، سارا دن اس سے ناراض رہ کر وہ اپنی من مانیاں کر کے غصہ بھی کافی حد تک کم ہو گیا تھا، پانچ بجے گیلے بالوں میں برش کرتی باہر آئی تو ذہن میں کوئی خاص آئیڈیا نہیں تھ، سوچا تازے پھولوں کا ایک گلاستہ نانو کے لئے بنا لے، لان میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مبین پائپ لے کر پودوں کو پانی دیتا نظر آیا، ایک بڑی شرارتی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی، بدلہ لینے کے بعد من ویسے بھی کافی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا، وہ بڑی ترنگ میں نزدیک آئی۔

''کیا ہو رہا ہے جی؟''

''جہاز چلا رہا ہوں۔'' وہ بری طرح جل کر بولا تو ارما کی ہنسی نکل گئی، یقیناً اس کے دن بھر کے برے رویے کے باعث اب وہ خفا تھا۔

''دلیں ایک تو صلح کا پرچم ہم لہرائیں اوپر سے ناراضی بھی سہیں۔''

''اور یہ کسی نجومی نے کہا تھا کہ صلح کا پرچم پانچ بجے سے پہلے نہ لہرانا۔'' وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''اب اس روز آپ نے میرے دو دن ضائع کیے تو کیا میں آپ کا ایک دن بھی ضائع نہیں کر سکتی۔''

''بڑے حساب کتاب آتے ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے پیر دھونے لگا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے اپنی توجہ فرید کے ٹیپ ریکارڈر کی طرف مبذول کی جو گیٹ کے اندرونی جانب فل والیوم میں بج رہا تھا۔

یہ بہاریں یہ سماں سب اس کے دم سے ہے
وہ پیا کچھ کچھ خفا رہتا جو ہم سے ہے
جان کچھ کچھ اس کی بھی جاتی تو ہو گی
رنگ دل کی دھڑکن بھی لاتی تو ہو گی

''پتہ نہیں یہ سارے پیا ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اور یہ پیا کیا ہوتا ہے؟'' مبین نے بہت بن کر سوال کیا۔

''ارے آپ کو نہیں پتا؟'' اس نے آنکھیں پھیلائیں۔

''سچی نہیں پتہ۔''

''بھئی جس سے ہم پیار کرتے ہیں یعنی محبوب۔'' اس نے سادگی سے وضاحت کر دی۔

''اچھا میں سوچتا تھا شاید کوئی پرندہ ہے، بیا...... پیا...... ویسے آپ کا پیا تو بہت اچھا ہے، آپ کی خاطر چھٹی کرتا ہے، آپ کے پودوں کو پانی دیتا ہے۔''

''کون...... آپ؟'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''یعنی خود ہی فرض کر لیا، میں نے تو نہیں کہا کہ آپ ہیں ''وہ۔''

''تو اب کہہ دیں، اتنا تو حق بنتا ہے ناں۔''

''کچھ ہو تو کہوں۔'' وہ مسکرا کر پھول چننے

لگی۔

''کیوں فقیروں کو تنگ کرتی ہیں، ہم جیسوں کی دعا لیا کریں۔''

''مانتے ہیں بابا جی۔'' اس نے ہار مانی۔

''آپ کی چھٹی حس کے کمال تو دیکھ چکے ہیں، لیکن یہ فقیر جھوٹ کب سے بولنے لگا۔''

''جھوٹ؟''

''باس نے کام کے لئے چھٹی دی اور احسان مجھ پر لگا رہے ہیں۔''

''جواب نہیں آپ کا، یعنی آنٹی کو میں اصل وجہ بتا دیتا؟''

''تو کیا سچ مچ آپ نے......؟'' وہ اچھی خاصی بے یقین تھی۔

''فریال پچھلی شام آپ کے ساتھ فون پر پروگرام بنا رہی تھی ناں، دس بجے یہاں جمع ہوں گے، ساتھ لنچ کریں گے وغیرہ۔'' اس نے یاد دلایا تو ارما اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔

''میں نے سوچا اگر لنچ تک کا پروگرام ہے تو ہو سکتا ہے چار بجے میرے آنے تک آپ واپس جا چکی ہوں، پھر منانے کے لئے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے آپ کو۔'' وہ بہت کھل کر بڑے ہی پرسکون انداز میں بات کر رہا تھا، ارما کو اپنے پورے دن کے رویے پر جی بھر کر افسوس ہوا۔

''سوری مبین، مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔''

''ارے یہ سوری ووری نہ کیا کریں، آپ تو بس غصہ کرتی، ناراض ہوتی ہی اچھی لگتی ہیں۔''

''پتہ نہیں کیوں مجھے اتنا غصہ آ جاتا ہے۔'' وہ خود پر خفا ہونے لگی۔

''نہیں خیر، میں تو یونہی کہہ رہا تھا، آپ کی شخصیت کے اور بھی بہت رنگ ہیں، جو آپ پر خوب سجتے ہیں، بتاؤں۔'' وہ اب شوخی پہ اتر آیا تھا، مبین کے ایسے انداز اسے اور بھی بوکھلا دیتے تھے۔

''میں جاتی ہوں۔''

''یہ بھی لیتی جائیں۔'' مبین نے بھی اس کی دیکھا دیکھی ایک چھوٹا سا گلدستہ اکٹھا کر لیا تھا، جسے لئے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''ارے واہ، پکوڑے بن رہے ہیں۔'' ارما کچن میں آئی تو سامنے شمسہ کام میں مصروف نظر آئی۔

''جی باجی، فہد بھائی کہہ رہے تھے کہ باہر موسم اچھا ہے، اس لئے پکوڑے بنا لوں۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن تم ہٹو، میں خود بناتی ہوں۔'' وہ دوپٹے کی گرہ لگا کر آگے آئی اور شمسہ جان چھوٹ جانے پر شکر پڑھتی باہر نکل گئی۔

''شمسہ خاتون، چائے اور پکوڑوں کی مقدار بڑھا دو، مہمان آئے ہیں۔'' صبا نے کچن میں جھانکے بغیر ہانک لگائی تو وہ غصے سے دروازے میں آئی۔

''شمسہ کی بچی، یہاں میں ہوں۔''

''اوہ۔'' وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر کھلکھلائی۔

''میں سمجھی شمسہ ہے۔''

''اچھا چھوڑو، کون مہمان آئے ہیں؟''

''وہ نانو امی اور مبین بھائی آئے ہیں۔''

''مبین!'' اس کا بے ساختہ دل دھڑکا، کتنے دن ہو گئے تھے اسے دیکھے ہوئے، کچن میں طویل قیام کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس نے شمسہ کو آواز دی۔

''تم ہی سنبھالو یہاں کا کام، میں نانو سے ملنے جا رہی ہوں۔'' وہ بلاوجہ اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرنے لگی، پھر خود ہی جھینپ گئی کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نیا سوٹ پہنا

تھا، باندھنے کی نیت سے بال ہاتھ میں لئے لیکن وہ ابھی تک گیلے تھے، لہٰذا یونہی کھلا چھوڑ کر لان کا رخ کیا، لیکن وہاں تو صرف نانو اور امی ہی بیٹھے دکھائی دیے، تو یعنی وہ چلا گیا، پچھلی مرتبہ بھی مبین نے یہی کیا تھا، وہ سست روی سے آگے آئی۔

''چائے نہیں لائی تم؟'' آمنہ نے اسے دیکھا۔

''جی وہ شمسہ لا رہی ہے۔''

''میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ مبین اندر فہد کے روم میں ہے، اس کا کمپیوٹر خراب تھا تو مبین کو دکھانے لے گیا، تم اماں کی چائے یہاں سے کر اس کی کمرے میں بھجوا دینا۔'' وہ روانی سے بتا رہی تھیں، ارما جی اچھا کہہ کر فوراً پلٹی، چائے کی ایک ٹرے شمسہ کے ہاتھ لان میں بھیج کر دوسری خود اندر لے آئی، مبین نے ایک فرصت بھری شوخ نگاہ کے حصار میں اسے لیا لیکن وہ فہد کے خیال سے نظر چرا گئی۔

''باہر اتنا اچھا موسم ہے اور اس نے آپ کو اندر لا بٹھایا۔'' ٹرے میز پر رکھ کر وہ سامنے ہی دو زانو بیٹھ گئی۔

''موسم تو دل کا اچھا ہونا چاہیے، پھر سب اچھا ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو ارما نے گھبرا کر فہد کی طرف دیکھا جو ہیڈ فون لگائے کمپیوٹر ٹیبل کے آگے جما ہوا تھا، وہ قدرے تسلی سے چائے بنانے لگی، مبین نے ایکبار پھر اسے دھیان سے دیکھا، اورنج اور آتشی پھولوں والے پرنٹ میں وہ بہت فریش اور خوبصورت لگ رہی تھی، گیلے بال بار بار شانوں پر آ رہے تھے، گھنی کالی پلکوں کا سایہ گلابی گالوں پہ آ جا رہا تھا، کچھ لمحوں کی گرفت میں شدت سے سکڑا، ارما کو کھونے کا ڈر جیسے اس لمحے دل سمیت پورے ماحول پر طاری ہو گیا، اگرچہ کچھ حقوق محبت سے بھی مشروط ہوتے ہیں، جیسے یہ احساس بہت قیمتی، بہت سبک تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے حوالے سے خواب بنتے تھے، ایک دوسرے کو سوچتے، محسوس کرتے، آس پاس ہونے کے خیال سے سرشار رہتے تھے، لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ اس کی کچھ نہیں تھی، دل لاکھ بے ایمانیاں کر لے دماغ قائل تھا کہ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت میں ٹھہراؤ تب تک نہیں آ سکتا جب تک تقدیر کی مہربانی کا یقین نہیں ہو جاتا، اس لمحے پوری شدت سے اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ارما کو مانگا، ماحول میں ایک سکون سا پھیلا، مبین نے آرام دہ حالت میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی، ارما نے چائے کا کپ آگے بڑھایا، مبین کی عین سامنے موجودگی کا احساس اسے نروس کر رہا تھا، وہ اس کیفیت سے مزا لینے لگا کچھ کچھ احساس فخر بھی۔

''مبین بھائی میں اسکرو ڈرائیور لاتا ہوں، شاید سی پی یو کھولنا پڑے۔'' فہد کہہ کر باہر چلا گیا۔

''اللہ بھی کتنا مہربان ہے ناں۔'' وہ شوخی سے تھوڑا آگے ہوا تو ارما نے گھبرا کر سر جھکایا۔

''آج ہمارے ساتھ ہی چلیں۔''

''آج۔'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''ایسے مت دیکھا کرو، میں سب بھولنے لگتا ہوں۔'' وہ ایکدم ہی لہجہ بدل گیا، جس پر ارما ہمیشہ کی طرح گڑبڑا گئی، فہد واپس آیا تو مبین اٹھ کر مونیٹر کے سامنے بیٹھ گیا۔

''ابھی نہیں کھولنا شاید کام بن جائے۔'' وہ کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا، فہد اس کے پیچھے کھڑا غور سے اسکرین کو دیکھ رہا تھا، ارما نے اپنی توجہ مبین کی طرف مبذول کی، سفید کاٹن کے شلوار سوٹ میں وہ معمول سے زیادہ ہینڈسم لگ

رہا تھا، وہ اسے دیکھتے ہوئے کھو گئی، کچھ عرصہ پہلے تک کیسا اجنبی سا لگتا تھا اور اب...... ہر بات سے پہلے اس کا دھیان، ہر کام سے پہلے اس کا خیال، محبت بھی کیا دن دکھاتی ہے، اچھا بھلا بندہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے، وہ اپنے آپ میں مسکرا دی۔

بالوں میں انگلیاں پھیرتے، مبین نے یونہی ایک سرسری نگاہ اس طرف پھیری تو وہ نروس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور خواہ مخواہ برتن سمیٹنے لگی۔

''آؤ فہد دیکھ لو، میرا خیال ہے کام ہو گیا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بس یہ دیکھ لینا تمہاری اہم فائلز نہ اڑ گئی ہوں۔''

''تھینکس مبین بھائی، ویسے امید ہے ڈیٹا محفوظ ہو گا۔'' اس نے فوراً ہی سیٹ سنبھال کر انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔

''اوکے میں ذرا آنٹی وغیرہ کی طرف چلتا ہوں۔'' وہ چابی اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا جہاں سے ارما ٹرے لئے اسی وقت باہر نکل رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی تھیں۔'' کوریڈور میں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مبین نے نیچی آواز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے پکڑا جاتا ہے۔''

''بعد میں بتاؤں گی۔'' اس کے لبوں پہ شرگیں مسکراہٹ پھیلی۔

''بعد میں کب؟'' مبین کا دھیما لہجہ قدرے سرگوشی میں بدلا۔

''پلیز مبین۔'' وہ اس کے تنگ کرنے سے گھبرا گئی۔

''اوکے بابا۔'' وہ ہنستے ہوئے کوریڈور کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا تبھی کھلے گیٹ سے ایک گاڑی اندر داخل ہو کر پارکنگ میں آن کر رکی، لان میں بیٹھے اعظم انکل تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے۔

سادہ بلیک شرٹ اور بیج براؤن پینٹ میں ملبوس وہ دراز قد ہینڈسم لڑکا بلاشبہ بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا، مبین آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ ارما کچن میں برتن رکھ عین اسی وقت برآمدے میں آئی، اتفاقاً ہی دونوں اس وقت ساتھ ساتھ کھڑے تھے، سن گلاسز اتارتے ہوئے سعد نے ارما اور اس جاذب نظر پرکشش اجنبی کو خاصے اچنبھے سے دیکھا، مبین بجائے لان کی طرف جانے کے اخلاقاً ادھر بڑھ گیا۔

''یہ مبین ہے، خدیجہ آنٹی یعنی میری ساس صاحبہ کے ہاں آج کل مقیم ہے، ابھی انہی کو چھوڑنے ہی یہاں آیا ہے۔'' اعظم صاحب نے بلاوجہ ایک وضاحتی تعارف دیا۔

''اور یہ سعد ہے، میرا اکلوتا پیارا بھتیجا۔'' انہوں نے محبت سے سعد کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

''نیورو سرجن ہے ماشاءاللہ۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' مبین نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور تینوں نے لان کی رخ کیا جہاں آمنہ اور خدیجہ بیگم بیٹھی تھیں، مبین نے بائیں جانب برآمدے کی طرف سرسری نظر ڈالی، ارما ابھی تک وہیں کھڑی تھی اور جانے کیوں کسی مخمصے کا شکار نظر آئی، مبین نے ابرو اٹھا کر بے چینی کی وجہ دریافت کی تو اس نے پھیکا سا ہنس کر نفی میں سر ہلایا۔

''سوری انکل! بنا بتائے اچانک ہی چلا آیا۔''

''ارے کیسی باتیں کر رہے ہو، اپنے گھر

آنے کے لئے بھی کوئی اجازت لیتا ہے۔" خدیجہ بیگم اور آمنہ سے مل لینے کے بعد وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"یہ کچھ سامان امی نے ارما کے لئے بھیجا ہے، میرے ماموں انگلینڈ سے آرہے تھے، شاید وہیں سے منگوایا ہے۔" اس نے دو خوبصورت گفٹ پیک سامنے ٹیبل پر رکھے۔

"میں ہاسپٹل جانے کے لئے نکلا تھا، آپ تو جانتے ہیں یہاں آنے کے لئے بس تھوڑا سا روٹ بدلنا پڑتا ہے، ویسے بھی مجھے تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔" وہ پھیل کر بیٹھتے ہوئے ہنس پڑا۔

"بالکل غلط۔" اعظم صاحب نے شوخی سے ٹوکا۔

"یہاں آنے کے لئے تمہیں بہانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے مزید کہا تو سبھی ہنسنے لگے۔

"مجھے اجازت آنٹی۔" مبین نے بمشکل بولنے کا موقع نکالا۔

"اتنی دیر سے وہ بس یہی کہنا چاہ رہا تھا، آپ واپسی کے ٹائم مجھے کال کر لیجئے، کھانے تک یہیں رہتے مبین۔" آمنہ نے فوراً ٹوکا۔

"بلا وجہ آنے جانے کی تکلیف اٹھانا۔"

"نہیں شکریہ آنٹی، آفس کا کافی سارا کام کرنا ہے، ابھی بھی فہد کی وجہ سے رک گیا تھا۔" اس نے فوراً اعظم انکل کی طرف مصافحے کا ہاتھ بڑھایا جنہوں نے مروتاً بھی رکنے کا نہیں کہا تھا، یوں بھی نہ تو مبین ایسی توقع کر رہا تھا اور نہ ہی مزید یہاں رکنے کی کوئی خواہش ہو رہی تھی، اعظم صاحب کی تیوری کے بل اور سعد کی آنکھوں میں واضح ناگواری کا تاثر اس سے چھپے نہیں تھے، گیٹ کو جاتے ہوئے برآمدے کی طرف دیکھا، ارما اب وہاں نہیں تھی، سعد سے بنا ملے ہی وہ واپس اندر چلی گئی تھی، مبین نے پریشانی سے نچلا لب چبایا، شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، سعد جیسی نیچر کے لوگ جو خود کو سراپا چاہے جانے کا حقدار سمجھتے ہیں، ہرگز ایسی بے رخی کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے، وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

"جانے لوگ مجھے شکلوں سے خوبصورت اور بدصورت کیوں نہیں لگتے، کیوں ان کی عادات اور اندرونی کیفیات مجھے ان کے چہروں پہ ثبت نظر آتی ہے، کبھی بہت معمولی بہت عام سی صورتیں کسی دیوی، دیوتا کے سروپ سے کم نہیں لگتیں اور کبھی فرصت سے بنائی گئی حسین و جمیل شکلیں بھی دل جلا کر خاک کر دیا کرتی ہیں۔"

سعد اللہ سے بس ایک مصافحے اور چند جملوں کے تبادلے نے طبیعت عجیب مکدر سی کر دی تھی، ایک بوجھل پن تھا جو پورے ماحول پر حاوی ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ارما جیسی معصوم، اندر باہر سے ایک، اپنی معمولی سی خوشی اور ہلکی سی ناراضی تک نہ چھپا سکنے والی انتہائی سادہ طبیعت لڑکی کیسے اس عاجزی اور سادگی سے عاری، پر رعونت پرسنالٹی کے مالک سعد سے نباہ کر پائے گی؟ اسٹیئرنگ مضبوطی سے تھامے، غائب دماغی سے گاڑی چلاتے وہ ایک بار پھر انتہائی سست اور ڈھیلا سا ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

"نفیسہ خالہ کہہ رہی ہیں اگر پانچ منٹ میں فریال اور صبا کمرے سے باہر نہ نکلیں تو آگے سے دروازہ لاک کر دینا۔" ارما نے باآواز بلند کہا اور الٹے پاؤں واپس ہوئی، آج منصور کی مہندی کا فنکشن تھا، باہر لان میں کافی سارے مہمان آ چکے تھے، وہ اور تارا کافی دیر سے تیار ہو کر مہمانوں کو اٹینڈ کر رہی تھیں، لیکن فریال اور صبا کو اپنے اپنے ہیئر اسٹائل کے مسئلے نے تنگ کر رکھا

تھا، حتی کہ اب وہ دونوں رو دینے والی ہو گئی تھیں۔

''آج ذرا ہم سے دور دور ہی رہنا۔'' مبین اچانک کہیں سے نکلا تھا، مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک گئی۔

''جی......؟'' وہ مبین کے جملے کا مطلب نہیں سمجھی تبھی اس نے آنکھوں سے اپنے اور اس کے کپڑوں کی طرف توجہ دلائی تب پہلی مرتبہ ارما نے ڈریسنگ کی طرف دھیان دیا، اس نے آج کے فنکشن کے لئے اسکائی بلو ڈریس منتخب کیا تھا جس پر پیچ کلر کا ہلکا نفیس کام کیا ہوا تھا، حسن اتفاق سے مبین بالکل اسی شیڈ کی اسکائی بلو شرٹ اور پیچ سے ملتی جلتی لائٹ براؤن پینٹ پہنے ہوئے تھا۔

''کوئی ناواقف کہیں نیو لی میرڈ کپل سمجھ کر مبارکباد نہ دینے لگ جائے، میں تو ویسے شگون سمجھ کر قبول بھی کر لوں گا، ایڈوانس کے طور پر۔'' وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔

''کوئی اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ محض ہم رنگ لباس دیکھ کر بنا تصدیق مبارک دینے لگ جائے۔'' ارما نے خفگی سے دیکھا۔

''اچھا یقین نہ سہی، شک میں تو پڑ سکتا ہے، اگر ایسا کچھ اتفاق کل کے فنکشن میں بھی ہو گیا پھر تو سمجھیں گنجائش ہی نہیں شک کی۔'' ہاتھ پیچھے کمر پہ باندھتے ہوئے وہ بھرپور شوخی سے آگے کو ہوا۔

''ارے کیا سچ مچ۔'' وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی۔

''آپ کل کیا پہنیں گے؟''

''یہ تو کل ہی پتہ چلے گا۔''

''تو ٹھیک ہے، اللہ کرے کہ یہ حسین اتفاق بھی ہو ہی جائے۔'' اس مرتبہ وہ کھل کر مسکرائی۔

''کم از کم اس سعد اللہ کے مزاج تو ٹھکانے آئیں گے، پتہ نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو۔''

''ارے یہ غضب نہ کرنا، یوں مجھے اعظم انکل کی گولی کا شکار بنانا چاہتی ہیں۔'' اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو ارما زور سے ہنسی۔

''خوف کا عالم اگر یہ ہے تو فیوچر میں آپ سے اچھی امید لگانا خاصا مشکل لگ رہا ہے۔''

''سولہ آنے درست۔'' مبین نے فوراً اپنے کانوں کی لوؤں کو چھوا۔

''باغی کا خطاب پانے کا یہاں کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گیا اور وہ اس کے الفاظ کی گہرائی ناپتے ہوئے اچانک کچھ متفکر ہو گئی، جانے کیوں کبھی کبھی وہ کچھ ایسا کہہ جاتا کہ ارما حیران بلکہ کسی حد تک پریشان سی ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

خدیجہ حیات کی خواہش کے عین مطابق منصور کی دلہن کے بابرکت قدم میکے سے سیدھے سسرال میں ہی پڑے تھے، مدیحہ اپنی خوبصورتی کی چکا چوند سے دلوں میں گھر کیے جا رہی تھی، منصور کے رنگ بھی آج کے دن دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے، دلہا بن کر خوب ہی نکھار آیا تھا، شرمیلی ہنسی لبوں پر سجائے وہ مدیحہ کے پہلو میں بیٹھا سب کی شوخیوں اور شرارتوں کے جواب دے رہا تھا۔

فریال اور ارما نے آج کے لئے فراک کا انتخاب کیا تھا، رنگ البتہ الگ الگ تھے، فریال نے گہرا جامنی رنگ لیا تھا جبکہ ارما سبز رنگ کی فراک پہنے ہوئے تھی، اس کی متلاشی نگاہیں مبین کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن بجائے اس کے سعد سامنے آ گیا بلکہ اسے ڈھونڈتا ہوا ہی آیا۔

''آؤ تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں۔'' بے تکلفی سے کہتے وہ اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

''یہ ہے میری سویٹ کزن ارما'' سعد نے باقاعدہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تعارف کروایا جس پر وہ بری طرح بدکی تھی سعد نے ہاتھ نہیں ہٹایا۔

''اور یہ مہوش ہے، یہ ان کے ہزبینڈ عمر، مہوش میرے ساتھ ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہیں اور اتفاق سے آپ کی نئی ممانی کی دور کی رشتہ دار۔'' اس نے ارما کی طرف دیکھ کر اس کا بھی تعارف کروایا۔

''او تو یہ ہیں ارما۔'' مہوش نے اپنی گول گول آنکھیں گھمائیں۔

''بھئی مجھے تو بڑا اشتیاق تھا تم سے ملنے کا۔''

''کہو پھر کیسی لگی میری پسند۔'' وہ محبت سے ارما کو دیکھتے ہوئے داد طلب کرنے لگا۔

''ماننا پڑے گا ڈاکٹر صاحب، آپ کی جوڑی لاکھوں میں ایک کہلائے گی۔'' مہوش نے مزے سے تبصرہ کیا تو ارما کے چہرے پر پریشانی کے آثار جھلکنے لگے، ان کے کھلے تبصروں پر اس کا دل بے چین ہو گیا، گھبرا کر آس پاس پہ نظر ڈالی تو بس ذرا فاصلے پر مبین کسی سے بات کرتا دکھائی دیا۔

''اُف۔'' ارما نے پریشانی سے لٹ کاٹے، سعد کا مضبوط ہاتھ ابھی تک اس کے کندھے پر تھا، مبین ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر سنجیدگی سے رخ موڑ گیا۔

''ایکسکیوز می، مجھے امی بلا رہی ہیں۔'' وہ معذرت کرتی فوراً وہاں سے ہٹی، اپنی متلاشی نگاہیں اردگرد پہ دوڑائیں لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔

یقیناً مبین کو بہت برا لگا تھا، بات ہی ناراض ہونے کی تھی، سعد کے بے ہودہ انداز ہرگز اگنور کرنے لائق نہیں تھے، وہ خود ہی مبین کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تھی لیکن کبھی تو وہ موبائل فون کان سے لگائے کسی سے بات کرتا دکھائی دیتا اور کبھی فرید کے ساتھ کسی معاملے کو ڈسکس کرتے پاس سے گزر جاتا، ارما اس سے بات کرنے کے لئے لاؤنج اور پچھلے لان تک ہو آئی لیکن بات کرنے کا مناسب موقع نہ دیکھ کر واپس پلٹ آئی، یوں بھی منصور ماموں فوٹو گرافی کے لئے بار بار باقی سب کو بلا رہے تھے، رہنا تو ارما بھی سب کے بیچ چاہتی تھی جہاں سب ہنسی مذاق میں مشغول تھے، لیکن مبین کی ناراضی ایک پل کو چین نہیں لینے دے رہی تھی اور اب تو کافی سارا وقت گزر گیا تھا، مہمان کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اب واپس جانے لگے تھے، پر وہ ظالم جانے کہاں جا چھپا تھا، ارما کی نگاہیں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھکنے لگیں۔

''اچھا بھابھی ہمیں اجازت۔'' ارما نے مڑ کر دیکھا، رابعہ چچی اس کی امی سے مل رہی تھیں۔

''او کے ارما چلتے ہیں اب۔'' وہ اسے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

''دیکھو اتنی مصروف تھیں تم، بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، آج تو ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''تھینک یو چچی۔'' وہ سرخ ہو گئی۔

''صرف تھینک یو سے کام نہیں چلے گا، تصویر بھی بنوانا پڑے گی۔'' موبائل کیمرے کو سیدھا کرتے ہوئے سعد اللہ اچانک ہی گفتگو میں کودا تھا، رابعہ نے مسکرا کر ارما کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے قریب کھڑا کیا، جیسے تصویر بنوانے کے لئے تیار ہوتے ہیں، ارما نے بھی مسکرا کر تصویر بنوالی، یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب موبائل کیمرا ماں کے ہاتھ میں دے کر وہ ارما کے

پہلو میں آیا تو اس سے برداشت نہیں ہوا، ابھی تو پہلا غصہ بھی کم نہیں ہوا تھا، ایک ساتھ تصویر بنوانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''بس کافی ہے چچی۔'' اس نے کیمرے کے آگے ہاتھ کیا۔

''میری تصویریں ویسے بھی اچھی نہیں آتیں۔'' بنا ان کا رسپانس دیکھے وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی، رابعہ نے بے ساختہ سعد کو دیکھا جس کی کشادہ پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہوگئی تھیں۔

''اٹس او کے سعدی، شاید اسے شرم آرہی تھی۔'' غصے سے سعد کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں لیکن ماں کی وجہ سے بولا کچھ نہیں۔

''سب سمجھ رہا ہوں ارما رباب اعظم اور خوب سمجھا دوں گا تمہیں بھی۔'' وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم ہوگیا۔

''جانے ایسا کیوں ہوتا ہے، جن لمحوں کی آمد کا ہم شدت سے انتظار کرتے ہیں، ہاتھ آنے پر وہ بے رنگ اور پھیکے سے پڑ جاتے ہیں۔''

ماموں کی شادی کے حوالے سے ارما نے معلوم نہیں کیسے کیسے خواب بنے تھے، کچھ تو روشنیوں، رنگوں اور گیتوں سے متعلق تھے اور کچھ اس نے ایک سرد آہ کھینچی اور کچھ اس کٹھور سے متعلق تھے جسے اپنے کام دھندوں سے فرصت نہیں تھی۔

حالانکہ بلیک پینٹ اور بلو جینز میں آج اس کی پرکشش شخصیت اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی لیکن وہ تو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پائی تھی اور یہ سب ہوگیا، وہ بجھے دل کے ساتھ پچھلے لان میں آگئی جہاں کچھ دیر پہلے مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا، لیکن اب تو فنکشن ختم ہوگیا تھا، یہاں بھی اب مکمل صفائی نظر آرہی تھی، فریال اور خالہ وغیرہ مدیحہ کو اس کے کمرے میں لے گئی تھیں، منصور ماموں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے اور مبین کی دادی اور بھابھی یعنی عمیر بھائی کی مسز نانو امی کے کمرے میں بیٹھی تھیں، وہ خود البتہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مبین ویٹرز وغیرہ کو فارغ کر کے پچھلے گیٹ سے لان میں داخل ہوا، ایک طائرانہ نظر لان میں ڈال کر سب کچھ او کے ہونے کی تسلی کی اور آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رک گیا، ستون سے شانہ ٹکائے وہ شاید تارے گننے کا اہم فریضہ انجام دے رہی تھی، اس کی ساری تھکن جیسے پل میں اڑن چھو ہوگئی تھی، دل چاہا بنا اسے ڈسٹرب کیے دیکھتا ہی رہے، جس کا ارتکاز ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا اور پتہ نہیں وہ یہاں کیوں کھڑی تھی اس لان میں، مبین کو یاد آنے لگا کہ فنکشن کے دوران وہ غالباً اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی تبھی اس کے آس پاس تھی یا شاید پیچھے پیچھے، ارما کی نظر اسی وقت مبین پر پڑی، پہلے تو وہ بے طرح چونکی پھر فوراً دو اسٹیپ نیچے اتری، موبائل فون اور چابیاں جیب میں رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھا

''آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں، خیریت؟''

''سوری مبین! وہ سعد زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا، میں نے منع بھی کیا لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔'' وہ عجلت میں بولے چلی گئی۔

''جی......؟'' وہ کیا کہہ رہی تھی، مبین کے خاک پلے نہیں پڑا۔

''اگلی بار میں صاف صاف اسے کہہ دوں گی کہ وہ مجھ سے اتنا فرینک نہ ہوا کرے، حد ہوتی ہے۔'' مجرموں کی طرح شرمندہ شرمندہ سر جھکائے وہ مزید بولی تو مبین نے ڈھیلا سا ہو کر سانس کھینچی، اب وہ سمجھ گیا کہ ارما کیا کہہ رہی

ہے، سعد اللہ کو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کسی سے ملواتے اس نے بھی دیکھا تھا لیکن جیسا ارما سوچ رہی تھی ایسی کوئی بات بہر حال اس کے دماغ میں نہیں آئی تھی، البتہ اب دل میں شرارت چٹکیاں لینے لگی، اس نے محض چند سیکنڈز لئے سوچنے میں اور فوراً چہرا سنجیدہ کیا۔

''بہتر تو یہ تھا کہ آپ کافی پہلے اسے سمجھا چکی ہوتیں، بائی دی وے ایسا بھی کیا کہہ دیا اس نے جو آپ کی اب تک سٹی گم ہے، اتنا خشک اور روکھا لہجہ۔'' ارما نے گھبرا کر تھوک نگلا۔

''وہ اس کی دوست تبصرہ کر رہی تھی کہ ہماری جوڑی لاکھوں میں ایک ہے اور پتہ نہیں کیا کیا۔'' وہ پھر سے الجھ گئی۔

''حیرت ہے، اتنی جرأت بنا کسی کمٹ منٹ کے تو نہیں آتی، آخر کس کی شہہ پر وہ اتنا شوخ ہو رہا تھا۔''

''مجھے نہیں پتہ، میں تو......'' اس سے زیادہ وہ نہیں بول پائی، بھرایا لہجہ چھلک پڑا اور وہ سسکنے لگی۔

''اوہ نو۔'' وہ اپنے مذاق پر فوراً پچھتایا۔

''ارے میں مذاق کر رہا تھا، پلیز ارما بات سنو۔'' وہ دو قدم بے ساختہ آگے آیا لیکن سمجھ نہیں آئی کہ رونے سے کیسے روکے۔

''ادھر دیکھو ارما، پلیز دو منٹ میری بات سن لو، کوئی آ جائے گا، پلیز میری بات سن لو۔'' اس نے منت کی تو ارما نے آنکھیں صاف کر کے چہرا اٹھایا۔

''کس نے کہہ دیا کہ میں ناراض ہوں، ارے بابا، نہ پہلے نہ اب میں تو خفا تھا ہی نہیں۔''

''آپ ناراض نہیں تھے؟'' ارما نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں تو آپ نے کیسے سمجھ لیا، ابھی بھی صرف آپ کی گھبراہٹ دیکھ کر شرارت کر رہا تھا۔''

''اور اتنی دیر سے جو میں آپ سے بات کرنے کے لئے موقع تلاش کر رہی تھی تو آپ کبھی ادھر سے گزر جاتے کبھی ادھر چلے جاتے،''

''پاگل ہو بالکل۔'' مبین نے اپنی حسین چمکتی نگاہوں میں بھرپور شوخی سمو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ جھینپ کر مسکرانے لگی، یہی انداز ہی کافی تھا حقیقت جتانے کے لئے۔

''ہاں میں نے دیکھا تھا سعد اللہ کو، اس کا فری ہونا مجھے بھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ ناپسندیدگی صرف سعد اللہ کے لئے تھی، تم سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں، جس نے محبت کا مان بخشا ہو اس پر بے اعتباری نری ناقدری ہے محبت کی، محبوب کی اور وہ بھی ایسا معصوم اور پیارا محبوب۔'' وہ اب سینے پہ ہاتھ باندھے ستون سے ٹیک لگائے بہت آرام کی حالت میں کھڑا تھا، جیسے دل ہر ڈر خوف سے آزاد ہو، جیسے کسی بہت اپنے کی موجودگی کا احساس ہر غم ہر پریشانی پر حاوی ہو جائے، ارما نے پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا، توجہ سے اس کی طرف دیکھتا مبین مسکرانے لگا۔

''جانا ہے؟''

''ہوں۔''

''جائیں لیکن ایک بات یاد رکھیں، ایسی معمولی باتوں کی ہماری محبت میں کوئی گنجائش نہیں ہے، بس اتنا ڈر مت جایا کرو، میں مغرور ہونے لگتا ہوں۔'' مبین کی آنکھوں میں اتنی روشنی تھی کہ تاب لانا مشکل تھا، ارما تیز دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

نایاب جیلانی

چودھویں قسط کا خلاصہ

نیل بر، حمت کو ساتھ لے کر سرکاری بنگلے پہ امام فریدے سے ملنے کو جاتی ہے، امام فریدے، نیل بر کو دیکھ کر برہمی کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب اس کی نگاہ حمت پہ پڑتی ہے تو اس کے تاثرات بدل جاتے ہیں۔

ہیام کو اپنے گھر پیسے بہت ارجنٹ بھجوانے ہیں، سسٹر بیہ کے مشورے پہ وہ اسامہ کی خدمات حاصل کرتا ہے۔

کالج میں نومی کا ٹکراؤ شانزے سے ہوتا ہے اور کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔

نیل بر کی بنگلے پہ جانے کی خبر بٹو محل کی دیواروں کو ہلا دیتی ہے، نیل بر کا اعتراف محبت صندیر خان کو سنگین فیصلے کی انتہا پہ لے جاتا ہے۔

صندیر خان، سردار بٹو کو وارننگ دیتا ہے، بیٹی کو سمجھا لو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔

نشرہ ولید کی ''فرمائش'' اور ''بدلاؤ'' پہ تشویش کا شکار ہے۔

اسامہ، ہیام کی امانت لے کر اس کے گھر پہنچتا ہے تو وہاں اس کا بے حد اچھا استقبال ہوتا ہے، اُدھر عشیہ کو دیکھ کر اسامہ کے من کی مراد بر آتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

پندرہویں قسط

اسامہ اس استقبال کی توقع ہرگز نہیں رکھ رہا تھا۔
اسے امید نہیں تھی عشیہ کی سخت دل مورے جان اتنے اخلاق کا مظاہرہ کریں گی، لیکن بات تو وہیں آئی تھی، اسامہ اس وقت کوئی عام بندہ تھوڑی تھا، ہیام کا دوست تھا اور ان کے گھر میں ''مہمان خاص'' کی حیثیت رکھتا تھا۔
تقدیر کے اس کھیل میں جو ''ملاپ'' کا رستہ نکلا تھا وہ اس قدر حیران کن تھا جس پہ نہ عشیہ کو یقین آ رہا تھا اور نہ ہی اسامہ کو۔
اس وقت وہ تقدیر کی مہربانی پہ متعجب بیٹھا قدرت کے نرالے رنگ دکھانے پہ دل کی گہرائیوں سے سجدہ ریز تھا۔
کبھی ایسا بھی ممکن ہوتا ہے؟
کوئی سرراہ ٹکراتا ہے اور عمر بھر کا حاصل بن جاتا ہے۔
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے؟
کوئی عمر بھر کی پونجی سرراہ لٹا آتا ہے۔
یہ قدرت کے ہی نرالے کھیل تھے۔
اسامہ پیچھے نگاہ ڈالتا تو حیران رہ جاتا، عشیہ کا پل پہ ٹکرانا، ایک دو اتفاقیہ ملاقاتیں، پھر عشیہ کے گھر تک مورے کی دوائیاں لے کر آنا اور بعد میں واپسی کا سفر۔
لاہور جاتے ہوئے اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ دوبارہ کبھی عشیہ سے ملاقات ہوگی، محبت کی وہ کونپلیں جو اتفاقیہ دو ملاقاتوں میں پنپنے لگی تھیں ایک دم ہی مرجھا گئیں، اسے لگتا تھا، عشیہ کے گھر کے ہر رستے میں تقدیر کھڑی ہے۔
اسے اندازہ ہی نہیں تھا، یہی تقدیر ہیام کی صورت میں ایک پل، ایک رستہ، ایک رہگزر تعمیر کر دے گی، وہ اس وقت مورے کے کمرے میں موجود تھا اور انہیں رقم کا لفافہ دے چکنے کے بعد اجازت طلب کر رہا تھا جب ہیام کی بہن عمکیہ چائے کے لوازمات لے آئی، وہ اتنا تکلف دیکھ کر شرمندہ ہو گیا تھا۔
''اس کی کیا ضرورت تھی آنٹی؟''
اس نے بہت سوچ سمجھ کر مورے کے لئے لفظ آنٹی کا چناؤ کیا تھا، وہ اسے چائے پیش کرتی ذرا چونک گئی تھیں۔
''آنٹی؟'' انہوں نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا، پھر ٹوک کر بے ساختہ بولیں۔
''یہ انگریزوں کے رشتے ہیں، آنٹی، انکل، ممی، ڈیڈی...... ان میں اپنائیت کہاں آتی ہے، انگریز چلے گئے پر اپنی بہت سی چیزیں چھوڑ گئے، جن میں سرفہرست پہناوا اور زبان ہے، نہ بیٹا! مجھے آنٹی وانٹی نہیں پسند...... اور انگریزوں سے مجھے بڑی نفرت ہے، تم مجھے ہیام کی طرح ''مورے'' بلایا کرو، ہیام کی ماں ہوں تو تمہاری بھی ماں ہوئی، تھوڑی زبان کی کھردری ہوں، پر دل کی بری نہیں، لیکن میری بیٹیاں اس بات کو نہیں سمجھتیں، خاص کر عشیہ، بڑی لمبی زبان ہے اس کی۔'' مورے نے انگور کی تھالی اس کی طرف بڑھائی اور ساتھ بے لاگ سا تبصرہ کیا، ابھی وہ

مورے سے انگریزوں کے ساتھ نفرت کا سبب پوچھنا چاہتا ہی تھا جب وہ بات کو دوسری طرف لے گئیں، یعنی عشیہ کی لمبی زبان کی طرف، اب شاید اسامہ اپنے ازلی منہ پھٹ انداز کی وجہ سے عشیہ کی لمبی زبان پہ بحث بھی کر لیتا اور بڑی معصومیت سے پوچھ ہی لیتا کہ کس قدر لمبی؟ لیکن مروتاً خاموش ہی رہا، کیا خبر مورے کو برا ہی لگ جاتا۔

''مورے! اسامہ کو چائے پینے دیں؟'' معاان کی بیٹی عمکیہ نے بے ساختہ انہیں تنبیہ کی تھی کہ مہمان کے سامنے مزید عشیہ کی ذات پہ گفتگو کرنے سے گریز ہی برتیں، یوں مورے چند منٹ تو خاموش ہی رہی تھیں لیکن عمکیہ کے اٹھتے ہی فارم میں آگئیں۔

''تم ہیام کو بتا دینا، یہ لور لور پھرتی ہے۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے خاصی راز داری سے بتایا تھا، اسامہ چونک گیا۔

''کون؟'' اس کا انداز بھی سرگوشیانہ تھا۔

''یہی عشیہ۔'' انہوں نے دبی آواز میں بتایا۔

''بے فکر رہیں، بتا دوں گا۔'' اس نے تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا، وہ انگور سے بھرپور انصاف کر رہا تھا، مورے جیسے مطمئن ہوگئی تھیں، وہ چائے پی کر اٹھا تو مورے حیران رہ گئیں۔

''تم کہیں جا رہے ہو؟ رکو گے نہیں؟''

''نہیں جی، میرا اسٹے ہوٹل روزگل میں ہے۔'' اس نے سعادت مندی سے بتایا تھا۔

''او...... اچھا، میں نے سمجھا واپس جاؤ گے۔'' وہ بے ساختہ خوش ہوگئیں۔

''میرا کام ہے یہاں، کچھ عرصہ تک آپ کے علاقے میں ہوں۔'' اسامہ نے نرمی سے کہا تھا۔

''پھر آؤ گے بہن کی شادی میں؟'' انہوں نے اشتیاق سے پوچھا تھا، اسامہ تو پہلے سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر اسے خیال آ ہی گیا تھا۔

''جی، کیوں نہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولا تھا۔

''اچھا...... پھر چکر لگاتے رہنا۔'' مورے نے سارا اخلاق نچھاور کرتے ہوئے اسامہ کے کندھے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

''آپ بھی کوئی کام ہوا تو بتائیے گا۔'' اندر آتی عشیہ کو دیکھ کر اس نے بے ساختگی سے کہا تھا، عشیہ نے بمشکل ہی اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی، وہ بڑا مودب بنا کھڑا تھا۔

''یہ میرا کارڈ رکھ لیں، اوپر نمبر لکھا ہے، ضرورت کے وقت خادم کو یاد کر لیجئے گا، میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' اس نے مورے کی طرف کارڈ بڑھایا تو انہوں نے عشیہ کو کارڈ تھما دیا، عشیہ نے بادل نخواستہ کارڈ پکڑ لیا۔

''وہ باہر باورچی آیا بیٹھا ہے، اس سے دیگوں کا معاملہ طے کر لیں۔'' اس نے لٹھ مار انداز میں مورے کو اطلاع دی تھی، وہ چپل پیروں میں اڑس کر فوراً باہر نکل گئیں۔

مورے کے جاتے ہی اسامہ پوری طرح سے عشیہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا، عشیہ نے اس کی آنکھیں پھاڑنے پہ بڑے رسان سے پوچھا تھا، کب سے مچلتے سوال کو بالآخر اس نے باہر نکال لیا

تھا۔

''یہاں تک آنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' وہ اسے دیکھتی قدرے متفکر تھی، اسامہ ہونٹوں کی تراش میں مسکان چھپائے کھڑا تھا۔

''جذبے سچے ہوں تو منزل دور نہیں ہوتی، میری نیت اور جذبوں کی سچائی کا اندازہ اسی بات سے لگا سکتی ہو۔'' وہ اترا کر بولا تھا، عشیہ اسے مشکوک انداز میں دیکھتی رہی۔

''مجھے یہ بتاؤ، تم میرے بھائی تک کیسے پہنچ گئے؟''

''ایں؟ میں کیسے پہنچ گیا؟'' وہ پوری طرح سے چونک گیا تھا۔

''یہ کہو، تمہارا بھائی مجھ تک کیسے پہنچ گیا۔'' اس نے فوراً بات کو ردوبدل سے سیدھا کیا تھا۔

''چلو ایسے ہی سہی۔'' عشیہ ان دونوں کی ''ملاقات'' اور ''ملاپ'' کا قصہ جاننا چاہتی تھی، اسامہ نے اسے پوری بات بتادی تھی جسے سن کر واقعی عشیہ حیران ہوئی۔

''یہ صورتحال تو فلمی سی بن گئی تھی۔'' اس کا انداز پرخیال قسم کا تھا۔

''اس سچویشن کو نیت اور اور جذبوں کی صداقت کہتے ہیں، خدا نے میری تم سے ملاقات کا وسیلہ بنایا ہے۔'' اسامہ نے چبا چبا کر جتایا تھا۔

''اچھا......اچھا۔'' وہ گڑبڑا گئی تھی۔

''اب نکلو یہاں سے۔'' اس نے جلدی میں کہا تھا، وہ نہیں چاہتی تھی عروفہ کہیں سے آنکلے اور انہیں گفتگو کرتا دیکھ لے اور پھر بات کا بتنگڑ بنا لے، جس میں وہ ویسے ہی ماہر تھی۔

''جاتا ہوں، نکال کیوں رہی ہو، ویسے ایک بات سن لو، مورے نے مجھے یہاں آنے اور جانے کا گرین سگنل دے دیا ہے۔'' وہ شوخی سے اس کی معلومات میں اضافہ کرتا نکل گیا تھا جبکہ عشیہ بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا، عروفہ نے بھی یہ منظر بڑے ہی دھیان سے دیکھا تھا اور اس کا چہرہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ سج گیا تھا، عشیہ نے اپنی ہی جھونک میں دھیان نہیں دیا تھا، وہ آج حقیقتاً بہت خوش تھی۔

☆☆☆

شاہوار کو دوبارہ وہ چہرہ دکھائی ہی نہ دیا تھا۔

اس نے بڑی دفع اپنے ہٹ سے کچھ آگے جانے کی کوشش کی تھی، جانے کون سی طاقت اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی تھی، وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکا تھا، اسی مقام پہ کھڑا تھا، جہاں پہ ایک نگاہ نے اسے روک رکھا تھا۔

اور پھر تھوڑا وقت آگے کی طرف نکلا تو شاہوار کو زندگی کے معمولات نے گھیر لیا تھا، زمینداری، کاروبار اور علاقے کی مصروفیات بے شمار تھیں۔

ان دنوں تو گھر کا نظام بھی بے ترتیبی کا شکار تھا، بٹومحل کے اندر کا ماحول ایسا نہیں تھا جو کسی طور بھی خوشگوار ہوتا۔

دراصل یہ ناخوشگواریت تب سے تھی جب بابا خان اپنی لاڈلی بیوی کی اولاد کو واپس لے آئے تھے، یہاں تک بھی ٹھیک تھا، لیکن اسے بے جا آزادی دے کر بابا خان نے ان سب کی غیرت کو

للکار رکھا تھا، اس کا شتر بے مہار پھرنا ہی انہیں گوارا نہیں تھا جب تک ایک اور طوفان امڈ آیا تھا۔
شاہوار اگر بڑی ہی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتا تب بھی صندیر خان کی غیرت اور غصے کے آگے بند ھ باندھنا آسان نہیں تھا۔
صندیر خان آگ تھا، سراپا آگ اور اس آگ میں نیل بر سردار بٹو بے خطر کود پڑی تھی۔
وہ جب سے اپنے ''ہٹ'' واپس آیا تھا مسلسل نیل بر کو سوچ رہا تھا، اس نے ایسا کیوں کہا؟ اور وہ اتنا آگے کیسے بڑھ آئی تھی؟ پھر شاہوار اس سروئیر کو سوچنے لگتا تھا، وہ شکل وصورت، انداز و اطوار سے ایسا نہیں دکھتا تھا جو خانزادوں کی عزت پہ نگاہ رکھ لیتا، کسی باوقار خاندان کا فرد لگتا تھا، جس کی روشن پیشانی پہ شرافت کا ستارہ چمکتا تھا، پھر نیل بر کیا یک طرفہ ہی اتنا آگے بڑھ آئی تھی؟ وہ سوچتا جارہا تھا، پریشان ہوتا جارہا تھا۔
معاً اسے ملازم نے صندیر خان کے آنے کی اطلاع دی تھی، صندیر خان بہت کم ہی ادھر آتا تھا اور اس وقت صندیر خان کا آنا خطرے سے خالی نہیں تھا، شاہوار فوراً ہی ملاقات کے روم میں پہنچ گیا تھا، وہاں صندیر خان موجود تھا، مضطرب سا، چلتا پھرتا، ٹہلتا اور غصے میں مٹھیاں بھینچتا، اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا، تانبے کی طرح تپ رہا تھا، شاہوار کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لئے رک گیا تھا۔
''تف ہے تیری غیرت اور مردانگی پہ، بٹو محل میں چنگاریاں اٹھ رہی ہیں اور تجھے خبر تک نہیں، احساس تک نہیں۔'' وہ غراتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا، شاہوار نے تحمل سے اس کا غصہ اندر آتارا تھا، پھر ملائمت سے بولا۔
''تو میں کیا کرسکتا ہوں؟ اور تم بھی غصے سے نہیں، ہوش مندی سے کام لو، جذباتیت سراسر نقصان دہ ہے۔''
''یہ آرام سے بیٹھ کر سوچنے کا وقت ہے؟'' وہ زہر خند ہوا تھا۔
''سوچنے سے ہی مسئلے کا حل نکلتا ہے، غصے سے نہیں، صندیر خاناں! معاملہ بہت حساس اور نازک ہے، بات عزت کی نہ ہوتی تو اب تک کچھ بھی کرسکتے تھے۔'' شاہوار کا تحمل قابل دید تھا۔
''یہی بات مجھے روک رہی ہے، ورنہ رات سے پہلے پہلے گولیوں سے اسے بھون ڈالتا۔'' صندیر خان نے نفرت سے کہا۔
''پھر وہی جذباتیت؟ مار دینے سے کیا حاصل ہوگا؟'' شاہوار نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔
''کم از کم عزت کا بھرم رہ جاتا۔'' صندیر خان کے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے، نیل بر کی خود سری کا خیال آتا تو اس کی غیرت پہ تازیانے پڑنے لگتے تھے۔
''ایسے بھرم نہیں رہتے، بلکہ زیادہ بدنامی ہوتی ہے، گنہ گار پہاڑی کے پچھلی طرف بنے قبرستان میں بنی قبروں کو کبھی فرصت میں دیکھ آنا، آج تک لوگ نہیں بھولے، ودھا اور فرخزاد کو، آج تک نہیں بھولے۔'' شاہوار کے لبوں سے چنگاریاں پھوٹی تھیں، جن کی تپش نے صندیر خان کی آنکھوں کو انگارہ کردیا تھا۔

''تو ایسے لوگوں کا انجام یہی ہوتا ہے، ایک اندھی گولی اور خوفناک موت۔'' وہ زہر خند ہوا۔
''صندیر خان! ایک بات کہوں؟'' اس کے انت ہوتے غصے میں پوشیدہ خطرناک ارادوں سے اندرونی طور پہ ٹوٹا شاہوار کچھ دیر سوچنے کے بعد صندیر خان کے قریب آیا تھا، صندیر خان نے چونک کر اسے دیکھا تھا، وہاں اس کے چہرے پہ سنجیدگی کھنڈی تھی اور کچھ ایسا تھا جو اسے اچھا نہ لگتا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اکھڑے تاثرات کے ساتھ نخوت سے پوچھا تھا، شاہوار چند لمحے سوچتا رہا، پھر ہتھیار پھینک کر سنجیدگی سے کہہ اٹھا۔
''وقت کو بدل جانے دو، سالوں پرانی روایتوں کو ٹوٹ جانے دو، غیرت کے نام پہ روشن زندگی کے چراغوں کو مت بجھنے دو صندیر خان! اب بس کر دو صندیر خان! اور کتنی زندگی کے دیوں کو گل کرو گے اور کتنا اپنے پرکھوں کے بتائے غلط راستوں پہ چلو گے؟'' شاہوار کے الفاظ ایسے نہیں تھے جو صندیر خان کے سر سے گزر جاتے، وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھرا گیا تھا، خاموش ہو گیا تھا، لیکن اس کا چہرہ تانبے کی مانند تپ رہا تھا اور آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا، پھر وہ رکا نہیں، پیروں کی ٹھوکروں سے راہ میں آتی ایک ایک چیز کو توڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور یہ اس کے غصے اور ناگواری کی انتہا تھی، جس کا مطلب تھا اسے شاہوار کی کوئی بات پسند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

بارہ دری کے اوپر آج سورج کی نرم کرنیں پگھل رہی تھیں۔
وادی میں دھند نہیں تھی، سردی کی شدت بھی نہیں تھی، پہاڑوں پہ اب رفتہ رفتہ برف پگھلنے کا موسم قریب آ رہا تھا، برف ختم ہوتی تو سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔
آج پچھلی دھوپ سے پوری وادی کے لوگ لطف اندوز ہو رہے تھے۔
وہ بٹو محل کی بالکونی میں کھڑی تھی اور پوری وادی اس کی نگاہوں میں پھیلی ہوئی تھی، اس نے اپنی تھکی تھکی نگاہوں میں ایک تراوٹ اترتی محسوس کی تھی پھر آرام سے اپنا سیل فون اٹھا لائی۔
بارہ دری کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک نمبر اسکرین پہ چمکتا دیکھا تھا، پھر مسکرا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگی تھی، کچھ دیر بعد کال ریسیو ہو گئی تھی، دوسری طرف سے جو آواز آئی تھی، اس نے نیل بر کے ہونٹوں پہ مسکان پھیلا دی تھی، اس نے اپنا تعارف کروایا تو دوسری طرف ناگواری کا اظہار نہیں ہوا تھا۔
''زہے نصیب، آپ نے کیسے یاد کر لیا؟'' امام نے بہت شائستگی اور خوشدلی کا مظاہرہ کیا تھا، نیل بر کو ڈھارس سی ملی تھی، اس کے نرم لہجے سے حوصلہ ہوا اور وہ بڑے آرام سے گفتگو کرنے لگی۔
''یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو بھول چکے ہوں، آپ تو خیالوں میں رہتے ہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ معنی خیزی سے کہا تھا، امام قدرے چونکا تھا اور اس کے معنی خیز لہجے سے کچھ محتاط بھی ہوا تھا، اسے نیل بر کے انداز کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے، وہ تھوڑا الرٹ سا ہوا تھا، اس کے اندر بڑا ہی عجیب سا احساس ابھرا، ایک مرد ہو کر بھی اس نے قریب آتا خطرہ محسوس کر لیا تھا، کچھ تو ایسا تھا جو ٹھیک نہیں تھا۔

''اور خوابوں میں رہتے ہیں۔'' نیل بر نے مزید بھی کہا تھا، امام سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔
''اور باتوں میں تو اکثر ہی رہتے ہیں۔'' اب کہ ذرا مسکرائی بھی تھی، امام جیسے حیران ہی رہ گیا، کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے بہت کچھ سمجھ آرہا تھا، اسے یوں لگا، جو ہو رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں، کسی طور بھی ٹھیک نہیں۔
''مذاق اچھا کر لیتی ہو۔'' امام نے سنبھل کر کہا تھا، آخر کچھ تو کہنا ہی تھا، ویسے بھی نیل بر سے خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی، وہ اکثر اسے کال کر لیتی تھی، ہلکی پھلکی گفتگو میں مذاق کا پہلو بھی نکل ہی آتا تھا، لیکن یہ انداز اور یہ لہجہ عام سا نہیں تھا، پہلا سا نہیں تھا، امام ٹھٹک گیا تھا۔
''یہ مذاق نہیں ہے۔'' اس نے اپنی بات پہ زور دیا تھا، امام لمحہ بھر کے لئے بھونچکا رہ گیا۔
''تم ٹھیک تو ہو؟'' اب کہ بڑی سنجیدگی سے امام نے پوچھا تھا، وہ ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا، تھکا ہارا، پریشان اور اس وقت نیل بر کی فون کال نے اور بھی پریشان کر دیا تھا، وہ پہلی مرتبہ اس سے بات نہیں کر رہی تھی، اب تو وہ نیل بر کے فون کا عادی ہو چکا تھا، نیل بر کے دو تین اہم کام امام نے آرام سے کر دیئے تھے، نیل بر کے بتائے بندوں کو اپنی نئی لیبر میں لگوا دیا تھا، پہلی مرتبہ نیل بر نے شکریے کے لئے فون کیا تھا، پھر یہ سلسلہ چل ہی پڑا، ابھی اس نے سات دن بعد کال کی تھی، یعنی پہلی کالز اور اب کی کال کے دورانیے میں سات دن آچکے تھے، تبھی امام حیران ہوا تھا، بلکہ ابھی تو نیل بر اسے مزید بھی حیران کرنے پہ تلی ہوئی تھی، بلکہ امام کے کانوں سے دھواں نکال رہی تھی۔
''میں بالکل ٹھیک ہوں، یا ٹھیک نہیں ہوں، مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی امام! بس مجھے یوں لگتا ہے، تم سے بات نہ کروں تو سانس لینا دشوار ہے اور...... اور تم نے ملے تو زندگی کی تکمیل ممکن نہیں۔'' نیل بر نے بہت آرام سے اپنی سوچ کو الفاظ کا پیراہن پہنا دیا تھا، اس نے اپنی بے قراری کا اظہار کر دیا تھا، یہ ٹھیک تھا یا غلط تھا، وہ کچھ نہیں جانتی تھی، یہ مناسب تھا یا غیر مناسب تھا؟ نیل بر نے سوچا نہیں تھا، وہ جس آزاد معاشرے سے آئی تھی وہاں پہ یہ معمول کی باتیں تھیں، کسی کو پسند کرنا، اظہار کرنا، کسی کو چاہنا، پانا، کھونا، اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا، پہل مرد کو کرنی چاہیے تھی یا عورت کو؟
وہ اپنے جذبات کو دل کے اندر روکنے والی نہیں تھی، جو اس کے دل نے محسوس کیا تھا، وہ اس نے کہہ دیا، اسے کہنا ہی تھا، دل میں روکنا نہیں تھا، اگلا چاہے سمجھتا یا نہ سمجھتا، روکتا یا نہ روکتا۔
''نیل بر! یہ تم نے کیا کہا؟ تم ٹھیک تو ہو؟ کیسی باتیں کرتی ہو؟ جانتی ہو تم کون ہو؟ اور کیسی بات کر رہی ہو؟'' امام سنبھل کر دبی دبی آواز میں چیخ پڑا تھا، وہ بوکھلا گیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی، نیل بر کے اظہار پہ کس طرح سے ری ایکٹ کرے؟
''میرے دل مین جو ہے، وہ تمہیں بتا رہی ہوں، یہ محبت ہے یا کیا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں، بس تم مجھے اچھے لگتے ہو اور تمہیں پانے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں، مائنڈ دس آؤٹ، کچھ بھی، صندیر خان سے ٹکرا بھی سکتی ہوں۔'' اس کے لفظ لفظ میں بے قراری چھپی تھی، اضطراب تھا، پریشانی تھی اور اس کے لفظوں میں استحکام تھا، ایک ضد تھی۔
''نیل بر! نیند سے اٹھ جاؤ، ڈونٹ بی سلی، تمہیں کچھ خبر نہیں کیا بول رہی ہو، حد ہے یار۔'' امام

کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا، وہ تو نیل بر کی معمول کے مطابق کال سمجھ رہا تھا، اسے اندازہ ہی نہیں تھا، وہ اسے عجیب وغریب قسم کی کہانیاں سنانے لگ جائے گی، ایسے الفاظ اور ایسے انکشاف کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''میں نیند میں نہیں ہوں امام؟ اور تم مجھے اچھے لگتے ہو، ہمیشہ سے اچھے لگتے ہو، پہلے دن سے، جب میں نے تمہیں دیکھا تھا اور میں بہانے بہانے سے تم تک......'' نیل بر نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا تو امام نے بے ساختہ اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''پلیز نیل بر!'' اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں، اب ایسی بات مت کرنا اور مجھے دوبارہ کال کرنے کی زحمت بھی نہ کرنا، میں یہاں کام کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھ پہ زندگی کے دروازے بند کرنا چاہتی ہو، میرے پیچھے میرا خاندان ہے اور میں ان کے لئے جینا چاہتا ہوں، پلیز نیل بر! مجھے آئندہ کال مت کرنا۔'' امام نے لمحہ بھر کے لئے سوچا تھا پھر ایک ہی سانس میں وہ سب کہہ دیا، جو وہ کہنا چاہتا تھا اور جسے نیل بر سننا نہیں چاہتی تھی، ابھی تو ایک چنگاری تھی جو بجھی راکھ سے نمودار ہوئی تھی، ابھی تو چنگاری کو آگ بننا تھا اور پور پور جلنا تھا۔

وہ جس صحرا کے سفر پہ برہنہ پاؤں نکل آئی تھی، یہ جانتی ہی نہیں تھی، یہ سفر آبلہ پائی کا سفر ہے اور یہ سفر رسوائی کا سفر ہے۔

وہ آزاد فضاؤں اور آزاد ماحول کی پیداوار تھی، وہ یہاں کی روایات، طریقوں، رسموں سے نا آشنا تھی، اسے تو خبر ہی نہیں تھی، بنو خاندان، راہ محبت پہ چلنے والوں کا کیا حشر کرتا ہے؟ کیا حال کرتا ہے؟ اور کیا انجام کرتا ہے؟

☆☆☆

فون نیل بر کے ہاتھ میں تھا، لیکن اب بے جان تھا، بند ہو چکا تھا، اس میں سے امام کی زندگی سے بھرپور آواز آنی بند ہو چکی تھی۔

نیل بر بیال کی پہاڑیوں میں پھیلی دھوپ کو دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سنہری خوابوں کی بستی میں سنہرے خواب اتر رہے تھے۔

معاً کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی گود میں رکھا فون اٹھا لیا تھا، اپنے ہی دھیان میں کھوئی ہوئی نیل بر ایک دم چونک گئی تھی، پھر وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی، اس کے چہرے پہ واضح گھبراہٹ تھی اور آنکھوں میں ہراس پھیلتا جا رہا تھا، اسے امید نہیں تھی، بارہ دری کی سیڑھیوں پہ کھڑا جہاندار وہاں سے یہاں لمحوں میں پہنچ جائے گا، پھر نیل بر کا موبائل بھی اس کے ہاتھ میں تھا، اس نے بڑے ہی اطمینان سے کال لاگ چیک کیا تھا، نیل بر کی جیسے جان پہ بن آئی تھی، پھر اس نے دل کڑا کر لیا تھا، یہ کون ہوتا تھا اس کے پرسنل میں گھسنے والا۔

''میرا موبائل دو۔'' وہ چاہ کر بھی لہجہ ہموار نہیں رکھ سکی تھی، جہاندار اسے دیکھتا رہا، غور کرتا رہا، کھوجتا رہا۔

''ٹھیک نہیں نیل بر! بالکل بھی ٹھیک نہیں۔'' وہ دھیمی آواز میں سنجیدگی سے بولا تھا، نیل بر کو

اس کا بولنا پسند نہیں آیا تھا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' نیل بر نے غصے میں موبائل جھپٹتے ہوئے کہا تھا۔

''آہ......'' اس نے زور سے آہ بھری۔

''مجھے کیا تکلیف ہے؟ ساری تکلیف تو مجھے ہی ہے، تمہیں کیا بتاؤں نیل بر!'' وہ بے موقع ہی مسکرا دیا تھا، نیل بر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگی۔

''تم اپنے کام سے کام رکھو، میرے پرسنلو میں انٹرفیئر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' اس کا انداز حکمیہ تھا، جہاندار بے نیازی سے مسکراتا رہا۔

''میں اپنا کام ہی تو کر رہا ہوں، تم کیوں بھول جاتی ہو نیل بر! میرا کام تمہاری حفاظت ہے، جبکہ تمہیں اپنی ذرا بھی پرواہ نہیں، آگ آگ کھیلنے کا شوق ہے تمہیں۔'' اس نے بڑے ہی اطمینان کے ساتھ جتلایا تھا۔

''اس بات کا مطلب؟'' وہ زہر خند ہوئی تھی۔

''مطلب سمجھاؤں کیا؟ اتنی ناسمجھ نہیں ہو، کیوں اپنے حسن کو تہ خاک کرنا چاہتی اور اس غریب سرویئر کی زندگی کا چراغ گل کرنے پہ تلی ہوئی ہو، رحم کرو بے چارے پہ۔'' جہاندار نے بڑے واضح لفظوں میں وار کیا تو نیل بر گڑبڑا گئی تھی، پھر ایک دم اسے غصہ چڑھ گیا تھا۔

''تم ایک ملازم ہو، اپنی حد میں رہو جہاندار! یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔'' اس نے غیض میں آکر پھنکارتے ہوئے کہا تھا، جہاندار اس کے غصے سے قطعاً بھی متاثر نہیں ہوا تھا، اب بھی اطمینان سے مسکراتا رہا۔

''او......اچھا۔'' اس نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

''تو یہ تمہارا پرسنل میٹر ہے؟ لیکن افسوس کہ تمہارے پرسنل میٹر کو تمہارے تایا زاد اور والد بزرگ وار میرے ساتھ بخوشی ڈسکس کرتے ہیں اور میرے مشوروں پہ اعتبار بھی کرتے ہیں۔'' وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ بولتا ہوا اس کے چہرے پہ بکھرے تلخ تاثرات کا مزہ لے رہا تھا، جو اس کے جواب پہ غصے میں لال انگارہ ہو رہی تھی۔

''تمہاری دلیرانہ محبت نے تمہارے تایا زاد بھائیوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں، وہ مارے غیرت کے تمہارے سامنے آنے سے بھی گریزاں ہیں، مبادا تمہاری صورت دیکھ کر اشتعال میں گولی نہ چلا دیں، انہوں نے بڑی بھاری ذمہ داری میرے کندھوں پہ ڈال رکھی ہے، یعنی تمہیں کنٹرول کرنے کی اور تم مجھ سے کنٹرول ہوتی دکھائی نہیں دے رہی ہو۔'' وہ آنکھوں میں ڈھیروں شرارت سموئے کہہ رہا تھا، تو کیا یہ اتنا خوشگوار معاملہ تھا؟ جس پہ وہ اس قدر ریلیکس تھا؟ وہ کیوں اتنا خوش تھا؟ بٹومحل میں چنگاریاں بھڑک رہی تھیں اور جہاندار اتنا مطمئن تھا؟ اتنا پرسکون تھا؟ آخر کیوں؟

''میں تم سے اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتی۔'' نیل بر اس کے اطمینان پہ غیض بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''اور جس سے بات کرنا چاہتی ہو، اس سے تمہارے تایا زاد بات کرنے نہیں دیتے، کتنے

افسوس کی بات ہے۔'' اس نے جلتی پہ تیل ڈالا تھا، نیل بر کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا، احساس توہین سے چہرہ انگارے کی طرح تپ گیا تھا۔

''مجھے ان میں سے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہے، میرا جس سے دل چاہے گا بات کروں گی، مجھے کسی کا بھی ڈر نہیں ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہی تھی، ایک ایک لفظ میں تلخی رچی تھی۔

''تو میں بھی دیکھتا ہوں تم کہاں تک اپنی مرضی چلاتی ہو۔'' اس نے بڑے اطمینان سے نیل بر کو چیلنجنگ انداز میں کہا تھا، وہ دم بخود سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی، جو بالکونی کے کنگروں سے بہت آگے بیال کی پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پہ ایک دلکشی سی پھیل رہی تھی، ایک خوبصورت مسکراہٹ، ایک روشن مسکان۔

''اور پھر بھی ایک مخلصانہ مشورہ دوں گا۔'' معاً اس نے اپنا رخ روشن نیل بر کی طرف موڑ لیا تھا۔

''کہ تم اپنے لئے مشکلات کھڑی بے شک کرتی رہو، لیکن اس سرویئر جنرل کی حالت زار پہ ترس کھاؤ، تم صندیر خان کے ہاتھوں بچ بھی جاؤ گی مگر اس بے خبر، انجان، غریب کا بچنا محال ہے، ناممکن ہے، قطعاً ناممکن ہے۔'' وہ بڑے آرام سے اسے مطلع کرتا موبائل ایزی چیئر پر پھینک کر باہر نکل گیا تھا، جبکہ نیل بر خالی سن ہوتے سر کو تھام کر ایزی چیئر پہ گر گئی تھی۔

''تو اب مجھے جہاندار صاحب دھمکیاں دیں گے، مجھ پر یہ وقت بھی آنا تھا۔'' اس کے لبوں پہ عجیب سی بڑبڑاہٹ تھی اور ذہن تیزی سے کچھ سوچتا جا رہا تھا۔

''اور صندیر خان مجھے کہاں تک روکے گا؟ آخر کہاں تک؟'' وہ موبائل اٹھا کر نیچے آئی تو داخلی دروازوں کو اور خارجی دروازوں کو بند پایا، اسے پہلا دھچکا تب ہی لگا تھا اور اسے صندیر خان کے روکتے اور جہاندار کی دھمکی کا مطلب بھی سمجھ میں آ گیا تھا اور اسے اندازہ ہو چکا تھا، کچھ بھی اتنا آسان نہیں تھا، کچھ بھی، یعنی یورپ کی آزاد شہزادی کو پربتوں میں قید کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے کچھ دن تک ولید کی باتوں کو دل پہ لیا اور پھر ہمیشہ کی طرح صبر شکر کر لیا تھا، وہ کتنا کڑھ سکتی تھی؟ کتنا جل سکتی تھی اور کتنا بدگمان ہو سکتی تھی؟ بالآخر رو رو کر اور کڑھ کڑھ کے اس نے دل کو سمجھا ہی لیا تھا، کیونکہ بعد میں ولید نے کوئی ایسی بات یا فرمائش نہیں دہرائی تھی۔

ان دنوں گھر میں امن کی فضا قائم تھی، نومی صاحب انسان کے بچے بنے علم حاصل کرنے پنڈی چلے گئے تھے، اسامہ اپنی جاب پہ، تایا چچا اپنے اپنے کاموں میں، تائی بھی آج کل لڑنے سے پرہیز کر رہی تھیں اور بڑی دل جمعی کے ساتھ عینی کے لئے رشتہ ڈھونڈ مہم پہ نکلی ہوئی تھیں۔

اسامہ اور نومی کو گئے ہوئے مہینہ ہو چلا تھا اور آج صبح اوپر والے ڈاکٹر صاحب بھی کہیں جانے کے لئے تیار شیار بیگ تھامے نیچے اترے تو تائی کو مفت کی روزی ہاتھ سے جاتی دکھائی دینے لگی تھی۔

تائی نے سمجھا اتنا اچھا بھلا کرائے دار کہیں اور ٹھکانہ نہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' تائی نے تفکر بھرے لہجے میں پوچھا تھا، یوں کہ گردن اچکا اچکا کر لاؤنج میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے نظر آتی نشرہ کو چوری چوری دیکھتا ہیام قدرے گڑبڑا گیا۔

''میں واپس جا رہا ہوں دیا مر۔'' ہیام نے جلدی سے رخ موڑ لیا تھا، مبادا تائی اس کی چوری کو پکڑ نہ لیتیں، اس کی تو خیر تھی لیکن جو حال نشرہ کا ہونا تھا وہ اس کا دل نہ سہار سکتا۔

''کیا؟'' تائی کے ہاتھ سے عینک گر پڑی تھی، ان کا رنگ فق ہو گیا تھا اور چونکی تو پراٹھے بناتی نشرہ بھی تھی۔

''کیا ہیام واپس جا رہا تھا؟'' اس کا دل پتا نہیں کیوں عجیب انداز میں دھڑک اٹھا تھا، وہ دل کے اس شور پہ گھبرا سی گئی تھی۔

''تم واپس جا رہے ہو؟ کیا ٹرانسفر ہو گئی؟'' تائی نے مری مری آواز میں پوچھا تھا، انہیں کمیٹی کی رقم ہاتھ سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔

''ارے نہیں تو۔'' ہیام نے فوراً انہیں بحر غم بیکراں سے باہر نکالا تھا۔

''اپنے ایسے نصیب کہاں۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری تھی اور ترچھی نگاہ سے باہر آتی نشرہ کو دیکھا تھا، وہ ناشتے کی ٹرے سجا کر باہر آ رہی تھی۔

''کیا سچ؟'' تائی بے ساختہ خوش ہو گئی تھیں اور ہیام تھوڑا مشکوک ہوا۔

''آپ تو ایسے خوش ہو رہی ہیں جیسے لاٹری نکل آئی ہو۔'' صدا کا منہ پھٹ ہیام بات دل میں بھلا رکھ سکتا تھا؟ نشرہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی، اس نے ٹرے تخت پہ رکھی اور واپس جانے کے لئے مڑی تھی، ہیام نے اس موقع سے خاصا فائدہ اٹھا کر جی بھر کے نظر بازوں کی طرح ایسے تاڑ لیا تھا، نشرہ اس کی نگاہوں کو محسوس کرتی ایک خفا اس نگاہ اس پہ ڈال کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''لاٹری نہیں کمیٹی، بیٹا! تمہارے کرائے سے کمیٹی ڈال رکھی ہے نا۔'' تائی نے خوش ہو کر جوش میں بتا دیا تھا، اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''اور وہ آپ کا نور نظر، دل لگ گیا نور نظر کا؟'' اچانک ہیام کو یاد آیا تو اس نے جاتے جاتے نومی کے بارے میں پوچھ لیا تھا، تائی کے دل پہ برچھیاں سی چل پڑیں۔

''ہر چیز میں دل لگ سکتا ہے میرے لال کا، سوائے پڑھائی کے، بے چارا عذاب میں پھنس گیا، چودہ تو پڑھ لی تھیں، کیا ضرورت تھی سولہ پڑھانے کی، پر اسامہ کو میرا بیٹا آنکھوں کے سامنے عیش کرتا کیسے بھا سکتا تھا؟ بے چارے کو جیل خانے ڈال آیا۔'' تائی کے قلب پہ رقت طاری ہو گئی تھی، نومی کی یاد نے آنکھوں کو بھگو ڈالا تھا۔

''ابھی جاتے ہوئے تو میرے پاس وقت نہیں، البتہ آتے ہوئے نومی کا حال چال پوچھتا آؤں گا۔'' ہیام کے دل پہ تائی کے آنسوؤں کا بے بہا اثر ہوا تھا، وہ بے ساختہ خوش ہو گئیں تھیں اور اسی خوشی میں جب ہیام نے انہیں خدا حافظ کہا تو تائی نے نشرہ کو پکارا تھا۔

''اے نشرہ! بھائی جا رہا ہے، دروازہ بند کر آ۔'' نشرہ کچن سے فوراً برآمد ہوئی تو ہیام نے تائی سے بڑے اچنبھے کے ساتھ پوچھا تھا۔

''نشرہ کا بھائی کون؟'' وہ اِدھر اُدھر سے کسی نادیدہ مخلوق کو تلاش کر رہا تھا، جب تائی اس کے انداز پہ ہنس کر بولیں۔

''تم اور کون، بڑے مخولیے ہو ہیام تم، اسامہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔'' انہوں نے پیار بھرے انداز میں ہیام کو چھیڑا تو وہ واقعی ہی بری طرح سے چھڑ گیا تھا۔

''نہ نہ...... میں اس خونخوار بلی کا بھائی کیوں ہونے لگا؟ بھائی ہو اس کا اسامہ، بھائی ہو اس کا اوبامہ، مطلب نعمان، بھائی اس کا ہو ولید، میں کیوں اس کا بھائی بنوں۔'' وہ سخت برا مان گیا تھا، تائی کو اس ساری بات میں صرف ایک ہی مزے کا پوائنٹ ملا تھا، وہ فوراً چمک کر بولی تھیں۔

''ہا...... ہا...... ہا...... ولید تو اس کا منگیتر ہے۔'' تائی کو بڑا ہی مزہ آیا تھا۔

''اور تم نے بھائی بنا دیا۔''

''تو کیا خبر بھائی ہی بن جائے، منگنی سے کوئی شوہر تھوڑی بن جاتا ہے، ویسے بھی مجھے تو آپ کی مغرور نند کچھ پسند نہیں آئی اور ایک بات مزید، دونوں ماں بیٹے کی نظر قریب شدید متاثر لگتی ہے، کیا ان دونوں کو میری پیاری بہن عینی دکھائی نہیں دی؟ کیا ان کی عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے، کیا آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا؟ اس کٹ کھنی بلی کو پسند کر لیا، میری گنوں والی بہن کا ایک بھی گن دکھائی نہیں دیا۔'' ہیام نے انجانے میں تائی کے زخموں پہ ایسی مرہم رکھی کہ وہ تو ہیام کی مرید ہو گئیں، اس کی ڈھیر ساری بلائیں لیں اور بڑی محبت سے زبردستی کھینچ کر اپنے قریب تخت پہ بٹھا لیا، اب اس داستان امیر حمزہ کو سنانا بھی تو تھا، کچن میں موجود نشرہ غم و بے بسی کی تصویر بنی ہیام کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی اور وہ جان بوجھ کر کھڑکی میں دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

گو کہ اسے دیر ہو رہی تھی اور وہ ولید کا قصہ سننا بھی نہیں چاہتا تھا، محض نشرہ کی تلملاہٹ کا مزہ لینے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔

''میرا بچہ! بس کیا بتاؤں، جانے اس نے کون سا جادو ولید پہ چلایا، بس اس نے اپنی ماں کی ایک نہ سنی اور منگنی کروا کے ہی دم لیا۔'' تائی کے سارے ہی زخم ادھڑ گئے تھے۔

''وہی جادو چلایا ہوگا، جو کم بخت مجھ پہ بھی چل گیا۔'' ہیام نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تو تائی نے فوراً سے اس کی بات پکڑ لی۔

''کیا کہا؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔'' وہ دلار سے بولی تھیں، ہیام بس کھانس کر رہ گیا۔

''بہت اچھا ہوا جو آپ کو سمجھ نہیں آئی، دل ہی جلانا تھا آپ نے اپنا۔'' اس کے انداز میں ہمدردی تھی۔

''دل تو اب بھی جلتا ہے میرا۔'' تائی نے رقت آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''نہ آنٹی! ایسا مت کہیں، دل آپ کے دشمنوں، ہمسائیوں اور پڑوسیوں کے جلیں، میرا دل دکھتا ہے، آپ یوں نہ کہیں۔'' ہیام نے منہ بسورا۔

''باقی رہی ولید کی بات تو اس صاحب سے بھی نپٹ لیں گے، آپ غم نہ کریں، میں ہیام خان ہوں، اصلی اور نسلی پٹھان۔'' اس نے اونچی آواز میں خوب کچن والوں کو سنایا تھا، نشرہ کا دل جل کے خاک ہو گیا تھا۔

''میں آپ کی ہر لحاظ سے مدد کروں گا۔'' وہ سینہ ٹھونک کے میدان میں اتر آیا تھا، تائی کی آنکھوں میں جوش بھر گیا تھا، چہرہ لال ہوا، نتھنے خوشی میں پھول اٹھے تھے، بے ساختہ ہیام کے کندھے کو دبوچ کر انہوں نے پوچھا تھا۔

''کیسے مدد کرو گے میرے بچے؟''

''منگنی تڑوا دوں گا، یو ڈونٹ وری، میری آنٹی، خالہ، ماسی جان! اتنے رشتے بنا لیے ہیں آپ سے، ایک ایک کو نبھاؤں گا، ولید کی منگنی ہر صورت تڑواؤں گا، آخر بھائی ہی بہنوں کا سوچتے ہیں، کوئی نہیں تھیں۔'' اس نے تائی کو دل کی گہرائیوں سے امید دلائی تو تائی واری صدقے جانے لگی تھی، پھر نشرہ کو دوبارہ آواز لگائی۔

''نشرہ! گیٹ کو بند کر آ، ہیام بچہ جا رہا ہے۔'' انہوں نے آنکھوں میں ڈھیروں محبت سمو کر ہیام کو خدا حافظ کہا تو باہر نکلتا ہیام ایک مرتبہ پھر چونک کر رکا تھا۔

''آنٹی! خالہ، ماسی جان! میری ابھی شادی نہیں ہوئی، آپ مارے خوشی میں بوکھلا گئی ہیں، میں اکیلا جا رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی بچہ نہیں ہے۔'' ہیام نے آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت سمو کر انہیں چھیڑا تو تائی نے بڑی محبت سے ہیام کو ڈپٹا تھا۔

''بڑا ہی مخولیا ہے۔'' وہ ہیام کو بھیج کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''آپ کی توقع سے زیادہ۔'' ہیام بڑبڑایا اور باہر نکل آیا تھا، پھر اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا، تھوڑی دیر بعد وہ الجھی، بکھری غصے میں لال ہوتی دکھائی دی تھی، وہ پلر کی اوٹ سے باہر آ گیا تھا، نشرہ جو اپنی ہی جھونک میں آ رہی تھی، ایک دم بوکھلا کر رہ گئی، سامنے وہی فنکار کھڑا تھا، آنکھوں سے باتیں کرتا ہوا، مسکراتا ہوا، آنکھوں سے شرارتیں کرتا ہوا، بڑا ہی اداکار تھا، بڑا ہی فنکار تھا، آنکھوں سے سب کچھ عیاں کر دیتا، آنکھوں سے سب کچھ بول دیتا، آنکھوں سے داستانیں نشر کرتا، نشرہ کا دل پہلو میں بے قرار سا ہوا، وہ نگاہیں چرا کر غصے سے بولی تھی۔

''اب جائیے مجھے دروازہ بند کرنا ہے۔''

''ایسے تو مت نکالیے، درد دل سے، بھٹک کر کہاں جائیں گے ہم۔'' ہیام نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر دلربائی سے کہا تھا، اس کی شرارتوں کا وہی انداز تھا، وہ ہی مسکراہٹیں، وہی شرارتیں، وہی کھلکھلاہٹیں۔

''زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں، تائی کو بتا دوں گی، یہ لائنیں کسی اور پے ماریئے گا۔'' اس کا انداز غصے سے بھرپور تھا، پھولا پھولا منہ خفا خفا سے انداز، ہیام کے اچھے بھلے دل کو بڑے زور سے کچھ ہوا تھا، وہ فوراً ہی پگھل گیا۔

''ہماری مجال جو ایسی جسارت کریں، لائن مارنے والا گناہ کریں، بڑے شریف ہیں ہم، ماں کی قسم، جس کی چاہے گواہی لے لیں۔'' ہیام نے فوراً معصوم صورت بنا کر اپنی صفائی پیش کی تھی۔

''مجھے کیا ضرورت ہے۔'' وہ جز بز ہوئی۔

''بس ایک احسان کر دیں مجھ غریب پہ۔'' اس نے ایسے انداز میں کہا تھا جیسے ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی ہو، ہیام فوراً موم بنا، موم میں ڈھلا، موم بن کر پگھلا، موم بن کر بہہ گیا۔

''حکم کیجیے۔'' اس نے ادب کا مظاہرہ کیا، بڑے پیار سے کہا، بڑی توجہ سے دیکھا، بڑے دل سے سر تسلیم خم کیا۔
''ولید کا پیچھا چھوڑ دیں۔'' اس نے تڑخ کر کہا تھا اور ناگواری سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی، ہیام پہلے تو حیران ہوا تھا، پھر فوراً ہی گول سا گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔
''ولید کا پیچھا کس نے کیا ہے؟ میں نے موصوف کو دیکھا تک نہیں۔'' ہیام نے رونی صورت بنا کر جواب دیا تھا، وہ اسے خونخوار نگاہوں سے گھورتی رہی تھی، پھر تلخی سے بولی۔
''اور اندر کیا ہو رہا تھا؟'' اس نے ہیام کو اس کی کچھ دیر پہلے والی گفتگو یاد دلائی تھی، وہ تھوڑا سا گڑبڑایا۔
''وہ تو تمہاری تائی کو خوش کر رہا تھا میں، بلیوی۔'' اس نے سچائی سے کہا تھا۔
''کسی کے دل پہ تلوار چلا کر دوسروں کو خوش کیا جاتا ہے؟'' نشرہ کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بھر آئے تھے، ہیام تو اندر تک ڈوب گیا تھا، گوڈے گوڈے غرق ہو گیا تھا۔
''تو کیا ولید کے لئے ایسی حساس ہو؟'' ہیام کے دل کو کچھ ہوا تھا۔
''بات یہ نہیں۔'' بالآخر نشرہ کے آنسو چھلک ہی پڑے تھے اور ہیام بس ڈھنے کے قریب تھا۔
''تو بات کیا ہے؟ رقیبوں کے لئے ایسی جذباتیت؟ اپنے قیمتی آنسو گرا دیئے؟'' ہیام نے بڑے دکھ کے ساتھ شکوہ کیا تھا۔
''دشمنوں سے ایسی محبت؟'' ہیام کا دل کرلایا، دل پہ کیسا صدمہ گزرا تھا، آن کی آن میں طوفان سا گزر گیا، وہ آنکھیں مسلتی سوں سوں کرتی سر دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔
''میری زندگی میں محبت جیسی چیز کے لئے وقت ہی نہیں، مجھے بس اتنا پتا ہے، ولید نام کا ایک روزن ہے، ایک دریچہ ہے، ایک رستہ ہے، جو میری اندھیری زندگی میں اپنی درزوں کے ذریعے کبھی کبھار ہلکی کرنوں سے روشنی بھر دیتا ہے، میں نہیں چاہتی، میری زندگی سے یہ روزن، یہ رستہ، یہ دریچہ بند ہو جائے اور میں سانس تک نہ لے سکوں، پھر گھٹ گھٹ کے مر جاؤں۔'' وہ ایسی زود و رنج کیفیت میں بول رہی تھی، وہ ایسی مایوسی کی انتہا پہ کھڑی تھی، جس نے ہیام کو بہت اونچائی سے سرنگوں کیا تھا، وہ اس کے کرب، درد اور تکلیف سے پہلی مرتبہ آشنا ہوا تھا، وہ کیسی زندگی گزار رہی تھی؟ جس پہ اس کا اپنا کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔
وہ اپنی مرضی سے کھا نہیں سکتی تھی، پہن نہیں سکتی تھی، کسی سے مل نہیں سکتی تھی، کہیں آ، جا نہیں سکتی تھی، حتیٰ کہ کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتی تھی، یہ زندگی اس کی اپنی نہیں تھی، کسی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی، اسے آج پتا چل رہا تھا، اس زندگی میں مورے، عشیہ اور ہیام سے بڑھ کر بھی لوگ اذیت میں تھے، تکلیف میں تھے اور اپنوں کے ستائے ہوئے تھے، آج ہیام کو اندازہ ہوا تھا، رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی کنگال ہونا کیا ہوتا ہے؟ اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہونا کیا ہوتا ہے؟ وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہونا کیا ہوتا ہے؟ ہیام کے دل میں اس چھوٹی سی لڑکی کے لئے محبت کے چشمے پھوٹ پڑے تھے، دل لگی، دل کی لگی بن رہی تھی، آج وہ ایک نئے جذبے، ایک نئے احساس، ایک نئے رشتے سے روشناس ہوا تھا۔

اسے اندازہ تک نہیں تھا، وہ اپنے دیس جا رہا تھا، وہ پریوں کے دیس جا رہا تھا، وہ پربتوں کے پار جا رہا تھا۔

اور اسے اندازہ تک نہیں تھا، وہ عاشقوں کی وادی سے آیا تھا، وہ پریوں کی وادی سے آیا تھا، وہ شہزادوں کی وادی سے آیا تھا، وہ پتھروں کی وادی سے آیا تھا اور وہ چھوٹے محلوں کی، چھوٹی گلیوں میں رہنے والی ایک قیدی کنیز کو پتھر کر دینے کے لئے آیا تھا۔

اس نے ہیام کی اس آگ لگا دینے والی نگاہ کے جام کو، تپش کو، حدت کو کسی مہ نوش کی طرح پیا اور عمر بھر کے لئے امر ہو گئی، اس کے دل پہ ایک قیامت اتری تھی اور ٹل گئی، وہ پتھر نہیں تھی پر پتھر بن گئی۔

وہ چلا گیا تھا اور وہ رک گئی، وہ نکل گیا اور وہ تھم گئی، وہ بڑھتا رہا یہ تھمی رہی، جس مقام پہ چھوڑ گیا تھا اسی مقام پہ کھڑی رہی، نہ آگے بڑھی نہ آگے چلی، کسی خواب کی طرح، کسی گمان کی طرح رکی رہی، تھمی رہی۔

☆☆☆

''شانزے! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے، جانے کیوں؟ دیکھنا کچھ ہو کر رہے گا۔'' کومے نے اکیالیسویں مرتبہ وہی بات دوہرائی تو شانزے نے سر پکڑ لیا تھا۔

''اب میں نے تمہارا گلا دبا دینا ہے۔'' شانزے نے دانت پیس لئے تھے، کومے پہ قطعاً اس کے برے موڈ کا اثر نہیں ہوا تھا، وہ اپنی ہی دھن میں تھی اور بولے جا رہی تھی۔

''دل اپنے گھبراتا ہے کہ کیا بتاؤں، برے برے خیال اور سپنے آتے ہیں۔'' اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ شانزے کو کپکپی سے آ گئی تھی۔

''خدا کے لئے کومے! کوئی اچھا خواب دیکھ لیا کرو۔'' وہ گھبرا سی گئی تھی اور اسے جھرجھری سی آ گئی تھی، اس نے دہل کر کومے کی طرف دیکھا تھا۔

''آج جو خواب دیکھا، سننا ذرا، ایک سفید گھوڑے کا سوار ہے، سنہرے سورج جیسا، بڑا بارعب اور سخت ہے، دیکھنے میں بڑا وجیہہ لیکن ایسا جلاد کہ کیا بتاؤں۔'' کومے نے بذات خود اٹھارویں جھرجھری لی تو شانزے نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

''وہ گھڑ سوار آخر چاہتا کیا ہے؟ آئے دن تمہارے خواب میں ڈرانے آ جاتا ہے، اسے اور کوئی کام نہیں۔''

''کام کرتا تو ہے نا۔'' کومے نے ایک جذب سے آنکھیں بند کر کے بتایا تھا۔

''ارے کیا کرتا ہے؟ کیا ہماری بنو سے شادی؟'' وہ اس خوفناک ماحول کی کثافت کم کرنا چاہتی تھی، اسی لئے لہجے میں کچھ شوخی بھر کے بولی تھی۔

''وہ مجھے قتل کرتا ہے۔'' کومے نے ڈرامائی انداز میں آنکھیں کھولیں تو شانزے کی چیخ نکل گئی تھی۔

''بکو مت۔'' اس نے خوف کے مارے پسینہ پسینہ ہوتے ہوتے بے ساختہ کہا تھا، کومے افسردگی سے اسے دیکھنے لگی تھی، اس کے چہرے پہ زردی سی کھنڈی تھی اور چہرہ نامعلوم خوف کے

احساس میں بھیگ رہا تھا، شانزے کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' کومے نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا تو شانزے کو پھریری سی آ گئی تھی، کومے کے ہاتھ بہت ٹھنڈے تھے اور وہ خود بھی برف کی طرح ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

''ایسے مت کہو۔'' شانزے نے گھبرا کر کہا تھا۔

''تمہیں یقین نہیں آتا نا، دیکھ لینا شانزے! ایک دن ایسا ہو کر رہے گا، یہ تسلسل سے آتے خواب اپنا آپ منوا کر رہیں گے۔'' وہ ہونٹ کاٹتی اذیت میں مبتلا تھی، آج کل پڑھائی سے بھی دور تھی، کتاب اٹھانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا، عجیب و غریب وہموں کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی تھی، تبھی پلوشہ نے شانزے کو بلا لیا تھا، کومے کی حالت دیکھ کر ان کی جان پہ بن آئی تھی، کومے ان کی زندگی کا سرمایہ تھی اور وہ اپنے سرمائے حیات کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔

شانزے جب آئی تو کومے اندھیرے کمرے میں اکیلی پڑی تھی، اسے دیکھ کر اٹھ تو گئی تھی، لیکن اس کی یاسیت کم نہیں ہوئی تھی، وہ شانزے کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

''میرا دل گھبراتا ہے شانو! دعا کرنا، میرے لئے اور......'' وہ بولتے بولتے رک سی گئی تھی، اٹک سی گئی تھی، پھر آنسو بھری آنکھوں سے شانزے کو دیکھنے لگی۔

''اور......؟'' شانزے کے لب بے آواز ہلے تھے۔

''میرے لئے اور میرے بھائی کے لئے، جو پردیس میں ہے، پربت کے اس پار، تنہا اور اکیلا، تم جانتی ہو شانو! وہ گھڑ سوار پیسے والا ہے، شان والا ہے، حکومت والا ہے اور وہ حملہ آوروں میں سے ہے اور وہ ہم پہ حملہ کرتا ہے، مجھ پہ اور میرے بھائی امام پہ۔'' وہ آنکھیں موندے شانزے کو پوری جان سے ہلا گئی تھی۔

☆☆☆

اور ہیام کے آتے ہی مورے ساری زمانے کی بدمزاجی، غصہ، چڑچڑاہٹ بھول چکی تھیں، یوں لگتا تھا، مورے کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں اور وہ کوئی اور ہی مورے تھیں جو غصہ اگلا کرتی تھیں، گالیاں دیتی تھیں اور ہر وقت جلی کٹی سناتی تھی، ہیام میں ان کی جان تھی اور ہیام ان کا دل تھا، ان کے وجود کا قیمتی حصہ تھا، ان کا جان جگر تھا، ان کی چار بیٹیوں کے بعد آنے والا، ان کا قیمتی بیٹا، لاڈلا بیٹا، اکلوتا بیٹا، اوپر سے ڈاکٹر، ایسا ہنس مکھ، با اخلاق، ملنسار کے راہ چلتی عورتیں بھی گرویدہ ہو جاتیں۔

اور اس کے آتے ہی سوئے سوئے شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے، رات کو وہ وادی کی بوڑھی، ادھیڑ عمر گائیکہ عورتوں کو اٹھا لاتا تھا، جو شادی بیاہ کے گیت گاتی تھیں، خوب رونق لگاتی تھیں، یوں خاموش سایہ سناٹوں میں گھرا گھر شادی والا گھر لگنے لگا تھا۔

عمکیہ کی شادی میں بس ایک دن بچا تھا، آج بھی روایتی رسمیں ہوئیں، گانے گائے گئے تھے، بتاشے بانٹے، گڑ کی چائے بنی تھی اور خواتین گھروں میں چلی گئیں۔

رات کو مورے کے کمرے میں محفل جمی تھی، ہیام ہوٹل روز گل سے زبردستی اسامہ کو اٹھا لایا

تھا، اب وہ دونوں محفل سجا کر بیٹھے تھے، مورے، عروفہ اور عمکیہ موجود تھیں، عشیہ چائے بنانے کے بہانے اٹھ گئی تھی اور ابھی ایک گھنٹے بعد بھی چائے ندارد تھی، ہیام پہلے تو صبر سے بیٹھا رہا، پھر جب اسامہ چائے کے انتظار پہ تین حرف بھیجتا اٹھنے لگا تو ہیام کی دوستانہ غیرت فارم میں آ گئی تھی۔

''یہ عزت کر رہے ہیں میرے دوست کی؟ وہ اپنے کچن کی ہر قیمتی چیز جما کر میرے لئے اٹھا لاتا تھا، چاہے اسے اپنی سوتیلی ماں سے سو جوتے کھانے پڑتے اور آپ میں سے کسی کو احساس تک نہیں، وہ ایک کپ چائے کے لئے چہرے پہ یتیمی سجا کر جانے والا ہے، میری غیرت یہ تازیانہ مار کر، مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا، کہاں گئی ہے عشیہ؟ سری لنکا سے پتی لینے؟ شوگر مل سے چینی لینے، ڈیری فارم سے دودھ لینے؟'' وہ ایک سانس میں مارے جذباتیت کے بولتا ہی جا رہا تھا، مورے کے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور عمکیہ، عشیہ کو کوستی سرپٹ باہر کی طرف بھاگی تھی، عروفہ البتہ اطمینان سے بیٹھی رہی اور اسامہ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا، ہیام کو دو زور کے جھانپڑ مارے جو سب میں ''افراتفری'' پھیلا کر اب چین سے مورے کی تقریر سن رہا تھا۔

''آخر اس نکمی کو بھیجا ہی کیوں؟ پتا تو ہے، لور لور گلیاں گھما لو مہارانی سے، لیکن گھر گرہستی کا کچھ پتا نہیں چائے کبھی بنائی ہو تو بنا کر لائے نا، بیٹھی ہو گی عمکیہ کے انتظار میں، اب بھلا کون پکا کر دے گا ہمیں؟ عمکیہ کے بعد تو ہم فاقوں سے مریں گے، یہ دونوں کچھ نہیں پکانے والی، میری ایک ہی بیٹی تھی گنوں والی۔'' مورے کی اس تقریر کا سارا نزلہ عشیہ پہ گر رہا تھا اور اسامہ کے دل پہ ایک ایک حرف پتھر کی طرح گر رہا تھا، آخر اس نے چائے کی خواہش ظاہر کی ہی کیوں تھی؟

''کوئی بات نہیں مورے! میں چائے شوق سے پیتا بھی نہیں ہوں۔'' اسامہ نے اخلاق دکھانے کے چکر میں نہیں، بس عشیہ کو مزید ڈانٹ سے بچانے کی خاطر باچھیں یہاں سے وہاں تک پھیلا لی تھیں اور ہیام سے یہ سفید جھوٹ ہضم نہیں ہوا تھا، وہ فوراً میدان میں کود پڑا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو؟ لیٹروں کے حساب سے چائے پینے والے اور تم نے ہی کہا تھا نا، گاڑی پٹرول سے اور اسامہ چائے سے چلتا ہے؟'' ہیام نے کوئی پرانی بات یاد دلائی تو وہ ایسے ہی آئیں بائیں کرنے لگا۔

''شاید مذاق میں کہہ دیا ہو گا، اب مجھے یاد نہیں۔'' اسامہ نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی، ہیام کو قطعاً یقین نہیں آیا تھا، پھر مورے کو عشیہ کی عزت افزائی سے بچانے کی خاطر اس نے فوراً ہی موضوع کو گھمانا چاہا تھا اور ان کی آوازیں صاف عشیہ تک کچن میں پہنچ رہی تھیں اور وہ ہونٹوں پہ امڈ آتی مسکراہٹ کو بمشکل روک رہی تھی۔

''مورے! تو ایک کام کریں نا، اگر آپ کی چھوٹی دونوں بیٹیاں نکمی ہیں تو ہیام کے لئے کوئی کوکنگ ایکسپرٹ لڑکی ڈھونڈ لائیں، آپ کے سارے مسئلے کا نچوڑ نکل آئے گا۔'' اسامہ نے بڑے کمال کا مشورہ دیا تھا، عمکیہ اور عروفہ دونوں کو ہی پسند آیا تھا، مورے بھی دلچسپی لینے پہ مجبور ہو گئیں۔

''ہم کہاں سے ڈھونڈیں، تم ہی رہنمائی کرو، ہم تو کبھی گھر سے نہیں نکلے۔'' عمکیہ نے سادگی سے کہا تھا، ہیام کو بہن پہ ٹوٹ ٹوٹ کے پیار آیا تھا، وہ خواہ مخواہ شرمانے لگا۔

''مجھے بہت شرم آرہی ہے، پلیز اس موضوع پہ کھل کر بات کریں، تا کہ کوئی منطقی انجام تک زیر بحث موضوع پہنچے۔'' ہیام نے جس بے قراری سے کہا تھا، اسامہ کو گلا کھنکھار کے اسے احساس دلانا پڑا کہ وہ اپنی بہنوں کے درمیان ہی بیٹھا ہے۔

''اس کو انجام کی فکر ہے، ابھی آغاز ہوا ہی نہیں۔'' عروفہ نے مذاق اڑایا تھا۔

''پہلے بہنوں کو رخصت تو کرلو۔'' عمکیہ نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

''ہاں ہاں..... ان چڑیلوں کے چنگل میں تو اسے نہیں لاؤں گا۔'' ہیام نے بڑی بے ساختگی کے عالم میں کہا تھا اور پھر زبان دانتوں تلے دبالی تھی، کیونکہ سب کی نگاہوں کا مرکز وہ ازخود بن چکا تھا، حتیٰ کہ اسامہ بھی اسے مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگا تھا، ہیام سے بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔

''تم نے چڑیلیں کسے کہا ہے؟'' عشیہ ٹرے اٹھا کر اندر آئی تو سیدھا ہیام کی طرف فائر کیا تھا۔

''تمہیں تو ہرگز نہیں بولا، قسم لے لو۔'' ہیام نے ڈرنے کی بھرپور اداکاری کی تھی۔

''تو پھر کسے کہا ہے؟ عمکیہ اور عروفہ کو؟'' عشیہ نے ان دونوں کو تاؤ دلایا تو ہیام نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

''میری مجال۔'' وہ صاف مکر گیا تھا، اسامہ اس کے مکرنے پہ ہنس پڑا، بہنوں سے جناب کی جان جاتی تھی۔

''ویسے تم موضوع سے ہٹ رہے ہو ہیام! کوئی نگاہ میں ہے تو بتا دو، ہم تمہارا کوئی سدباب کرتے ہیں۔'' اسامہ نے نئے نئے دوستانے کا حق ادا کرتے ہوئے کہا تھا، ہیام کا دل اچھل پتھل ہوا، دھڑکنوں میں تلاطم آیا اور چہرہ لال انار ہو گیا تھا، اب اس منظر کو ایک ایک نگاہ نے دیکھا تھا اور کئی نگاہوں میں شک وشبہات ابھرے، پھیلے اور باہر امڈ آئے تھے۔

کچھ تو تھا، جو اس کی نگاہ میں اترا تھا۔

ان چاروں نے ہیام کو گھیر لیا، تین اس کی بہنیں اور چوتھا اسامہ، وہ اسے کسی طور بخشنے والے نہیں تھے اور عشیہ اسے سخت الفاظ میں وارن کر رہی تھی۔

''دیکھ لو ہیام! سوچ سمجھ کر دل لگانا، لڑکی ہم ڈھولک بجا کر قبول کریں گے، ذات پات کی ہو، اعلیٰ خاندان کی ہو، خبردار جو کسی نرس سے دل اٹکایا یا کسی ڈاکٹرنی کو پھنسایا، ہمیں سیدھی سادھی سی گھریلو لڑکی چاہیے، گھر سنوارنے والی، گھر بنانے والی، سن لیا تم نے۔'' وہ اونچی آواز میں رعب سے بولی تھی۔

''سن لیا۔'' ہیام نے مودب انداز میں سر تسلیم خم کیا۔

''لیکن ایسی لڑکی بس اسامہ کی نگاہ میں ہے، اس معاملے میں تم اسامہ سے رجوع کر سکتی ہو، میری نگاہوں میں ایسی سلیقہ مند لڑکیاں کہاں آتی ہیں؟'' ہیام نے بڑی چالاکی سے گیند اسامہ کے کورٹ میں ڈالی اور گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا، جبکہ اسامہ نے پہلی مرتبہ ہیام کو بڑے غور، بڑی سنجیدگی اور بڑی کھوج کے ساتھ دیکھا تھا۔

(جاری ہے)

مہشرہ ناز

دوری سہی جائے ناں، سہی جائے ناں
ادھورا ہوں میں اب تیرے بنا
ادھوری میری زندگانی رہ جائے گی
عاطف اسلم کی دھیمی اور پراسرار آواز
یکدم چیختے چلاتے شور کے ساتھ بلند ہوئی تو تخت پر بیٹھی حمیدہ بیگم نے کچن میں کھڑی زور و شور سے بہتے نل کے نیچے برتن دھوتی اپنی نئی نویلی بہو کو ناگواری سے دیکھا اور خاموشی سے تخت کے دوسری طرف رکھا پاندان گھسیٹ کر اپنے قریب کرلیا، پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے سامنے سے آتی اپنی بہو حنا کو دیکھا جو اب برتن دھونے کے بعد شاید ان سے دوپہر کے

کھانے کا مینو پوچھنے آرہی تھی لیکن اس کے اٹھتے تھرکتے قدم اور لبوں کی گنگناہٹ حمیدہ بیگم سے چھپی نہ رہ سکی تھی، دلہناپے کا روپ ابھی بھی اس کے چہرے پہ قائم تھا باوجود اس کے کہ ان کے بیٹے کی شادی کو دو ماہ ہو چکے تھے اور ان کے بڑھاپے کے علاوہ گھر کی تنہائی کو ختم کرنے کے لئے اس نے بے تکلفی کی دیوار کو جلد ہی ختم کر دیا تھا اور ایک بیٹی کی طرح نہ صرف ان کا خیال رکھتی تھی بلکہ ہر کام ان سے پوچھ کر اور ان کی پسند کے مطابق ہی اسے انجام دینے کی بھی کوشش کرتی تھی اور یہی خوبی حمیدہ بیگم کو اس کی بہت پسند آئی تھی ورنہ بیٹے کی شادی کے وقت ان کے دل میں ہزار اندیشے تھے لیکن حنا جیسی بہو پانے کے بعد ان کے تمام خدشے دم توڑ گئے تھے۔

''امی جان اگر آپ کہیں تو رات کی دال کے ساتھ تھوڑے سے چاول بنا لوں کیونکہ عمیر تو شام تک ہی آئیں گے اور رات کے کھانے میں کیا مینو رکھنا ہے وہ بھی بتا دیں تاکہ میں اس کی تیاری بھی شروع کر دوں۔''

حمیدہ بیگم نے داماد کو آفس میں ملنے والی ترقی پر رات کو بیٹی اور داماد کی دعوت رکھی تھی، انہوں نے ساری ناگوار سوچوں کو جھٹک کر اسے دیکھا جہاں صرف محبت و خلوص اور اپنائیت تھی وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو گئیں، جہاں اس کی ساری عادتیں اچھی تھیں وہیں اس کی گانے سننے والی اور خود بھی ساتھ گنگنانے والی عادت حمیدہ بیگم کو سخت ناپسند تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پہ پھیلی اپنائیت اور فکرمندی دیکھ کر ساری سوچوں کو جھٹکا اور رات کی دعوت کا مینو بتا کر خود بھی اس کی مدد کا ارادہ کر کے اس کے ساتھ جانے کے لئے اٹھنے لگیں انہیں اٹھتا دیکھ کر حنا نے انہیں ٹوکا۔

''ارے امی جان آپ کیوں تکلیف کر رہی ہیں میں کر لوں گی سب۔''

''ارے نہیں بیٹا تکلیف کیسی مجھ بڑھیا کو بھی کچھ ہاتھ پیر ہلانے دیا کرو کبھی کبھی۔'' وہ اس کے خلوص کے آگے شرمندہ ہوتی اس کے ساتھ ہی چل دیں۔

☆☆☆

نومبر کا مہینہ ختم ہونے لگا تھا، موسم نے سرد ہواؤں کے استقبال کے لئے اپنی بانہیں وا کر دی تھیں، دعوت بخیر و خوبی انجام کو پہنچ چکی تھی ان کا بیٹا عمیر کھانے کے بعد بہن اور بہنوئی کو چھوڑنے چلا گیا تھا، حنا ان لوگوں کے جانے کے بعد ڈائننگ روم اور کچن صاف کرنے کے بعد اب برتنوں کا ڈھیر سنک میں رکھے دھو رہی تھی، حمیدہ بیگم اپنے کمرے میں عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں، حسب معمول موبائل پہ وہی اس کی پسند کا عاطف اسلم کا گانا چل رہا تھا۔

دوری سہی جائے ناں، سہی جائے ناں

حمیدہ بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے سنک کے پاس کھڑی حنا کو دیکھا جو اب برتن دھونے کے بعد سنک اور سلیب کی صفائی کر کے چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی، تھوڑی دیر میں چائے کی ٹرے لئے حنا کمرے میں داخل ہوئی تو حمیدہ بیگم نے اپنے اوپر چادر اچھی طرح پھیلا کر اوڑھتے ہوئے ٹیبل پہ چائے رکھتی حنا کو دیکھا جو ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھنے لگی تھی، انہوں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھا لیا پھر اپنے اوپر پھیلی ہوئی چادر کا ایک سرا اس کی ٹانگوں پر بھی ڈال دیا، اس نے حیرت سے اپنی ساس کو دیکھا جنہوں نے اپنے اوپر پھیلی چادر کا سرا اس کے اوپر ڈال دیا تھا، اس نے ٹرے میں رکھی چائے اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی اور دوسرا کپ ان کے لئے اٹھا لیا۔

''امی آج کی دعوت کیسی رہی کھانا ٹھیک لگا ناں آپ کو۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے ذہن میں کلبلاتے سوال کو آخر زبان دے دی اس کے سوال پر حمیدہ بیگم مسکرائیں، گویا انہیں اس سے اسی سوال کی توقع ہو۔

''ہاں بیٹا بہت اچھی رہی تمام انتظام ہر طرح سے مکمل تھا، کھانا بھی تم نے بہت لذیذ بنایا تھا کہیں کوئی ادھوراپن نہیں تھا۔'' حمیدہ بیگم کے توصیفی انداز پر اسے دن بھر کی تھکن اور محنت پل بھر میں وصول ہو گئی اس کے اندر اطمینان کی لہریں اترنے لگیں۔

''لیکن بیٹا اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔''

''جی امی جان آپ میری ماں کی طرح ہیں میں آپ کی بات کا برا کیوں مانوں گی۔'' اس نے چائے کا خالی کپ ان کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پہ رکھا۔

''بیٹا تم تھوڑی دیر پہلے اور صبح بھی ایک گانا سن رہی تھیں۔'' ان کے منہ سے گانے کا ذکر سن کر حنا کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

''بیٹا تم شرمندہ مت ہو مجھے پتا ہے تمہیں گانے سننے کا شوق ہے لیکن بیٹا تم ہر لحاظ سے ایک مکمل لڑکی ہو صورت اور سیرت میں یکتا اور اور تھوڑی بہت کمی اور خامی ہر انسان میں ہی ہوتی ہے مجھ میں بھی ہو گی۔'' حمیدہ بیگم نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو حیرت سے حنا نے اپنی ساس کو دیکھا جو اس بات کا اقرار کر رہی تھیں کہ کمی اور خامی ان میں بھی ہو گی جبکہ آج تو ہر انسان اپنے آپ کو کمیوں اور خامیوں سے مبرا سمجھتا ہے۔

''بیٹا ہم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ دنیا داری کو نبھانے اور رشتوں کے ادھورے پن کو اپنی خدمتوں سے پورا کرنے میں اپنے رب سے ہم کتنے دور ہو گئے ہیں اور یہ دوری ہمارے اپنے اندر کتنا ادھورا پن پیدا کر رہی ہے یہ دوری اور ادھورا پن ہمیں جہنم کے کس درجے میں لے جا کر پھینکے گا ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہے، اللہ تو ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور ہم سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہے لیکن ہم اس کے کیسے بندے ہیں اپنے رب کی محبت اور قربت کی ہمیں ذرا بھی قدر نہیں ہے اور اس دنیا کی خاطر اس دنیا کو راضی کرنے اور نفس کو خوش کرنے کے لئے ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے رب کی قربت کو دوری میں بدل رہے ہیں، ہم خدا اور بندے کے درمیان اس انمول رشتے کو پہچان ہی نہیں پا رہے، ہمارا اور رب کا تعلق بہت مضبوط ہے لیکن اپنی نفسانی خواہشات اور دنیا کو ترجیح دے کر ہم اس رشتے کو خود ہی کمزور کر رہے ہیں اور اگر یہ کمزور ہو گیا تو خدانخواستہ ٹوٹ نہ جائے اور جو رشتہ ٹوٹ جائے وہ زندگی کی شاخ سے گرے پتے جیسا ہوتا ہے نیچے گر گیا اور پھر سوکھ گیا تو پھر کم ہی ہرا ہوتا ہے اور میں اپنے رب سے جڑے رشتے کو اپنی فرماں برداری اور دعاؤں کے ذریعے قربت میں بدلنا ہے اور یہ قربت شیطان کے کلام سے نہیں اللہ کے کلام سے حاصل ہو گی اس لئے میں چاہوں گی کہ جہاں میری بیٹی ہر رشتے میں مکمل ہے وہیں اپنے رب سے بندھے رشتے میں ادھوری نہ رہے بدلوں گی ناں پھر اس دوری کو قربت میں۔'' حمیدہ بیگم نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے سوال کیا تو حنا نے گیلی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور ان سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

یارمن

نائلہ طارق

جس طرح چمکتے دمکتے دن کو رات اپنی تاریکی میں گم کرلیتی ہے کچھ اسی طرح تنہائی اور غم کے سیاہ پردوں نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، آنکھیں سمندر اور روح صحرا بن چکی تھی، سالوں پہلے اچانک اس کا بے نام ونشان وجود زمین سے آسمان پہ پہنچ کر معتبر بن گیا تھا اور اب ایک ہی جھٹکے میں آسمان سے گر کر زمین پر ایسا بکھرا ہے کہ کوئی ہاتھ بھی ایسا نہ رہا تھا جو بڑھ کر اس کے بکھرے وجود کے ٹکڑے سمیٹ لیتا، بس اب تو ایک موہوم سی امید تھی مگر شاید اسے بھی معدوم ہو کر ختم ہو جانا تھا، ڈبڈبائی نظروں سے اس نے وسیع وعریض صحن میں پھیلے گھمبیر سناٹے کو دیکھا تھا، سکھ چین کے ساکت پیڑ پر بیٹھی چڑیا بھی سوگوار تھی، پلکیں بھینچ کر اس نے آنسوؤں کو رخساروں پر بہنے دیا تھا اور پھر لرزتے قدموں کے ساتھ برآمدے کے یخ بستہ چکنے فرش پر آگے بڑھتی ڈرائنگ روم کی ادھ کھلی کھڑکیوں کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی، مانوس آوازیں ابھر رہی تھیں، اس کی قسمت کا فیصلہ اب ایک ایسے انسان کے ہاتھ میں تھا جس سے نہ اس کا کوئی خونی رشتہ تھا، نہ قانونی، نہ شرعی رشتہ اور نہ ہی دل کا، یہ کیسا عجیب وغریب معاملہ تھا کہ کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود اس انسان کے ہاتھ میں ہی آر یا پار کرنے کے فیصلے آ چکے تھے، ابھرتی آوازوں کو سنتے ہوئے اس کا دل لرز رہا تھا، سسکیاں حلق میں ہی گھٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

''تم یہ جانتے ہو کہ شکیب کی آخری وصیت کیا تھی اور اب بھابھی کی وصیت بھی وہی ہے۔''

''انکل! میں یہ سب جانتا ہوں مگر امی اور ابو یہ بات جانتے تھے کہ میرے لئے وہ سب کرنا ممکن نہیں جو وہ دونوں چاہتے تھے۔''

مکمل ناول

''شاہ زیب! یہاں بات تمہارے مرحوم ماں باپ کی وصیت کی ہو رہی ہے۔'' احسان اللہ نے مشک لہجہ میں تیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جتایا تھا، تذبذب کے ساتھ پہلو بدلتا وہ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکا تھا۔

''انکل! میں پہلے ہی بہت زیادہ ڈپریشن میں ہوں، میں بالکل بھی ابو یا امی کی وصیت کے خلاف نہیں جانا چاہتا مگر میں مجبور ہوں، سب جانتے ہیں پچھلے پانچ سال سے میں کمیٹڈ ہوں۔''

''اور یہ تم بھی جانتے ہو کہ تمہاری اس کمٹمنٹ سے تمہارے ماں باپ راضی نہیں تھے۔'' احسان اللہ گود میں رکھی فائل کی ورق گردانی کرتے یاد دلا رہے تھے۔

''مگر مجھے یقین تھا کہ میں ان دونوں کو راضی کر لوں گا مگر دو سال پہلے ابو کے اچانک جان لیوا ہارٹ اٹیک اور پھر امی......'' وہ بات مکمل نہیں کر سکا تھا، ماں کی یاد نے کوئی کند چھری اس کے دل میں اتار دی تھی، زخم تازہ تھا، یہ زخم تو کبھی بھرنے والا ہی نہیں تھا، اس کی سرخ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

''شاہ زیب! میں تمہاری مشکل کا اندازہ کر سکتا ہوں، بھابھی کی اتنی اچانک وفات تمہارے لئے کسی سانحے سے کم نہیں، لیکن یہ میرے پیشے کے فرائض میں شامل ہے کہ ان وصیتوں کے بارے میں تم سے بات کروں، اگر تمہیں جلدی واپس نہ جانا ہوتا تو میں ان معاملات پر کچھ وقت کے بعد بات کرتا۔'' اس کی اذیت کو محسوس کرتے ہوئے احسان اللہ معذرت خواہانہ انداز میں بولے تھے۔

''میں جانتا ہوں، آپ اپنا کام کر رہے ہیں۔'' وہ بولا تھا۔

''صرف کام نہیں شاہ زیب، یہ میری ذمہ داری بھی ہے، تمہارے ماں باپ سے جو میرا تعلق رہا ہے وہ مجھے حق دیتا ہے کہ ان کے ادھورے کاموں اور خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔'' احسان اللہ کے کہنے پر وہ بس سر ہلا سکا تھا۔

''وصیت کے مطابق یہ گھر طروب کے اور تمہارے نام ہے کیونکہ وہ پر یقین اس دنیا سے گئے ہیں کہ تم اور طروب ایک ہو جاؤ گے، بھابھی کے اکاؤنٹ میں جو رقم ہے اور ان کے جو زیورات وہ مکمل طروب کی ملکیت اور اس کی شادی کے لئے مختص ہیں جبکہ شکیب کا اکاؤنٹ تو پہلے ہی تمہارے نام ہو چکا اور......''

''انکل! میرے باپ نے میری پرورش اس طرز پر کی ہے کہ اسٹوڈنٹ لائف سے ہی میں سیلف میڈ تھا، یہ میرے ماں باپ کی ہی اسپورٹ ہے، آج میرے اپنے پاس سب کچھ ہے، میرے ذہن میں یہ سوچ کبھی آئی ہی نہیں کہ میں جائیداد کا تنہا وارث ہوں، امی ابو سے طروب کو جو کچھ ملا ہے وہ اس کا حق ہے، میرے ماں باپ نے اسے بیٹی کا پیار عزت احترام دیا تو اس نے بھی ان دونوں کو وہی احترام اور عزت دی جس کے حق دار ماں باپ ہوتے ہیں، میرے حصے کا جو کچھ ہے آپ وہ سب بھی طروب کے نام کر دیں اور بس مجھے اس مشکل سے نکال دیں، آپ تجربہ کار وکیل ہیں، آپ کے لئے درمیان کا راستہ نکالنا مشکل نہیں۔'' وہ ایک بار پھر التجا کر رہا تھا۔

''زیب! تم اپنے ماں باپ کے اس محنت سے بنائے گھر سے دستبردار ہو سکتے ہو، ان کی محنت سے بنائی گئی ہر چیز سے دستبردار ہو سکتے ہو یہاں تک کہ طروب سے بھی دامن چھڑا سکتے ہو

مگر کیا تم جانتے ہو کہ ایک انسان کی آخری خواہش کی اہمیت کیا ہوتی ہے؟''

کچھ تھا احسان اللہ کے سنجیدہ لہجے میں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں سکا تھا۔

''ایک انسان کی آخری خواہش اس کی پچھلی تمام زندگی کا نچوڑ ہوتی ہے، حاصل ہوتی ہے، اکثر یہ آخری خواہش انسان کے لئے آخری سانسوں میں سرخروئی، قبر میں سکون اور آخرت میں نجات کا باعث بن جاتی ہے، انسان کا حق ہوتا ہے یہ اس کے اپنوں پر کہ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کی ہر ممکن کوشش کریں اور یہاں تو دو انسانوں کی آخری خواہش کا معاملہ ہے، انسان بھی وہ جو تمہارے ماں باپ ہیں، کم از کم میں ان دونوں سے دغا نہیں کر سکتا تھا، درمیان کا کوئی ایک کیا اگر سو راستے بھی نکلتے تو بھی میں تمہیں یہی مشورہ دیتا کہ اپنے ماں باپ کی خواہش پر عمل کرو، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر طروب کو تم سے منسوب کیا ہوگا، تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہ ہو مگر طروب کو تمہاری ضرورت ہر چیز سے زیادہ ہے، ہر چیز سے، ہر چیز سے نظر چرا کر تم اپنی مرضی کر کے بھی طروب کی ذمہ داری سے دستبردار نہیں ہو سکو گے، ہاں اگر اسے دھتکار کر تم اپنے ماں باپ کی سالوں کی ریاضت کو خاک میں ملانا چاہو تو میں ذمہ دار نہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا، طروب میرے گھر کی فرد ہے، میرے ماں باپ کی اہم نشانیوں میں سے ایک ہے۔'' احسان اللہ کے آخری جملے اسے تیر کی طرح لگے تھے۔

''یہ فائل میں چھوڑ جاتا ہوں، اسے پڑھ لینا، طروب ابھی صدمے میں ہے، بہتر ہے کہ موقع دیکھ کر ان معاملات پر تم اس سے بات کرو، باہمی طور پر جب کوئی فیصلہ کر لو تو مجھے آگاہ کر دینا۔'' فائل سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے احسان اللہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، وہ ذہنی طور پر اتنے انتشار میں مبتلا تھے کہ احتراماً ان کے لئے صوفے سے اٹھ بھی نہیں سکا تھا، لیکن ساری گفتگو کے دوران اس کا چچازاد اور دوست شاہ میر احسان اللہ کو باہر تک چھوڑنے چلا گیا تھا، واپس آیا تو شاہ زیب فائل پر نظر جمائے کسی گہری سوچ میں گم نظر آیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' دائیں جانب صوفے پر براجمان ہوتے شاہ میر نے پوچھا تھا۔

''سچ پوچھو تو میں کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں رہا ہوں، دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔'' اضطرابی انداز میں اس نے انگلیاں بالوں میں پھیری تھیں۔

''ہم طروب کو یہاں تنہا چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے۔'' شاہ میر کے کہنے پر شاہ زیب نے گہری سانس لی تھی۔

''تم ہی کوئی مشورہ دو، کیا کروں میں؟'' وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔

''تم شہرینہ سے تعلق توڑ نہیں سکتے، طروب سے جوڑ نہیں سکتے، اس سب کے بغیر تم طروب کو اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتے، طروب تنہا یہاں رہ نہیں سکتی، کہیں کوئی گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔'' شاہ میر سوچتے ہوئے بولا تھا۔

''تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ذرا ہمت کر کے طروب سے نکاح کر لو اور پھر شہرینہ سے شادی کر لو، تم راضی کر سکتے ہو شہرینہ کو، طروب بھی کوئی اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں، ویسے بھی وہ جانتی ہے کہ تم اس کے لئے انکار کر چکے تھے اور شہرینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''شاہ! میرا سر پھٹ رہا ہے، لہٰذا تم یہ

بکواس بند کر دو۔'' وہ شدید ناگواری سے بول اٹھا تھا۔

''شاہ زیب! جب تم اپنے فیصلوں میں لچک نہیں لگاؤ گے تو درمیانی راستے بھی اسی قسم کے نکلیں گے۔'' شاہ میر اس سے بھی زیادہ ناگواری سے بولا تھا۔

''تم حقیقت سے کیوں نگاہ چرا رہے ہو، تائی جان اور تایا جان نے نیکی کا جو بیڑہ اٹھایا تھا اب اسے تم نے ہی آگے بڑھانا ہے، یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم اس کی شادی کسی اچھے انسان سے کروا کر فرض پورا کر دو گے، کسی برے انسان کے حوالے بھی اسے کرنا چاہو گے تو وہ پہلے اس کے حقیقی ماں باپ کے بارے میں، اس کے حسب نسب، نسل کے بارے میں پوچھے گا، پھر کیا جواب دو گے؟ کون اس سچ کے ساتھ اسے ساتھ عزت سے لے جائے گا کہ اسے یتیم خانے کے باہر ایک جھولے سے اٹھا کر تمہارے ماں باپ کے حوالے کیا گیا تھا، بالغرض اگر اسے قبول کرنے والا کوئی اچھا انسان مل بھی گیا تو کون ضامن بنے گا کہ وہ اسے طعنہ نہیں دے گا اس کی سچائی کا، کیا ضمانت ہو گی کہ وہ انسان طروب کو عزت و احترام دے گا؟''

''میں نے زندگی میں اس سے زیادہ مشکل حالات کا سامنا کبھی نہیں کیا، کچھ ٹھیک ہوتا نظر نہیں آ رہا شاہ۔'' تھکے تھکے مضمحل انداز میں وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر گیا تھا، اس کے اترے چہرے کو دیکھتے ہوئے شاہ میر کو اس پر ترس آیا تھا۔

''فی الحال یہ کرو کہ طروب کو ساتھ لے کر چلو۔''

''میں اسے ساتھ لے کر کہاں جاؤں گا؟'' شاہ زیب زچ ہوا تھا۔

''اپنے گھر اور کہاں۔'' شاہ میر بولا تھا۔

''دو چار دن وہاں رہ کر طروب بھی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جائے گی تو اسے اعتماد میں لے کر یہ سمجھانا کہ تمہاری شادی ہونے تک اسے ہاسٹل میں رہنا ہو گا، ویسے مجھے لگتا نہیں کہ اس جنم میں شہر بینہ تم سے شادی کرے گی البتہ اس جنم میں لازماً تمہیں کنگال کر کے دنیا سے جائے گی۔'' شاہ میر کے تلخ طنزیہ لہجے پر شاہ زیب نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی تھی مگر کچھ بولا نہیں تھا کہ وہ کسی حد تک سچ ہی بول رہا تھا۔

''فی الحال تو یہی کرنا پڑے گا، تم جا کر طروب سے کہو اپنا ضروری سامان پیک کر لے، ہم کل ہی جا رہے ہیں۔'' اس کے فیصلہ کن لہجے پر شاہ میر اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

''ویسے میرے بجائے اگر تم جا کر اس سے بات کرتے تو زیادہ اچھا تھا، تائی امی کی آخری رسومات سے لے کر اب تک تم اس کے پاس نہیں گئے ہو، ہمدردی کے دو لفظ ہی کہہ دو اس سے، ڈھارس ملے گی اسے۔'' شاہ میر نے جاتے جاتے رک کر کہا تھا۔

''اس کا اور میرا غم الگ الگ نہیں ہے شاہ، مجھے دیکھ کر اس نے بس رونا ہے، گزرے پانچ دن سے وہ یہی ایک کام کر رہی ہے اور میں اس کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔'' اس کے مدھم گمبھیر لہجے پر شاہ میر خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆
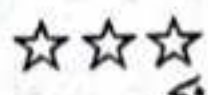
کمرے میں بچھی سفید چاندنی پر وہ دیوار سے پشت لگائے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی، اس کی مدھم سسکیاں سوگوار خاموشی میں پھیل رہی تھیں، شاہ میر چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا تھا اور پھر کچھ فاصلے پر خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

''طروب!'' شاہ میر کی پکار پر وہ بمشکل سسکیاں روکتی سر اٹھا سکی تھی۔

''صبر تو کرنا پڑے گا، اپنے آپ کو سنبھالو، جو ہوا اللہ کی رضا ہے، ہم سب ہی کو ایک نہ ایک دن لوٹ کر اس کے پاس جانا ہے، تمہاری اتنی گریہ وزاری تائی جان کی روح کو تکلیف پہنچائے گی۔'' وہ نرم لہجے میں سمجھا رہا تھا۔

''وہ میرے بغیر ایک پل بھی نہیں رہتی تھیں، میرے بغیر ان کو نیند بھی نہیں آتی تھی اور آپ سب نے ان کو میرے بغیر قبر میں اتار دیا، مجھے بھی مر جانا چاہیے تھا، ان کے سوا میرا کوئی نہیں رہ گیا تھا، ان کے بعد میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں کوئی نہیں ہے میرا۔'' زار و قطار روتی وہ بول رہی تھی۔

''تم بالکل تنہا نہیں ہو طروب، میں تمہارے ساتھ ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شاہ زیب تمہارے ساتھ ہے، تم دونوں کا دکھ ایک ہے تم دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہو۔'' شاہ میر اپنے لفظوں پر زور دیتا اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا، مگر طروب کے آنسوؤں کی شدت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

''شاہ! آپ کہیں آ کا جان سے مجھے اپنے ساتھ لے چلیں، میں ان کے گھر کے ایک کونے میں رہ لوں گی، کبھی کچھ نہیں مانگوں گی، ان کے سامنے بھی نہیں آؤں گی بس وہ مجھے اپنے گھر لے چلیں ورنہ میں مر جاؤں گی، میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کر لوں گی۔''

''چپ رہو، بری بات ہے ایسی کفر کی باتیں نہیں کیا کرتے۔'' وہ ڈپٹنے والے انداز میں بولا تھا۔

''مجھے تمہارے آ کا جان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اسے بہت فکر ہے تمہاری، اسی لئے تو وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔'' شاہ میر کی اطلاع پر اس نے اپنی بے تحاشہ سوجی ہوئی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، تم اپنا ضروری سامان پیک کر لو، ہم کل ہی روانہ ہو رہے ہیں۔'' اس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں تیرتی بے یقینی کو بھانپ کر شاہ میر نے مزید کہا تھا۔

''اب تم منہ دھو کر کچن میں چلو، آج بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا، زبردستی ہی سہی میرے ساتھ تھوڑا سا کھانا کھاؤ پھر میں اپنے اور تمہارے لئے چائے بناؤں گا، صحن کی کھلی فضا میں بیٹھ کر ہم چائے پئیں گے اور باتیں کریں گے، ہمت کرو، اٹھو تم بہت مضبوط اور بہادر لڑکی ہو۔'' اس کے نا چاہنے کے باوجود شاہ میر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ونڈو کے قریب آ کر شاہ زیب نے صحن کی جانب نگاہ ڈالی تھی، جہاں طروب اور شاہ میر کرسیوں پر بیٹھے تھے، شاہ میر اس سے کوئی بات کہہ رہا تھا جسے وہ سر جھکائے سن رہی تھی، ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال نے سر اٹھایا تھا، دل نے بھی جس کی تائید کی تھی، اسی بارے میں سوچتا وہ ونڈو سے دور ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

انسان کی خواہشات بھی لامحدود ہیں، ایک پوری ہوتی نہیں کہ دوسری راستے میں آ کھڑی ہوتی ہے، بعض اوقات زندگی جیسے خواہشات کا ایک سفر لگتی ہے جو کبھی مکمل ہوتا ہی نہیں، نہ جانے کتنی ان گنت خواہشات تو انسان دل میں ہی چھپائے فنا ہو جاتا ہے، اس سفر میں۔

شادی کے دس سال بعد قدسیہ اور شکیب حسن کو قدرت نے اولاد کی نعمت سے نوازا تو جیسے

صحرا جل تھل ہو گیا، وہیں دونوں کے دل میں بیٹے کے بعد ایک بیٹی کی خواہش نے بھی جڑ پکڑ لی، بس ایک بیٹی کی ہی کمی رہ گئی تھی ان کی زندگی میں مگر اللہ کی مصلحت کہ قدسیہ دوبارہ ماں نہ بن سکیں، بیٹے کی پرورش میں گم ہو کر بھی وہ ایک بیٹی کی خواہش کو بھول نہ سکی تھیں، وقت انتظار اور امید کے درمیان گزرتا رہا۔

کالج میں ایڈمیشن کے لئے جب شاہ زیب کو اپنے چھوٹے شہر سے ایک بڑے شہر کی جانب رخصت ہونا پڑا تو گھر کے سناٹے اور خاموشی سے ہول کر قدسیہ نے ایک عجیب فیصلہ شکیب حسن کے ساتھ مل کر کیا، وہ ایک بچی ایڈاپٹ کرنا چاہتی تھیں، بہت سوچ بچار کے بعد ان دونوں نے بیٹے سے بھی اس بارے میں بات کی تھی، اسے کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ شروع سے ہی وہ اپنے ماں باپ کی اس شدید خواہش سے آگاہ تھا، اس کے لئے یہ زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی اور پھر بالآخر قدسیہ اور شکیب حسن بہت چاہت اور ارمانوں کے ساتھ چھ سال کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور معصوم چہرے والی اپنی بیٹی کو گھر لے آئے، شکیب حسن نے اسے طروب نام دیا جو کہ اپنی بیٹی کے لئے انہوں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا، دونوں میاں بیوی طروب کو پا کر بے حد مسرور تھے، گھر کے سناٹے ٹوٹ گئے، ایک انوکھی سی رونق گھر کے در و دیوار پر چھا گئی تھی، یہ سب طروب کے مرہون منت تھا، بس چند دنوں ہی لگے تھے اسے قدسیہ اور شکیب حسن سے مانوس ہونے میں، دونوں کو ایک نئی مصروفیت اور ایک ذمہ داری بھی مل گئی تھی جسے وہ پوری ایمانداری سے نبھانے کی نیت رکھتے تھے، ویک اینڈ پر شاہ زیب جب گھر آیا تو پہلی بار اس نے طروب کو دیکھا، دو پونیاں باندھے، فراک پہنے اپنی ماں کا پلو پکڑے ان کے پیچھے پیچھے گھومتی اس مخلوق نے اسے کچھ کوفت میں مبتلا کیا تھا مگر شاہ میر جو اس کے ساتھ ہی ہاسٹل سے گھر آیا تھا، طروب کو دیکھ کر بہت ہنسا تھا، سارا وقت وہ طروب کو تنگ کرتا رہا تھا اور طروب اس سے ڈر ڈر کر کبھی قدسیہ، کبھی شکیب حسن کے پہلو میں چھپتی رہی تھی، قدسیہ کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ شاہ زیب اور شاہ میر سے دور دور اور سہمی سہمی ہی رہی تھی۔

قدسیہ ایک پرائیویٹ اسکول کی پرنسپل تھیں، طروب کا ایڈمیشن بھی انہوں نے اسی اسکول میں کروایا تاکہ طروب ان کے قریب اور نظروں کے سامنے رہے، گھر میں بھی وہ قدسیہ اور شکیب حسن کی توجہ کا مرکز بنی رہتی، دونوں جہاں جاتے طروب ان کے ساتھ ساتھ ہوتی، ان دونوں کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا مگر سب نے ہی طروب کو ان کی بیٹی کی حیثیت سے بخوشی قبول کیا تھا، طروب بہت ذہین اور فرمانبردار ثابت ہوئی تھی، مہذب طور طریقے، صحت مند ماحول مہیا کرنے والے، سکھانے والے ماں باپ کے زیر سایہ اس کی شخصیت نکھرنے لگی تھی، جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی، قدسیہ کے بے حد قریب ہو چکی تھی، دونوں ماں بیٹی کے ساتھ ساتھ سہیلیاں بھی تھیں، قدسیہ گھر کے معاملات میں بھی اس سے مشورہ لیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتی تھیں، طروب سے وہ دل کی ہر بات کر لیتی تھیں، شوہر سے یا بیٹے سے کوئی شکایت ہوتی تو وہ اس کے سامنے ہی بول کر دل کو ہلکا کر لیتیں، پھر جب طروب ان کے گلے میں باہیں ڈال کر یاد دلاتی کہ شکیب حسن اور شاہ زیب ان سے کتنی محبت کرتے ہیں تو اس کے یہ چند جملے سن کر وہ ساری شکایتیں بھول جاتیں، شکیب حسن اگر قدسیہ سے کسی بات پر ناراض ہو

جاتے تو اپنے ہر کام کے لئے طروب کو ہی پکارتے، طروب کو ان کی خدمت کر کے بہت خوشی ملتی تھی لیکن وہ ان کو قدسیہ سے ناراض بھی نہیں دیکھ سکتی تھی، لہٰذا ان کو منا کر وہ قدسیہ سے ان کی صلح کروا دیتی، زندگی کا یہ فیز بہت خوبصورت تھا، شکیب حسن اور قدسیہ کی زندگی میں اس کی قدر و اہمیت کسی طور شاہ زیب سے کم نہیں تھی، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ بھی اس کے اور شاہ زیب کے درمیان تکلف کی دیواریں نہ گر سکیں، نہ ہی دوری کم ہوئی، جب تک وہ چھوٹی تھی قدسیہ خود شاہ زیب کو اس کی طرف متوجہ کرتیں ورنہ تو شاہ زیب کے لئے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا، جب سمجھ دار ہوئی تو شاہ زیب کا نظر انداز کرنا اسے بہت محسوس ہوتا رہا تھا، لیکن یہ سچ تھا کہ شاہ زیب کی آمد اسے بہت اچھی لگتی تھی، اس کی سنجیدہ، پروقار شخصیت کی بناء پر طروب کی اس سے جھجک بھی ختم نہ ہو سکی، شاہ میر کو وہ مخاطب کر لیا کرتی تھی، کیونکہ وہ خود بہت باتونی اور ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق تھا، طروب کو کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی کہ اتنی متضاد عادتوں کے باوجود شاہ زیب اور شاہ میر کے درمیان اتنی گہری دوستی تھی، طروب کو شاہ میر کے گھر جانا بھی بہت پسند تھا، شاہ میر کے والد شہباز حسن کے گھر میں سب ہی اسے بہت پیار کرتے تھے، شکیب حسن کے یہ ایک ہی چھوٹے بھائی تھے، جن کی تین اولادیں تھیں، دو بیٹے اور ایک بیٹی، سب سے چھوٹا شاہ میر تھا، شاہ میر کی بہن کی شادی ہونے تک سب کچھ ٹھیک تھا، اس کے بعد ایک ہولناک خبر آئی کہ شہباز حسن کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، حادثے میں ان کی بیوی بھی گاڑی میں ان کے ساتھ موجود تھیں، جو زخمی تھیں ان سب کے لئے یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا مگر شکیب حسن تو بالکل ہی نڈھال ہو گئے، اکلوتے بھائی کی اس ناگہانی موت نے ان کو بری طرح جھنک کر رکھ دیا تھا، سب نے ہی ان کی دلجوئی کی، ان کی زندگی کی طرف لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ پھر مسکرا نہیں سکے کبھی، اندر ہی اندر پلتے دکھ نے ان کو ہارٹ پیشنٹ بنا دیا تھا، شاہ زیب اور شاہ میر کی اسٹڈیز ابھی جاری تھی، اسی دوران شاہ میر کے بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں اور ماں کے ساتھ متحدہ عرب امارات شفٹ ہو گئے، انہوں نے شاہ میر کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی مگر اسٹڈیز اور پھر شاہ زیب کی وجہ سے وہ ملک چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوا۔

اپنی اسٹڈیز کے دوران شاہ زیب کو ایجوکیشن کے نظام سے بہت شکایتیں رہی تھیں، شاہ میر اور وہ دونوں ہی اسٹڈیز مکمل کرنے کے بعد ایجوکیشن کے شعبے سے متعلق پریکٹیکل لائف کا آغاز کرنا چاہتے تھے اور پھر ایسا ہی ہوا، دونوں کی دن رات کی محنت سے ایک اکیڈمی کی بنیاد قائم ہو گئی، اس مصروفیت میں شاہ زیب اپنے ماں باپ سے بالکل غافل نہیں رہا، دل ہی دل میں وہ طروب کا شکر گزار تھا کہ کتنی دلجمعی سے اس کے ماں باپ کے ساتھ ساتھ گھر کے نظام کو بھی سنبھال رہی ہے، قدسیہ کے لاکھ سمجھانے کے باوجود طروب نے کالج کی تعلیم کا آغاز پرائیویٹ طور پر ہی کیا، وہ کسی بھی طرح شکیب حسن اور قدسیہ سے چند گھنٹوں کے لئے بھی دور نہیں جانا چاہتی تھی، اب ان دونوں کو اس کی زیادہ ضرورت تھی، دونوں اب عمر کے اس حصے میں تھے جہاں ان کو اب اولاد کی توجہ کی، ان کے وقت کی ضرورت تھی، یہ سب شاہ زیب بھی جانتا تھا، اس نے کئی بار ماں باپ سے کہا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ چلیں اب اس شہر میں کیا رکھا ہے مگر

نہ شکیب حسن تیار ہوئے نہ قدسیہ، جو ذمہ داریاں شاہ زیب کی تھیں طروب نے وہ بھی بخوبی سنبھال لیں، اس کے دن رات شکیب حسن اور قدسیہ کی خدمت اور اپنی پڑھائی میں گزرتے ہوئے تھے، شکیب حسن کی گرتی صحت اور اپنے کچھ ہیلتھ پرابلمز کی بناء پر بہت پہلے ہی قدسیہ پرنسپل کی جاب سے ریزائن کر چکی تھیں، گزرتے وقت اور بدلتے حالات نے قدسیہ کو طروب کی طرف سے فکر مند کرنا شروع کر دیا تھا، فکر مند صرف وہ ہی نہیں شکیب حسن بھی تھے۔

جب انہوں نے طروب کے لئے شاہ زیب کا نام لیا تو شوہر کی زبان سے اپنے دل کی بات سن کر قدسیہ کو یک گونہ سکون حاصل ہوا تھا، طروب کیسے اس فیصلے سے بے خبر رہ سکتی تھی گو کہ قدسیہ نے صاف طور پر اس سے کوئی بات نہ کی تھی، طروب کو یہ بات نہ بہت عجیب لگی نہ اس بات نے اسے ورطہ حیرت میں ڈالا، گزرے کچھ ماہ و سال میں اتنا بدلاؤ تو آیا تھا کہ شاہ زیب اسے مخاطب کر لیتا تھا، گھر سے دور فون پر وہ ماں باپ کی صحت یا گھر کے معاملات کے بارے میں اس سے بات کر لیتا تھا، کبھی اس کی اسٹڈیز کے بارے میں اور خیریت بھی پوچھ لیتا تھا اور یہ بھی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، طروب کو بہت خوشی ہوئی تھی اس کی سرسری اپنائیت پر بھی، شکیب حسن اور شاہ زیب گھر اور اس کی زندگی کے بھی مضبوط سہارے تھے اور وہ ان دونوں سے بہت محبت رکھتی تھی۔

قدسیہ کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے بیٹے کی زندگی میں پہلے سے ہی ایک لڑکی موجود ہے، شہرینہ سے شاہ زیب کی ملاقات ایک بنک میں ہوئی تھی جہاں وہ جاب کرتی تھی۔ ظاہر ہے اس کی طرف متوجہ ہونے کی پہلی وجہ اس کی بلا کی خوبصورتی ہی تھی، بقول شاعر میر کے کہ اور کوئی وجہ ہی نہیں تھی صرف اس خوبی کے علاوہ شہرینہ کے پیچھے خوار ہونے کی۔

شاہ زیب اس کا طنز ان سنی کر دیتا تھا کہ یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا، خود اس پر شہرینہ کے جوہر آہستہ آہستہ کھلے، بنک کی جاب اس کا ٹارگٹ نہیں تھی، اس کی دلچسپی فیشن ڈیزائننگ اور ماڈلنگ میں تھی، شاہ زیب سے تعلق گہرا ہونے تک وہ ماڈلنگ کی فیلڈ میں قدم رکھ چکی تھی، شاہ زیب بہت کنزرویٹو تو نہیں تھا، مگر اس حد تک براڈ مائنڈ بھی نہیں تھا کہ اس عورت کو مجمعے میں کیٹ واک کر کے اپنی نمائش کرواتا دیکھ سکتا جسے وہ اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے، زور زبردستی کرنا اس کی خصلت میں شامل نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ فنانشلی طور پر شہرینہ ویک ہے، شاہ زیب کے روکنے پر اس نے ماڈلنگ سے خود کو روک لیا تھا مگر شاہ زیب یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے صرف وقتی طور پر ایسا کیا ہے نہ صرف شاہ زیب کو متاثر کرنے کے لئے بلکہ اس کی سپورٹ حاصل کرنے کے لئے، البتہ مصلحت کے تحت اس نے فیشن ڈیزائننگ سیکھنے اور اس میں کام اور تجربہ حاصل کرنے تک خود کو مصروف کر لیا۔

شاہ زیب کے دل میں واقعی اس کی قدر بہت بڑھ گئی تھی کہ وہ اس کی ناراضی کے ڈر سے اپنے جنون کو ترک کر گئی تھی۔

ایسے میں اپنے ماں باپ کی خواہش اور فیصلے کو سن کر اس کا ششدر ہو جانا ایک فطری عمل تھا، وہ کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا لہٰذا بہت نرمی سے اس نے شکیب حسن اور قدسیہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ طروب اور اس کا میچ بہت مضحکہ خیز ہے، عمر کے بارہ پندرہ سال کے فرق کو نظر انداز کرنا اس کے لئے ناممکن ہے، وہ

کسی میچور لڑکی سے شادی کرے گا جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی ہو، اسے یہی بہتر لگا تھا کہ وہ شہرینہ کے بارے میں سب کو بتا دے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا، شکیب حسن اور قدسیہ کا ردعمل سرد تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوا تھا، لہٰذا سارے معاملے سے شہرینہ کو آگاہ کر کے وہ ایک دن اسے ساتھ لے آیا قدسیہ اور شکیب حسن سے ملوانے۔

ناگواری کے باوجود قدسیہ بہت اچھی طرح شہرینہ سے ملی تھیں مگر اس کا ضرورت سے زیادہ محبت اور لگاؤ کا اظہار قدسیہ کو اندر ہی اندر بددل کر گیا تھا، شکیب حسن کا رویہ سنجیدہ ہی تھا، شہرینہ کی آمد پر انہوں نے نہ کسی خوشی کا اظہار کیا نہ ہی ناگواری کا۔

طروب کو تو ہر صورت شہرینہ کا استقبال کرنا ہی تھا، سارا وقت وہ شہرینہ کے آگے پیچھے ہی گھومتی رہی تھی، سارا دن گزار کر جب شہرینہ اور شاہ زیب رخصت ہوئے تو ایک جامد خاموشی ہر سمت چھا گئی، قدسیہ اور شکیب حسن اپنی اپنی جگہ بالکل خاموش اور سوچ میں گم نظر آئے، جان بوجھ کر طروب بہت دیر تک شہرینہ کی تعریفیں کر کے ان کو بولنے پر مجبور کرتی رہی تھی، مگر ان دونوں کو زیادہ دلچسپی نہ لیتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

شاہ زیب مایوس نہیں ہوا تھا یہ جان کر بھی کہ شہرینہ سے ملنے کے بعد بھی اس کے ماں باپ قائل نہیں ہوئے، اس معاملے میں اسے درمیان میں طروب کو لانا پڑا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ طروب کی بات نہیں ٹالیں گے اور طروب اس کی بات نہیں ٹال سکتی تھی، اسے جب موقع ملتا وہ قدسیہ اور شکیب حسن سے شہرینہ کے بارے میں بات کرتی، اس کی ان خوبیوں کا ذکر کرتی جن کے بارے میں اسے خود بھی پتہ نہیں تھا، طروب نے ہی شاہ زیب سے کہا تھا کہ شہرینہ کو فون پر قدسیہ سے رابطہ رکھنا چاہیے اور ایسا ہی ہوا تھا، بہر حال کوششیں جاری تھیں، طروب جانتی تھی کہ قدسیہ اور شکیب حسن، شہرینہ کو ناپسند نہیں کرتے مگر وہ بس شاہ زیب کے ساتھ طروب کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کو سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے، ایسے میں اپنے لئے ان کی فکر اور محبت پر جہاں اس کا دل پگھلنے لگتا وہیں وہ اس چیز کے لئے شرمسار تھی کہ اس کا وجود شاہ زیب کی چاہت کے آگے دیوار بن گیا ہے، شکیب حسن کو قائل ہونا تھا نہ وہ ہوئے، ان کی آخری خواہش سے اندازہ ہو گیا تھا، ان کے دنیا سے گزر جانے کے بعد قدسیہ سے اس معاملے پر بات کرنا بیکار تھا، شاہ زیب نے ان سے کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنی خوشی اور رضا سے شہرینہ کو قبول نہیں کریں گی وہ شادی نہیں کرے گا، شاہ زیب کے اس فیصلے پر قدسیہ نے خاموشی ہی اختیار رکھی مگر اپنے آخری وقت میں مرحوم شوہر کی وصیت بیٹے کو یاد دلاتے ہوئے انہوں نے طروب کی ذمہ داری شاہ زیب کے حوالے کر دی تھی جس سے وہ بیزار نہیں تھا مگر اسے اس طرح بھی اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس طرح اس کے ماں باپ چاہتے تھے۔

☆☆☆

پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد وہ ٹیرس کی طرف آ گئی تھی، کچھ دیر پہلے ہی وہ تینوں پہنچے تھے، سفر کے دوران اس نے محسوس کر لیا تھا شاہ زیب کا انجان، لاتعلق رویہ، وہ جانتی تھی کہ وہ شاہ زیب کے سر پر مسلط ہونے کے بعد اب اس کے گھر میں بھی ڈیرا ڈال رہی ہے اس کی مرضی کے خلاف لیکن وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی، شکیب حسن اور قدسیہ کی جدائی کے بعد اگر وہ زندہ تھی، تو

صرف شاہ زیب کے سہارے، اس سے الگ تنہا کہیں رہنے کا سوچ کر بھی وہ اپنی سانسیں رکتی محسوس کر رہی تھی، قدموں کی آہٹ پر اس نے چونک کر شاہ میر کو دیکھا تھا۔

''اب تو مطمئن ہو، کوئی پریشانی تو نہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''جی...... مگر آ کا جان۔''

''اس کی فکر چھوڑو اور میری بات ذرا غور سے سنو۔'' طروب کی بات کاٹتا وہ کچھ رازدرانہ انداز میں بولتا اسے چونکا گیا تھا۔

''شاہ زیب فون پر شہرینہ سے بات کر رہا ہے، کل وہ تم سے ملنے یہاں آ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ تم سے کوئی ایسی بات کہے جو تمہیں ناگوار گزرے، کوئی لحاظ مت رکھنا، اس کی کوئی بات ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مگر وہ مجھ سے ایسی کیا بات منوانا چاہے گی؟'' وہ حیران ہو کر بولی تھی۔

''یہ جلد ہی تمہیں پتہ چل جائے گا، ابھی کوئی سوال مت کرو، بس یہ ذہن میں رکھو کہ تمہیں اب اس گھر سے کہیں نہیں جانا ہے۔''

''میں کہیں اور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی شاہ، آپ مجھے کیوں خوفزدہ کر رہے ہیں؟ شہرینہ کیا مجھے آ کا جان کے ساتھ نہیں رہنے دے گی؟'' انجانا سا خوف طروب کے لہجے اور چہرے پر چھا گیا تھا۔

''میں تمہیں خوفزدہ نہیں بلکہ آگے کی صورتحال سے ہوشیار کر رہا ہوں، تمہیں کیا لگتا ہے کہ تایا اور تائی جان کی آخری خواہش کو جاننے کے بعد بھی وہ تمہیں شاہ زیب کے ساتھ اس گھر میں برداشت کرے گی؟'' شاہ میر کے خشمگین لہجے پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔

''لیکن جب تک ان کی شادی آ کا جان سے نہیں ہو جاتی تب تک تو ان کو یہاں میری موجودگی برداشت کرنی ہوگی۔'' وہ مدھم لہجے میں بولی تھی۔

''تمہارا دماغ درست ہے، جو غلطی شاہ زیب کرنا چاہتا ہے اس میں تم اس کی مدد کر رہی ہو۔'' شاہ میر کے ناگواری سے ڈپٹنے پر وہ سر جھکائے چپ رہی تھی۔

''پہلی بات تو یہ کہ وہ اگر شادی کرنے والی ہوتی تو پانچ سال سے تمہارے آ کا جان کو خوار نہ کر رہی ہوتی بالفرض اگر اچانک یہ معجزہ ہو جائے کہ وہ شادی فوری طور پر کرنے کے لئے تیار ہو بھی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس گھر میں آ کر اس نے تمہیں یہاں سے نکالنا ہے، میری باری تو بعد میں آئے گی۔'' شاہ میر کے یہ کہنے پر وہ بس رکی سانس کے ساتھ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مگر تمہیں اس گھر میں ہی نہیں شاہ زیب کی زندگی میں بھی اپنے قدم مضبوطی سے جمانے ہیں، تم سمجھ رہی ہو، میرے کہنے کا مقصد؟'' شاہ میر کے سوال پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔

''میں نے تو بہت کوشش کر لی مگر اب صرف تم ہی شاہ زیب کو شہرینہ کے سحر سے نکال سکتی ہو اور اس کے لئے تمہارا اس گھر میں رہنا بہت ضروری ہے۔'' شاہ میر کے مزید کہنے پر وہ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

''ایم سوری، میں نے یہاں آتے ہی تمہیں پریشان کر دیا مگر تمہیں خبردار کرنا بھی ضروری تھا۔'' اس کی خاموشی اور اترے چہرے نے شاہ میر کو شرمندہ کر دیا تھا۔

''میں پریشان تو پہلے سے ہوں شاہ، میں کس حق سے آ کا جان کی زندگی میں جگہ بنا سکوں گی، زبردستی زمین پر تو قبضہ جمایا جا سکتا ہے مگر کسی

کے دل پر تسلط نہیں حاصل کیا جا سکتا، شہرینہ کو ان سے الگ کر کے میں ان کی نظروں میں گر جاؤں گی۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولی تھی۔

''تم ایسا کچھ نہیں کر رہی ہو، جونک بن کر تو شہرینہ شاہ زیب سے چمٹی ہے خیر اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے، ابھی ایک زحمت کرو، اچھی سی چائے بناؤ، ہم تینوں کو ہی اس کی شدید ضرورت ہے۔'' شاہ میر کے بات ختم کرنے والے انداز پر وہ غائب دماغی سے سر ہلاتی اس کے پیچھے ہی ٹیرس سے نکل گئی تھی، وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی جب شاہ زیب کے چند دوست تعزیت کی غرض سے آ پہنچے تھے، شاہ میر کی اطلاع پر اس نے ان سب کے لئے بھی چائے تیار کی تھی، دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد شاہ زیب اور شاہ میر کو بھی کسی کام سے باہر جانا تھا، ان دونوں کے جانے کے بعد وہ عجیب سی گھبراہٹ محسوس کرتی ٹیرس کی کھلی فضا میں آ گئی تھی، دائیں جانب وسیع گراؤنڈ میں کرکٹ میچ جاری تھا جبکہ بائیں طرف گارڈن ایریا میں بھی کافی چہل پہل تھی، شکیب حسن کی زندگی میں وہ اور قدسیہ کئی بار یہاں آئے تھے، ہر بار دو چار دن رک کر ہی ان کی واپسی ہوتی، وہ یہاں کے ماحول سے مانوس تھی مگر پہلے اور اب میں بہت فرق تھے، دو مہربان ہستیوں کے بغیر ایسے یہ دنیا ہی بہت نامانوس اور اجنبی لگ رہی تھی، شکیب حسن اور قدسیہ کو یاد کرتے ہوئے اس کی آنکھیں برستی رہی تھیں۔

☆☆☆

''صرف دو گھنٹے کا سفر تھا، اپنی مصروفیات میں تم اتنا وقت نہیں نکال سکتی تھیں۔'' وہ شکایت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر بلا ارادہ ہی وہ کہہ گیا۔

''ایم سو سوری شیزی، فیشن شو کی تیاری چل رہی ہے، ریہرسل دن رات ہو رہی ہیں اور پھر تم تو جانتے ہو میرا اپنے ایک کمبائن پروجیکٹ پر بھی کام کر رہی ہوں، اپنا کلیکشن لاؤنچ کرنا بہت محنت اور وقت مانگتا ہے، لیکن دور رہ کر بھی میں بہت ڈسٹرب تھی، بار بار تمہارے دکھ پر میرا دل بھاری ہو رہا تھا، آنٹی کو تو ابھی ہماری خوشیاں دیکھنی تھیں۔'' بات ادھوری چھوڑ کر شہرینہ نے اپنی میک اپ سے غضب ڈھاتی آنکھوں کی نہ نظر آنے والی نمی کو ٹشو میں جذب کیا تھا، اس کے لہجے کی آزردگی اس کے چہرے کے تاثرات سے میل کھانے کو تیار نہ تھی، اسی دوران ویٹر کافی اور اسنیکس سرو کرنے ٹیبل کے قریب آ گیا تھا، دونوں کے درمیان چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی تھی۔

''گھر کے کاغذات وغیرہ تو ساتھ لائے ہو گے تم، آخر اپنے ماں باپ کے تم اکلوتے وارث ہو۔'' ویٹر کے جاتے ہی شہرینہ نے پہلی بات یہی کی تھی، شاہ زیب کو حیرت نہیں ہوئی تھی، اس کی فطرت وہ جانتا تھا، سچ تو یہ تھا کہ اپنی زندگی میں اس نے شہرینہ سے زیادہ مادہ پرست کسی اور کو نہیں دیکھا، زر، زمین، روپیہ پیسہ یہ اس کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا، لیکن اس وقت شاہ زیب کو یہ چیز شدید ناگوار گزری تھی۔

''طروب کے بارے میں نہیں پوچھو گی؟'' شاہ زیب کے سرد لہجے پر وہ کچھ گڑبڑائی تھی۔

''ہاں میں پوچھنے ہی لگی تھی، اس بے چاری پر تو قیامت گزر رہی ہو گی، تمہارے ماں باپ کے سوا اس کا تھا ہی کون اس دنیا میں۔''

''میں ابھی زندہ ہوں اس کے لئے۔'' شاہ زیب نے اس کی بات کاٹی تھی جس پر اس کے تاثرات بدلے تھے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے ماں باپ کے بعد اب وہ میری ذمہ داری ہے، تمہیں یہاں آنے کی زحمت میں نے اس لئے دی تھی کہ تمہیں بتا سکوں، میں طروب کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔''

''شیزی! میں جانتی ہوں تم اپ سیٹ ہو، مگر یہ مشکل کا حل نہیں ہے، میں ابھی بہت کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں، معاشرے میں اپنا ایک مقام بنانا ہے مجھے، اب اس مرحلے میں آکر شادی کی ذمہ داری سر پر لینا بہت بڑا رسک ہے، میری محنت برباد ہوسکتی ہے، فی الحال میں اپنی توجہ اپنے کام پر رکھنا چاہتی ہوں، تم تو جانتے ہو سب۔''

''شہرینہ! ابھی اور کتنا اور کیا کچھ حاصل کرنا ہے تمہیں، پانچ سال سے میں تمہاری رضا مندی کا انتظار کر رہا ہوں، میرے ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے کا گھر آباد ہونے کی خواہش کے ساتھ، بیٹے کی اولاد کو دیکھنے کی حسرت کے ساتھ اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور تمہیں اب بھی مجھ سے شادی کرنا ایک رسک لگ رہا ہے، یہ تو میں جانتا ہی تھا، کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اپنے نام، مقام اور کرئیر کی فکر ہے لیکن مجھے یہ امید ضرور تھی کہ اس مشکل وقت میں تم مجھے اور طروب کو پہلے اہمیت دو گی۔'' شاہ زیب کے اکھڑے لہجے اور سرخ چہرے نے شہرینہ کا رنگ فق کیا تھا، کہ شاہ زیب کے بدظن ہو جانے کا مطلب ایک نقصان ہی تھا، وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ مالی طور پر حاصل ہونے والی سپورٹ کو گنوا دیتی۔

''شیزی! تم جانتے ہو اپنے کام کے لئے میں کس حد تک جنونی ہوں، میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے، مجھ پر تمہارے جو احسانات ہیں ان کو اتارنے کے لئے تو میری جان بھی بہت تھوڑی ہے، تم سے زیادہ کوئی مجھے نہیں جانتا پھر بھی تم میری نیت پر شک کر رہے ہو، تم نے ہمیشہ میرے لئے اتنے مہربان اور نرم خو رہے ہو کہ مجھے اپنی بات تم سے منوانے کی عادت ہو چکی ہے، میری اس عادت کو خود غرضی کا نام دے کر تم نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے۔'' شہرینہ کے دلگیر لہجے پر وہ گہری سانس لیتا اس کی طرف متوجہ ہوا تھا، اس کے حسین چہرے پر پھیلے حزن نے اسے اپنا لہجہ درست رکھنے پر مجبور کیا تھا۔

''میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا، میں نے بہت کوشش کی کوئی حل نکل آئے مگر ایسا نہیں ہوا، شادی کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ایک راستہ اور ہے شیزی، ہم طروب کے رہنے کا انتظام کسی اچھے ہاسٹل میں کر دیتے ہیں۔''

''یعنی تم ایک بار پھر ہماری شادی کے معاملے کو پس پشت ڈال رہی ہو۔'' شاہ زیب نے بات کاٹی تھی۔

''صرف مہلت مانگ رہی ہوں، فی الحال جو کام جاری ہیں ان کو مکمل کرنا ضروری ہے، ویسے بھی کچھ دن بعد مجھے دوبئی روانہ ہونا ہے، اسی لئے کہہ رہی ہوں کچھ وقت کے لئے طروب کو ہاسٹل بھیج دو۔''

''ٹھیک ہے، اب شادی کے معاملے کو لے کر میں تم سے دوبارہ کوئی بات نہیں کروں گا، رہ گئی بات طروب کے ہاسٹل جانے کی تو یہ مشورہ مجھے شاہ میر بھی دے چکا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ طروب ہاسٹل جانے کے لئے راضی ہوگی۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میں کل آ رہی ہوں اس سے ملنے، اسے سمجھاؤں گی، ویسے بھی یہ میرے لئے برداشت کرنا ناممکن ہے کہ وہ اس

طرح تمہارے ساتھ، تمہارے گھر میں رہے، طروب کی اہمیت اپنی جگہ لیکن تم پر اور تمہارے گھر سمیت ہر چیز پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔" شہرینہ کے جتانے والے انداز اور لہجے کے استحقاق پر شاہ زیب نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی تھی مگر کچھ کہا نہیں تھا۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے، لاؤنج میں صوفے پر گہری سوچ میں گم وہ کال بیل کی آواز پر بری طرح چونکی سرعت سے اٹھی تھی، دروازہ کھولتے ہوئے طروب نے تیزی سے اندر آتے شاہ میر کو راستہ دیا تھا جو شاپر ہاتھ میں پکڑے سیدھا یقیناً کچن کی طرف گیا تھا، طروب نے بس ایک نظر شاہ زیب کو دیکھا تھا، اس کی سرخ سوجی آنکھوں سے نگاہ چراتا وہ دروازہ بند کرنے لگا تھا، طروب خاموشی سے جانے کے لئے پلٹ رہی تھی جب شاہ میر کی پکار پر اسے تیزی سے کچن کی سمت آئی تھی، شاہ میر کے تیور اسے کافی بگڑے نظر آ رہے تھے۔

"میں کھانا نکال رہا ہوں، تم پلیٹیں ٹیبل پر رکھو۔" اس نے کچھ ایسے سخت سنجیدہ لہجے میں ہدایت دی تھی کہ طروب سہمی نظروں سے اسے دیکھتی اس کی ہدایت پر سرعت سے عمل کرکے کاؤنٹر کی طرف آ گئی تھی۔

"آپ کہہ گئے تھے کہ کھانا باہر سے لیتے آئیں گے ورنہ میں گھر میں ہی کچھ بنا لیتی۔" کچھ سنبھل کر طروب نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"اس گھر میں سوکھے سڑے سینڈوچ اور آملیٹ کے علاوہ بن ہی کیا سکتا ہے۔" جس طرح بپھر کر بولتے ہوئے شاہ میر نے اسے سالن کی ڈش تھمائی تھی، ایک پل کو تو وہ سن ہو گئی تھی اس کے غصیلے تاثرات پر۔

"یہ بس نام کا گھر ہے، گرہستی بنائے بھی کون یہاں پر، جسے اس گھر کی عزت بنانے کا جنون سوار ہے تمہارے آقا جان پر اسے تو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے اور تمغے میں تھرکنے سے فرصت نہیں ہے، عزت کسے چاہیے، کون پوچھتا ہے عزت کو دولت کی چمک دمک کے سامنے، پھر بھی غیرت بھلا کر دنیا لگی ہے حسین اداؤں کو سجدہ کرنے میں۔" کچن میں آتے ہوئے اس نے گہری سانس لے کر شاہ میر کو دیکھا تھا جو غصیلے انداز میں طروب کے سامنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا، جبکہ طروب بھاپ اڑاتی بریانی کی ڈش ٹیبل پر رکھتی ایک پریشان نگاہ شاہ زیب پر ڈال کر رہ گئی تھی، البتہ یہ تو اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ شاہ زیب اور شاہ میر کے درمیان کسی معاملے کو لے کر تنازعہ اٹھا ہے۔

"پہلے کھانا کھا لو پھر جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہنا، سنوں گا۔" شاہ زیب کے پرسکون لہجے پر وہ چند ثانیے اسے گھورتا رہا تھا مگر پھر ناگواری سے سر جھٹکتا ٹیبل کے گرد آ بیٹھا تھا۔

"تم کیوں کھڑی ہو بیٹھو۔" شاہ میر کے بگڑے ہوئے ہی لہجے پر وہ کرسی کھینچ کر فوراً بیٹھی تھی اور پھر کن آکھیوں سے ان دونوں کے تاثرات کا جائزہ لے کر چپکے سے اپنی پلیٹ میں تھوڑے چاول نکال لیے تھے۔

"کھانا ٹھیک طرح کھاؤ، خود کو بھوکا رکھ کر تم اس شہر کے ڈھیٹ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، جبکہ تمہیں یہیں رہنا ہے، اس گھر کو تم نے ہی سنبھالنا ہے، میں بھی دیکھتا ہوں کون یہاں آ کر تمہاری جگہ چھینتا ہے۔" شاہ میر نے جس طرح طروب کو مخاطب کرکے شاہ زیب کو سنایا تھا، اس کے بعد وہ خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں، جو کہنا ہے

کھانے کے بعد میرے سامنے، مجھ سے کہنا، بہتر یہی ہے کہ تم ابھی خاموش رہو۔" شاہ زیب کے لہجے میں تنبیہ چھپی تھی جبکہ طروب فق چہرے کے ساتھ چپ بیٹھی تھی۔

"کیوں طروب کے سامنے میں کچھ کیوں نہیں بول سکتا؟" شاہ میر مزید بگڑا تھا۔

"یہ اس گھر کی فرد ہے، اسے پتہ ہونا چاہیے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور تم کیا کر رہے ہو۔"

"کیا کر رہا ہوں میں؟" شاہ زیب تحمل سے بولا تھا۔

"یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" شاہ میر سرد لہجے میں بولتا کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے اور شہرینہ کے درمیان ہونے والی گفتگو من وعن تمہیں بتادی۔"

"تم مجھ سے چھپا بھی نہیں سکتے۔" شاہ میر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"جتنا کچھ وہ تم سے لے چکی ہے اور لے رہی ہے اس کے بعد اب اور کیا کسر رہ گئی ہے کہ اس کی نظر تایا جان کے گھر پر لگی ہے۔"

"تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟" شاہ زیب زچ ہوا تھا۔

"اس لئے کہ صرف تم ہی نہیں میں بھی اس کی خصلت سے واقف ہوں مگر تمہاری آنکھیں سچ نہیں دیکھ سکتیں، ان پر عشق کی پٹی جو بندھی ہے۔" پلیٹ میں موجود چاولوں میں چمچہ ادھر ادھر کرتی طروب کے کان شاہ میر کی طرف ہی لگے تھے وہ شاید اور بھی کچھ کہتا مگر شاہ زیب درمیان میں بول اٹھا تھا۔

"تم اس کے بارے میں جو بھی رائے رکھتے ہو مجھے اس سے سروکار نہیں، مگر میرے سامنے اس کا ذکر عزت سے کیا کرو، اسے وہ گھر اور اس کی لوکیشن پسند ہے، اب وہاں کوئی نہیں، صرف سیکیورٹی کے خدشے کی بنیاد پر اس نے گھر کے پیپرز کا ذکر کیا تھا۔" گہری سنجیدگی سے شاہ میر کو ٹوک کر اس نے ایک نظر طروب کے جھکے سر پر ڈالی تھی۔

"جانتا ہوں اچھی طرح۔" شاہ میر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"اس کے لئے عزت کی توقع مجھ سے اس وقت رکھنا جب وہ عزت کے ساتھ تمہارے نکاح میں آجائے۔" شاہ میر کے مزید طنز پر وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا، غنیمت تھا کہ شاہ میر نے کھانے کی طرف توجہ مبذول کرلی تھی۔

"طروب! ابھی گھر میں وہ جگہ درست کرنی ہوگی جہاں تمہارا بسیرا ہوگا، لاؤنج میں تو میرا ڈیرہ ہے، ڈرائنگ روم میں تم فی الحال بسیرا کر سکتی ہو، ایسا کرتے ہیں ہال کے ساتھ جو کمرہ ہے وہی تمہارے لئے مناسب رہے گا۔" کھانے کے بعد ٹیبل سے پلیٹیں وغیرہ سمیٹنے میں اس کی مدد کرتے ہوئے شاہ میر بول رہا تھا، جبکہ طروب نے خاموش نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا جو اس معاملے پر کوئی بھی رائے دیئے بغیر کچن سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا، اس کی جلتی آنکھیں تو اس وقت سے نیند اور خواب سے عاری ہو چکی تھیں جس وقت اس نے ماں کو قریب المرگ دیکھا تھا، ایک پچھتاوا نمی بن کر اس کی آنکھوں میں چھا گیا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے آخری وقت میں بھی ان کو نہیں بتا سکا کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتا ہے، قریب رہ کر وہ ان کے دکھ سکھ نہ سن چکا، ان کی خدمت نہ کر سکا، وہ جانتا تھا

طروب نے وہ تمام فرض اور حق ادا کرنے کی کوشش کی جو کہ اسے کرنا چاہیے تھے، اس کے ماں باپ کو تکلیف کے دنوں میں طروب نے بہت مضبوطی سے سنبھالا، اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ داری اور بردباری سے وہ گھر کے معاملات سنبھالتی رہی تھی، اسے احساس تھا کہ اس کا اور طروب کا صدمہ ایک ہے، وہ بھی ٹوٹ کر بکھر چکی ہے، خود کو سنبھالنے کے لئے اسے بھی سہارے کی ضرورت ہے لیکن وہ کیا کرتا، کہاں سے لاتا وہ اجازت نامہ جو طروب کو ہمیشہ اپنے قریب رکھنے کی سند بنتا، جو راستہ اس کے ماں باپ بنا گئے تھے اس پر چلنے کی اجازت نہ اس کا دل دیتا تھا، نہ ضمیر۔

پانچ سال ایک عورت کی رفاقت کے عہد میں گزار کر اب ایک ملاوٹ زدہ، استعمال شدہ جذبوں سے باسی، پژمردہ زندگی میں طروب کو شامل کرنا اس کے ساتھ شدید ناانصافی تھی، یہ حقیقت وہ اپنے ماں باپ کو نہیں سمجھا سکا تھا، شاہ میر سمجھنے کے لئے تیار نہیں تھا پھر طروب کو کیسے اور کن لفظوں میں سمجھاتا، ڈرائنگ روم کے نیم وا دروازے سے اسے طروب کی مدھم سسکیاں بخوبی سنائی دے رہی تھیں، دل کے بڑھتے اضطراب کے ساتھ وہ ساکت کھڑا رہا تھا، شاید اس کا دلاسا، ہمدردی کے دو لفظ طروب کی اذیت کو کم کر سکتے تھے مگر جس اذیت میں وہ خود تھا اس سے طروب کو نجات دلانے کی ہمت کیسے جوڑ سکتا تھا، بوجھل قدموں اور مضطرب دل کے ساتھ وہ نہ چاہنے کے باوجود دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

دستک کی بلند ہوتی آواز پر وہ نیند سے بیدار ہوتی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''لگتا ہے تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی، لیکن تم نے رات میں بھی ٹھیک سے کچھ نہیں کھایا تھا، اس لئے جگایا کہ کچھ کھا لو پھر چاہے سو جانا۔''

دروازے پر کھڑے شاہ میر کے لہجے میں اپنے لئے فکر محسوس کر کے طروب نے تشکر سے اسے دیکھا تھا، فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ عجیب و غریب سوچوں میں گم جانے کب گہری نیند سو گئی تھی۔

ہال میں داخل ہوتے ہی پہلی نگاہ ڈائننگ ٹیبل کے گرد اخبار میں ڈوبے شاہ زیب پر گئی تھی، اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ تھا، یقیناً وہ بھی دیر سے بیدار ہوا تھا، رکے بغیر وہ سر جھکائے کچن میں داخل ہو گئی تھی۔

''آ جاؤ تمہارا ناشتہ ریڈی کر دیا میں نے۔''

شاہ میر کی اطلاع پر وہ بری طرح شرمندہ ہوئی تھی۔

''میں بنا لیتی خود شاہ، آپ نے کیوں یہ سب کیا؟''

''کچھ بھی تو نہیں کیا، صرف آملیٹ بنانے کا احسان کیا ہے، کل سے تو تم نے ہی میرے لئے ناشتہ، کھانا بنانا ہے۔'' شاہ میر نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو ایک ہلکی سی بے رنگ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ایک پل کے لئے لہرائی تھی۔

''یہ لو گرما گرم چائے بھی آ گئی۔'' ایک مگ اس کے سامنے رکھتا وہ دوسرا مگ تھامے سامنے براجمان ہو گیا تھا، اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتا وہ طروب کی خاموشی توڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا، کہ کچن میں شاہ زیب کی آمد ہوئی تھی طروب نے دوبارہ اس کی جانب نہیں دیکھا تھا جو اس کی طرف متوجہ مخاطب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

''شہرینہ تم سے ملنے یہاں آرہی ہے، اسے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں جو اہم ہیں، اس کی کوئی بات ناگوار گزرے تو تحمل سے بس سن لینا۔''

''اسے ضرورت کیا ہے کسی ناگوار بات کو سننے کی، تم کم ہو سب بن کر تحمل سے کام لینے کے لئے؟'' شاہ میر کے خشمگیں لہجے پر وہ بس ایک نگاہ اسے دیکھتا واپس چلا گیا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں زبان بند رکھ کر احکامات پر عمل کرنے کی۔'' گھرکنے والے انداز میں شاہ میر اسے مخاطب کرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

پلیٹیں اور مگ دھو کر ان کو ان کی جگہ پر رکھنے کے بعد اس نے اچھی طرح شاہ میر کے پھیلائے گئے کچن کو قدرے درست حالت میں لانے کی کوشش کی تھی، ویسے اسے اندازہ تھا کہ یہ کچن کافی توجہ پا نگ رہا ہے، جب وہ قدسیہ کے ہمراہ یہاں ٹھہرتی تھی تو ان کا ایک دن تو کچن اور گھر کو درست کرنے میں نکل جاتا تھا، کچن سے وہ باہر آئی تو لاؤنج خالی ملا تھا، وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں آئی تھی جہاں اس کے بیگز اور سوٹ کیس موجود تھے، سوٹ کیس میں اسے اپنے کپڑوں کے درمیان رکھا سرخ مخملی کیس نکالا تھا، سوٹ کیس بند کر کے اس نے دھیرے سے مخملی کیس کھولا تھا، بہت نازک سا سیٹ تھا وہ ڈائمنڈ کا، اسے یاد تھا کہ قدسیہ کو یہ زیور اس لئے بہت عزیز تھا کہ یہ شاہ زیب نے سالوں کی محنت سے حاصل کیے گئے روپوں سے قدسیہ کے لئے یہ ڈائمنڈ کا سیٹ خریدا تھا، قدسیہ نے اسے بتایا کہ اسٹڈیز کے دوران شاہ زیب پارٹ ٹائم جابز کر کے رقم جمع کرتا رہا تھا، قدسیہ کے پاس سونے کے بہت زیور تھے مگر شاہ زیب کی خواہش تھی کہ وہ ان کے لئے ڈائمنڈ کا کوئی زیور خریدے، قدسیہ کے لئے اس کی یہ خواہش ہی قیمتی ہیروں سے بڑھ کر تھی مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ شاہ زیب بہت خاموشی سے اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے محنت کر رہا ہے نہ صرف محنت بلکہ بہت طویل انتظار کے بعد جب مطلوبہ رقم میں پھر بھی کمی رہ گئی تو اسے شاہ میر کا مقروض بھی ہونا پڑا تھا۔

قدسیہ جب جب اس سیٹ کو پہنتیں ان کی خوشی دیدنی ہوتی، ایسے میں شکیب حسن کہتے کہ شوہر نے اتنے زیور بنا کر دیئے ان پر کبھی اتنا خوش نہ ہوئیں مگر بیٹے کے تحفے میں دیئے زیور پہن کر قدم زمین پر نہیں ٹھہرتے۔

''ابو! آپ نے جو زیور امی کو دیئے وہ تو بس سونا ہے، آکا جان نے تو ڈائمنڈ کا سیٹ دیا ہے تحفے میں، ہیرے خریدنا اور پہننا چھوٹی موٹی بات نہیں۔'' وہ شرارت سے درمیان میں بولتی۔

''ہاں بیٹا! ہم تو غریب ملازمت پیشہ انسان ہیں، تمہاری ماں اور ان کا بیٹا بڑے لوگ ہیں۔''

''آپ کے بنائے گئے زیور بھی بہت چاہت سے پہنے میں نے، بس بہانہ چاہیے طعنہ دینے کا۔'' قدسیہ ناراضی سے کہتیں اور پھر بات بحث و مباحثے کی طرف مڑ جاتی جبکہ وہ ان دونوں کی نوک جھونک کو خوب انجوائے کرتی، بھیگتی آنکھوں کو خشک کرتی ڈرائنگ روم سے نکلی تھی۔

طروب خود کو کمپوز کرتی شاہ زیب کے مقابل جا رکی تھی، کچھ حیران ہو کر شاہ زیب نے وہ کیس تھام لیا تھا۔

''یہ گھر میں رکھا تھا امی نے؟''

''جی، وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھتی تھیں، انہوں نے مجھے یہ آپ کے حوالے کرنے کے لئے کہا تھا۔'' لہجے کی نمی چھپائے وہ مدھم لہجے

میں بولتی ایک پل کو لاؤنج میں آتے شاہ میر کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"میں اب اس کا کیا کروں گا، یہ امی کی نشانی ہے اسے تم ہی زیادہ اچھی طرح سنبھال کر رکھ سکتی ہو۔" کیس واپس اسے دیتا وہ گہری سنجیدگی سے بولا تھا جبکہ طروب کے دل کی دھڑکن رک سی گئی تھی، کیا اسے یاد نہیں کہ قدسیہ یہ سیٹ اس لڑکی کو دینا چاہتی تھیں جسے شاہ زیب کی دلہن بننا تھا، وہ کئی بار شاہ زیب کی موجودگی میں بھی یہ کہہ چکی تھیں، طروب کو اس لمحے سمجھ نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے، اسی شش و پنج میں تھی کہ کال بیل گونجی تھی، شاہ میر تیز قدموں سے لاؤنج سے نکل گیا تھا، چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو چہرے پر بیزاری پھیلی تھی وجہ بھی سمجھ آگئی کہ اس کے عقب میں شہرینہ نمودار ہوگئی تھی، سیاہ لباس میں دمکتے چہرے کے ساتھ۔

"کیسی ہو طروب؟" بڑے تکلف سے شہرینہ نے رخسار اس کے چہرے سے مس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"بہت اچھا ہوا جو تم یہاں آگئیں، کل جب شیزی سے پتہ چلا تھا تو میں اس وقت سے ہی تمہارے پاس آنے کے لئے بے تاب تھی۔" یکدم رک کر شہرینہ نے طروب کے ہاتھوں میں موجود مخملی کیس کو دیکھا تھا۔

"دیکھوں تو ذرا۔" کچھ چونک کر شہرینہ نے کیس اس کے ہاتھوں سے لیا تھا، جگمگاتے سیٹ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"شیزی! یہ تو وہی جیولری ہے جو تم نے میرے ساتھ جا کر آنٹی کے لئے خریدی تھی اور تم نے بتایا تھا کہ وہ یہ جیولری تمہاری بیوی کو دے دیں گی۔" وہ سب کچھ بھلائے شاہ زیب سے تائید مانگ رہی تھی۔

"فی الحال تو تائی جان یہ جیولری طروب کی تحویل میں دے گئی ہیں۔" درمیان میں بولتے شاہ میر نے جیولری باکس شہرینہ سے لیا تھا۔

"طروب! میں فی الحال اسے رکھ لیتا ہوں، جب تم یہاں سیٹ ہو جاؤ تو پھر یہ مجھ سے لے لینا۔" طروب کو مخاطب کرتا وہ فوراً شاہ زیب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ شہرینہ کے تاثرات دیکھنے والے تھے، دانت پیستی وہ خونخوار نظروں سے شاہ میر کی پشت کو گھورتی بل کھا کر رہ گئی تھی۔

"طروب! شہرینہ کو تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں، میں نے تمہیں بتایا تھا۔" شہرینہ کے غصیلے تاثرات نظر انداز کرتا وہ طروب سے مخاطب ہوا تھا جس پر وہ اثبات میں سر ہلاتی شہرینہ کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

"اول درجے کا بدتمیز انسان ہے یہ شاہ میر، اس طرح جیولری مجھ سے چھینی جیسے میں کھا رہی تھی۔" غصے میں بھڑکتی شہرینہ صوفے پر بیٹھی تھی۔

"میں ان کی طرف سے معذرت کرتی ہوں آپ سے۔" طروب نے بات ختم کرنی چاہی تھی جبکہ شہرینہ نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ چمکتی گھنیری پلکوں تلے متورم سی گہری سیاہ آنکھیں، خشک مگر ترشے نازک ہونٹ، گندمی رنگت کے جھتے نقوش میں گھلی زردی اور سوگواری نے اس کی دلکشی کو بڑھا دیا تھا۔

شہرینہ کو اس لمحے بھی وہ ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی شاید اسی لئے اور کچھ شاہ میر کی وجہ سے موڈ آف ہونے پر وہ کسی بھی طرح بناوٹی مروت کے طور پر بھی طروب سے نہ اظہار ہمدردی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، نہ ہی اس کا غم بانٹنے کی کوشش میں

اپنا وقت برباد کر سکتی تھی۔

''آکا جان نے بتایا تھا کہ آپ کو مجھ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' شہرینہ کو عجیب نظروں سے اپنا جائزہ لیتے دیکھ کر وہ الجھ کر بولی تھی۔

''دیکھو طروب! ہمیں یعنی مجھے اور شیزی کو اندازہ ہے کہ تم اس وقت کتنی تنہائی کا شکار ہو، آنٹی کے گزرنے کے بعد تم خود کو کتنا ان سیکیور فیل کر رہی ہو گی۔''

''ایسا نہیں ہے، آکا جان کی موجودگی میں، میں خود کو بالکل ان سیکیور فیل نہیں کر رہی۔'' طروب کے بات کاٹنے پر شہرینہ کے تاثرات ایک پل کو بدلے تھے۔

''جو بھی ہے، شیزی تمہاری ضد سے مجبور ہو کر تمہیں اپنے ساتھ لے آیا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ تمہارا اس طرح اس کے گھر میں رہنا ٹھیک نہیں ہے، فی الحال ہم شادی نہیں کر سکتے تمہاری وجہ سے، لہٰذا تمہیں بھی معاملات کی نزاکت کو سمجھنا چاہیے اس لئے بہتر ہو گا کہ تم کچھ عرصے کے لئے ہاسٹل شفٹ ہو جاؤ۔'' شہرینہ مختصر سی تمہید کے ساتھ اپنا مقصد بیان کر گئی تھی۔

''مجھے کہاں رہنا ہے، کہاں نہیں، یہ فیصلہ میرا ذاتی ہے جس میں آکا جان بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔'' طروب کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''آپ کی اور ان کی شادی آج ہو یا کل مجھے تو اب یہیں رہنا ہے۔''

''مگر شیزی تمہیں اس طرح اس گھر میں کیسے رکھ سکتا ہے؟'' شہرینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''تو ٹھیک ہے اگر آکا جان کو میری یہاں موجودگی سے کوئی پرابلم ہے تو وہ اس گھر سے چلے جائیں۔''

''کیا، تم حواسوں میں تو ہو؟'' شہرینہ نے دنگ نظروں سے اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھا تھا۔

''میں کوئی فیڈر پیتی بچی نہیں ہوں طروب، شیزی کے ماں باپ نے صرف تمہاری پرورش کی ہے، شیزی سے تمہارا کوئی تعلق ایسا نہیں ہے کہ تم تنہا اس گھر میں اس کے ساتھ رہو، وہ تمہارے لئے اور تم اس کے لئے نامحرم ہو، تمہارے اندر حیا نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں ہے۔'' طروب کی ڈھٹائی نے شہرینہ کے غصے کو ہوا دی تھی جو وہ رہی سہی مروت بھی بالائے طاق رکھ گئی تھی۔

''نامحرم تو آپ بھی ہیں ان کے لئے مگر پھر بھی پانچ سال سے ان کے ساتھ ہیں، آپ کا بھی ان سے ایسا کوئی شرعی رشتہ نہیں جو آپ کو یہ اجازت دے کہ آپ ان کے دیئے گئے روپے اور تحائف استعمال کریں۔''

''اپنا مقابلہ مجھ سے مت کرو تم۔'' شہرینہ آپے سے باہر ہوتی یکدم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میرا اس سے دل کا رشتہ ہے۔''

''میرا آپ سے کوئی مقابلہ ہو بھی نہیں سکتا۔'' طروب بھی اس کے مقابل اٹھی تھی۔

''کیونکہ میرا ان سے روح کا رشتہ ہے۔'' اس کے مضبوط مستحکم لہجے پر شہرینہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔

''بہت اچھا ہوا کہ تم نے اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا مجھے، مگر تم ہو کن ہواؤں میں، میں اگر چاہوں تو شاہ زیب میرے ایک اشارے پر تمہارا ہاتھ پکڑ کے اس گھر سے نکال باہر کرے۔''

''یہ آپ کی ایک اور بہت بڑی غلط فہمی ہے ہاں میں چاہوں تو آپ کو دھکے دے کر اس گھر سے نکال سکتی ہوں۔''

''طروب!'' گھمبیر لہجے میں موجود تنبیہ گونجی تھی، شہرینہ کے لال بھبوکا چہرے سے نگاہ

ہٹا کر اس نے شاہ زیب کو دیکھا تھا اور پھر تیز قدموں کے ساتھ سر جھکائے اس کے برابر سے نکلتی چلی گئی تھی۔

''یہ اتنی معصوم ہرگز نہیں جتنا کہ دکھائی دیتی ہے، تمہارے ماں باپ کے بعد اب یہ تم پر قابض ہونا چاہتی ہے۔'' شہرینہ بھڑک کر غرائی تھی۔

''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ضرورت تھی اسے یہ بتانے کی کہ میرے ماں باپ نے اس کے لئے کیا، کیا ہے اور کیا نہیں، تم یہاں میری مشکل کو حل کرنے آئی تھیں یا معاملے کو مزید بگاڑنے؟'' شاہ زیب نے سخت ناراضی سے کہا تھا۔

''اس مشکل کو تم خود اپنے سر پر تھوپ کر لائے ہو لہٰذا اب اس سے تم ہی چھٹکارا حاصل کرو اور میری ایک بات غور سے سن لو کہ میں اس کو اب نہ تمہارے گھر میں برداشت کروں گی نہ زندگی میں، ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم ہو گے میں نہیں۔'' سرخ چہرے کے ساتھ وہ بولی نہیں پھنکاری تھی اور اگلے ہی پل بیگ کندھے پر ڈال کر سینٹرل ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتی تیر کی طرح ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی۔

لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے ایک نظر شاہ میر کو دیکھا تھا اور پھر سر جھکائے بیٹھی طروب کے سامنے جا رکا تھا۔

''تمہیں اپنی حد میں رہنا چاہیے تھا، دوبارہ حد سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔'' اس کے سرد لہجے پر طروب نے سر اٹھا کر اس کے تنے ہوئے تاثرات کو دیکھا تھا، درد کی اٹھتی لہر نے آنکھوں کو دھندلا دیا تھا، ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھتی وہ تیز قدموں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا کر بند ہو گئی تھی۔

''کیا غلط کیا اس نے؟ کون سی حد توڑی؟'' شاہ میر نے ناگواری سے پوچھا تھا۔

''تم خاموش رہو، جانتا ہوں کتنی اچھی طرح تم اس کے کان بھر چکے ہو، شہرینہ کے خلاف۔'' شاہ زیب نے بلند غصیلے لہجے میں کہا تھا، جواباً شاہ میر لب بھینچے چند لمحوں تک اس کے تمتمائے چہرے کو گھورتا رہا تھا اور پھر جارحانہ قدموں کے ساتھ لاؤنج سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا مگر نہ طروب ڈرائنگ روم سے نکلی نہ اس کی دستک پر کوئی جواب دیا، بڑھتی تشویش کے ساتھ اسے ناچار شاہ میر کو کال کرنی پڑی تھی کیونکہ وہ جو ناراض ہو کر گیا تھا تو پلٹ کر نہیں آیا، کچھ معذرت اور کچھ منت کے بعد وہ احسان کرنے والے انداز میں راضی ہو گیا تھا، شاہ زیب کا انداز ٹھیک تھا، شاہ میر کی آواز سن کر ہی طروب نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا تھا، کچھ دیر بعد شاہ میر نے اسے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ وہ طروب کو باہر لے جا رہا ہے، ان دونوں کے جانے کے بعد شاہ زیب نے پوری یکسوئی سے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

جس معاملے پر وہ آج ہی شاہ میر سے بات کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

رات دس بجنے کے بعد ان دونوں کی واپسی ہوئی تھی، ایک نظر میں ہی شاہ زیب نے بھانپ لیا تھا کہ شاہ میر کی سنگت میں باہر وقت گزار کر طروب پر اچھا اثر ڈالا تھا اس کے چہرے پر چھائی ہمہ وقت کی آزردگی میں کمی آئی تھی، شاہ میر کی شخصیت ہی اتنی باغ و بہار کی حامل تھی کہ کوئی بھی اس کی قربت میں اداس نہیں رہ سکتا

تھا۔

اس وقت ٹیرس پر ہی وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے جب شاہ میر نے محسوس کر لی تھی کوئی غیر معمولی چیز۔

''شاہ زیب! تم کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہو مجھ سے؟'' شاہ میر کے اچانک سوال پر وہ حیران نہیں تھا۔

''ہاں بات تو ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا تھا۔

''خدا کے لئے شہرینہ صاحبہ کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا اور میں تو تم کو وہی مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ اب اپنے آپ پر رحم کرو اس کی اسیری سے خود کو رہائی دو۔'' شاہ میر کوفت سے بولا تھا۔

''شاہ! تم جانتے ہو میں زبان سے پھرنے والا انسان نہیں ہوں، شہرینہ کے ساتھ کمٹمنٹ میں ہوں۔''

''تمہاری عزت نفس اور زندگی سے بڑھ کر نہیں ہے یہ کمٹمنٹ۔'' شاہ میر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''اور پھر تم جس حد تک نباہ کر سکتے تھے کر چکے ہو، اس عورت کو تمہارے ساتھ گھر بسانے میں کوئی دلچسپی اگر کسی زمانے میں ہوگی بھی تو اب نہیں ہے، اس کی آنکھیں گلیمر کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہیں، آسمان کو چھونے کی چاہت میں اس کے قدم زمین پر بھی نہیں رہے، جو عورت دولت حاصل کرنے کی دھن میں مخلص رشتوں کو گنوا سکتی ہے وہ کسی کی نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ اپنی بھی نہیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں اپنے قدم روک سکتا ہوں، پیچھے نہیں ہٹا سکتا، میں صبر کے ساتھ بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ گاڑی کہاں تک چل سکتی ہے۔'' شاہ زیب پر سوچ لہجے میں بولا تھا۔

''ویسے میں کسی اور معاملے پر تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''کہو میں سن رہا ہوں۔'' شاہ میر ہمہ تن گوش تھا۔

''شاہ! میں بہت سوچنے کے بعد جس فیصلے پر پہنچا ہوں اس سے بہت مطمئن ہوں، ایک صرف تم ہی ہو جس پر میں آنکھیں بند کر کے طروب کے لئے بھروسہ کر سکتا ہوں، میری نظر میں طروب کے لئے بہتر سے بھی بہتر انسان اگر کوئی ہے تو وہ صرف تم ہو، میں چاہتا ہوں تم طروب سے شادی کر لو۔''

''شاہ زیب! تم......'' دنگ ہوتے شاہ میر کی آواز کچھ ٹوٹ کر بکھرتی کرچیوں کے شور میں دب گئی تھی، دونوں کی نگاہیں ساکت کھڑی طروب کے متغیر ہوتے چہرے سے گزر کر اس کے پیروں کے پاس کافی کے ٹوٹے بکھرے مگ تک گئی تھیں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ طروب نے شاہ زیب کی بات سن لی تھی، جتنی تیزی سے وہ جانے کے لئے پلٹی تھی اسی سرعت سے شاہ زیب اور اس کے پیچھے شاہ میر بھی گئے تھے۔

''طروب میری بات سنو۔'' شاہ زیب نے اسے ڈرائنگ روم کے قریب ہی جا لیا تھا۔

''نہیں سننی مجھے آپ کی کوئی بات۔'' حلق کے بل چیختے ہوئے اس نے اپنا بازو شاہ زیب کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس کا دوسرا بازو بھی پکڑ چکا تھا۔

''تمہیں سننا ہوگا، سمجھنا ہوگا میری مشکل کو۔'' شاہ زیب کی بلند آواز میں سختی تھی۔

''اب اور سننے کو باقی کیا رہ گیا ہے، دھوکہ دیا آپ نے مجھے، اپنے ساتھ یہاں لا کر آپ آسانی سے میرے بوجھ کو کسی گناہ کی طرح پھینک دینا چاہتے ہیں مگر ایک بات کان کھول کر سن

لیں، میرے ساتھ اگر زبردستی ہوئی تو میں خودکشی کرلوں گی۔'' حلق کے بل چیختی وہ زخمی شیرنی کی طرح بھپرتی بے قابو ہو چکی تھی۔

''میں نے کب روکا ہے آپ کو اس ڈائن کے ساتھ رنگ رلیاں منانے سے، کرتے رہیں اس کے ساتھ اپنا منہ کالا۔'' طروب کی بھڑکتی آواز اس وقت بند ہوئی تھی جب شاہ زیب نے ایک جھٹکے سے اسے دور ہٹاتے ہوئے گرفت سے آزاد کر دیا تھا، بری طرح لڑکھڑاتی وہ ڈرائنگ روم کی دہلیز کے بیچوں بیچ اوندھے منہ جا گری تھی، ساکت کھڑے شاہ میر نے ہوش میں آتے ہوئے طروب کی طرف بڑھنا چاہا تھا مگر شاہ زیب نے شدید اشتعال میں اسے بھی دور دھکیل دیا تھا۔

''مرنے دو اس احسان فراموش لڑکی کو، جو مغلظات یہ میرے لئے زبان سے اگل چکی ہے اس کے لئے تو میں بھی اسے جان سے مار دینے کا حق دار ہوں۔'' شدید اشتعال میں بولتے شاہ زیب نے ایک خونخوار نگاہ ساکت پڑی طروب پر ڈالی تھی اور اگلے ہی پل حق دق کھڑے شاہ میر کو بازو سے تھام کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

کانچ کے ٹوٹے برتن کی طرح بکھرا اس کا وجود آدھا کارپٹ پر اور آدھا ماربل کے یخ بستہ فرش پر تھا جس کی ٹھنڈک اس کے پیروں سے چڑھتی وجود کے ایک ایک عضو کو برف کی طرح منجمد کر رہی تھی، سماعتوں میں بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی، کیا کچھ نہیں تھا اس آواز میں، بیزاری، نفرت، اکتاہٹ، غصہ، بے حسی۔

''مرنے دو اس احسان فراموش لڑکی کو۔''

اس کی آنکھوں سے بہت گرم سیال سرخ دبیز کارپٹ میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔

''لڑکی...... وہ بس اس کے لئے ایک لڑکی تھی، ایک احسان فراموش لڑکی، ہاں وہ بس ایک لڑکی ہی تو تھی، جو کچی عمر میں ہی ایک پتھر دل انسان کے خواب اپنی آنکھوں میں سجائے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی، محبت کے معنی اور مطلب اسے انجان اپنے دل کے سنگھاسن پر وہ برسوں پہلے جسے بٹھا چکی تھی، انجام کی پرواہ کیے بغیر جسے وہ بہت خاموشی سے اپنا تن من اپنے تمام جذبات سونپ چکی تھی، جس کی دید، جس کے انتظار کی عادی اس کی پیاسی آنکھیں آج تک پیاسی تھیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ٹھکرائی جا چکی ہے، جس کے دل کے دروازے کسی اور عورت کے لئے کھل کر بند بھی ہو چکے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بند دروازے پر دستک تو کیا اس کے قریب جانے کا حق بھی اسے نہیں مل سکتا پھر بھی وہ اپنی انا، اپنے پندار کے زعم کو خود اپنے پیروں تلے کچلتی اس کا دامن تھامے، ساری عزت نفس اس پر قربان کرتی اس کا سایا بنے رہنا چاہتی تھی، اس انسان کے لئے وہ بس ایک لڑکی تھی، اس کی بے بسی، لاچاری، جذبوں کے بس ایک بار معتبر ہونے کی امید اسے اس پتھر کے بت کی نظروں میں احسان فراموش بنا گئی تھی، اس کی نگاہ میں احسان فراموش ہونے سے زیادہ اذیت ناک بس ایک لڑکی ہونا تھا، یہ اذیت اسے ادھ موا کر چکی تھی، اب اپنے قدموں پر کھڑے رہنا شاید ممکن نہ تھا، جس دیوار کا سہارا تھا وہ سہارا ہی اسے منہ کے بل گرا چکا تھا، دن رات کی بے شمار ساعتوں میں جو ہر لمحہ ہر پل اس کی سوچوں پر، اس کی سماعتوں پر، دل کے ہر ایک حصے میں، ہر لفظ پر جنبش پر جو پورے وجود سے عادی رہا تھا، وہ دو دن بھی اسے اپنے قریب برداشت نہ کر سکا، اس کے نیم جاں زخمی وجود کو جھٹک کر چلا گیا تھا۔''

دل میں طوفان اٹھ رہا تھا، کان سائیں سائیں کر رہے تھے، اسے وجود ہوا میں معلق محسوس ہو رہا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر چکا تھا اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا، بہت اچانک گہری خاموشی میں اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا، یکدم اسے احساس یہ بھی ہوا کہ اس کا دل جو رکا ہوا تھا ایک موہوم سی امید کے ساتھ پھر دھڑکنے لگا ہے، زندگی کی رمق اس کے مردہ وجود میں بیدار ہوئی تھی، رگوں میں منجمد لہو پگھلنے لگا تھا جب دو ہاتھوں نے اسے شانوں سے تھام کر اٹھانا چاہا تھا کہ وہ ضبط کے تمام بندھن توڑ کر سرعت سے اٹھتی وہ مسیحا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ گئی تھی۔

''آکا جان!'' اس کی سسکیاں حلق میں یکدم گھٹ گئی تھیں۔

''میں ہوں۔'' شاہ میر کی آواز اسے کسی کھائی میں دھکیل گئی تھی، مایوسی اور بے قدری کی اٹھتی دردناک لہروں نے سے آنسوؤں کے سمندر میں غرق کر دیا تھا، شاہ میر کا ہاتھ اپنی پیشانی سے ٹکائے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

''ہمت رکھو طروب! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، میں تمہارے ساتھ ہوں، کبھی وہ نہیں ہونے دوں گا جو تمہاری مرضی کے خلاف ہو، شاہ زیب کو تم بھی جانتی ہو، اس کی فطرت ایسی جارحانہ نہیں ہے، غصے میں ہو گیا سب، ان حالات میں وہ تم سے زیادہ ڈپریسڈ ہے اور پھر تھوڑی سی غلطی تم سے بھی سرزد ہوئی ہے۔'' شاہ میر جانے اور کیا کہہ رہا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا، سوائے اپنے دل کی چیخوں کے کہ وہ اسے نہیں جانتی شاید ذرہ برابر بھی نہیں کیونکہ اس بے پرواہ، انجان بظاہر اپنے نے اسے اس حد تک مفلس رکھا ہے کہ اس شخص کو دل میں سموئے رکھنے کے باوجود وہ اس شخص کے لمس تک کو نہیں پہچان سکتی تھی۔

ایک شہر آرزو سے کسی دشت غم تلک دل چکا تھا اور اور یہ ہجرت عجیب تھی۔

لفٹ میں داخل ہو کر اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا دوپہر کے تین بجنے میں چند منٹ باقی تھے، حالانکہ اس کا مزاج رات سے ہی برہم تھا، صبح شاہ میر کے ہمراہ اکیڈمی جانے کے لئے گھر سے نکلتے ہوئے بھی اس نے طروب کی خیر خبر لینے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی وہ خود سامنے آئی تھی، طروب نے گزشتہ رات جو لفظ ادا کیے وہ اس کے ضمیر اس کے کردار پر بھاری ضرب کی طرح لگے تھے اور پھر اس کی خودکشی کی دھمکی، شاہ زیب نہیں جانتا تھا کہ وہ کب تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا، صرف شاہ میر کے اصرار اور ضد پر وہ لنچ کے لئے اس کے ہمراہ گھر آیا تھا، ظاہر ہے طروب کے ساتھ گھر پر لنچ کرنے کا مقصد شاہ میر کا یہی تھا کہ طروب اور اس کے درمیان تناؤ کم ہو سکے، اسے راضی کر کے شاہ میر نے گھر پر طروب کو فون کر کے یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ لنچ کے لئے کھانا باہر سے لے کر آ رہے ہیں۔

شاہ میر جا چکا تھا جبکہ وہ پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے اب اوپر پہنچا تھا، کاریڈور عبور کر کے وہ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوا تھا کہ حواس باختہ سے شاہ میر پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹکا تھا۔

''زیب! طروب گھر میں نہیں ہے، میں نے سب طرف دیکھ لیا ہے، گیٹ نیم وا تھا اس لئے میں اندر آ گیا تھا۔'' شاہ میر کے انکشاف پر وہ بھک سے اڑتا سرعت سے اسے سامنے سے ہٹا کر اندر کی سمت دوڑ گیا تھا، منٹوں میں اس نے

ایک ایک کونا دیکھ لیا مگر بے سود، شاہ زیب کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا، طروب کے سامان سے بس ایک بیگ غائب تھا، باقی سب جوں کا توں موجود تھا۔

''اس کا فون آف جا رہا ہے، شاہ زیب ہمیں فوراً اسے تلاش کرنا ہے، وہ اس شہر کے راستوں سے انجان ہے۔'' شاہ میر کے عجلت بھرے لہجے پر شاہ زیب نے کچھ بھی کہے بغیر تیزی سے باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے تھے۔

☆☆☆

شہر کی ان گنت سڑکیں ناپنے کے بعد شاہ زیب کا صبر جواب دیتا جا رہا تھا، شام ہو چکی تھی اور پھر اس کے ڈھلنے کا وقت بھی آ پہنچا مگر طروب کا کہیں کوئی نام و نشان تک نہیں مل رہا تھا، شاہ میر مسلسل اسے تسلی تو دے رہا تھا مگر اس کے زرد چہرے اور غیر ہوتی حالت سے بخوبی واقف تھا، وہ خود بھی کم پریشان نہیں تھا مگر دل کو کچھ یہ یقین بھی تھا کہ طروب بہت سمجھدار ہے وہ خود کو کسی سنگین صورتحال میں گرفتار نہیں ہونے دے گی۔

''ہمارے پاس اب پولیس اسٹیشن جانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں بچا ہے شاہ زیب۔'' تھک ہار کر جب وہ دونوں ایک سنسان سڑک پر رکے تو اندھیرا پھیل رہا تھا۔

''اب کچھ بھی کرو لیکن اسے آج ہی تلاش کرنا ہے ورنہ میں ساری زندگی آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکوں گا۔'' شاہ زیب کی حالت دیدنی تھی، اس سے پہلے کہ شاہ میر کچھ کہتا شاہ زیب کا فون چیخ اٹھا تھا۔

''تمہیں میری ذرہ پرواہ نہیں، ایک کال تک کرنے کی زحمت نہیں کی تم نے، اس کو ہاسٹل شفٹ کیا یا نہیں؟'' شہرینہ کے چنگاڑتے لہجے نے اس کی دماغ کی رگوں کو سلگا دیا تھا۔

''اسے ہی ڈھونڈتا سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں پاگلوں کی طرح، تمہاری وجہ سے میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آیا اور اب لٹکا ہوں سولی پر۔'' وہ بھڑک کر بولا تھا۔

''حیرت ہے اتنی آسانی سے کہاں دستبردار ہو گئی تم سے۔'' شہرینہ کے لہجے میں تعجب تھا۔

''خیر جو بھی ہے، وہ کوئی فیڈر پیتی بچی نہیں جو تم اسے ڈھونڈنے نکلے ہو، کسی ہاسٹل پہنچ کر خود ہی فون کر دے گی۔''

''تمہاری بے حسی اور خود غرضی پر اب تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی، میری عزت داؤ پر لگی ہے اور تم مجھے سکون سے بیٹھنے کا مشورہ دے رہی ہو۔'' شاہ زیب کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

''ٹھیک ہے اگر وہ تمہاری عزت ہے تو ڈھونڈ کر لاؤ اسے اور رکھو اسے ہی اپنے گھر میں، میری تمہیں ضرورت ہی کیا ہے۔'' شہرینہ غرائی تھی۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ طروب کے بارے میں تمہاری سوچ کتنی چھوٹی، کتنی گری ہوئی ہے، اس وقت تو میں تمہاری کوئی بکواس نہیں سن سکتا لیکن یاد رکھنا کہ اگر طروب مجھے نہ ملی تو اس کی ذمہ دار تم ہو گی۔'' شدید مشتعل انداز میں بات ختم کر کے اس نے لائن ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔

☆☆☆

ایک ہاسٹل سے دوسرے پھر تیسرے ہاسٹل تک کا سفر کرتے کرتے اسے کافی وقت بیت گیا تھا، کسی بھی ہاسٹل کو منتخب کرنے سے پہلے وہ ہر طرح سے مطمئن ہونا چاہتی تھی، جب تنہا اپنے بل بوتے پر ہی زندگی گزارنی ہے تو پھر پورے اعتماد سے کیوں نہیں، یہ فیصلہ اس کا نہیں تھا، تقدیر اور حالات ہی اس مقام پر لے آئے تھے آخر کہاں تک کوئی اپنی انا اور خودداری کا گلا گھونٹ

سکتا ہے، یہ ایک بہت بڑا قدم تھا جو اس نے بہت سوچ سمجھ کر بروقت اٹھایا تھا، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ خود اس گھر سے نہ نکلتی تو کسی دن اسے دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا جاتا، عورت کا جادو کالے جادو سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے، جس کی کاٹ کالا جادو بھی نہیں کر سکتا، جانے انجانے میں وہ ایک ایسے شخص کا سہارا لینے کی غلطی کر چکی تھی جو پہلے سے ہی کسی عورت کے زیر اثر تھا، بہتری اسی میں تھی کہ وہ درمیان سے نکل جاتی، کسی گرداب میں پھنسنے سے اچھا تھا کہ عزت کے ساتھ صعوبتیں برداشت کر لیتی۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ ہاسٹل میں ایڈجسٹ ہوتے ہی وہ احسان انکل سے رابطہ کرے گی اور ان سے درخواست کرے گی کہ شکیب حسن اور قدسیہ جو کچھ اس کے نام کر گئے ہیں وہ اس سے دستبردار ہونا چاہتی ہے، صورتحال سے آگاہ ہونے کے بعد انہوں نے ضرور برہم ہونا تھا مگر ان کو یہ باور کروانا ضروری تھا کہ جو قدم اس نے اٹھایا اپنی مرضی سے اٹھایا ہے، اپنے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے وہ شاپنگ مال چلی گئی تھی، ضرورت کی کچھ چیزیں خریدتے ہوئے وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ وہ جو تین ہاسٹلز اس نے دیکھے ہیں ان میں سے کون سا اس کے لئے بہتر ہے، بہرحال اپنے ذہن میں اس نے ایک قدرے بہتر اور افورڈ ایبل ہاسٹل کو منتخب کر لیا تھا، اندھیرا پھیل چکا تھا مگر اس ہاسٹل تک پہنچنے کے لئے اسے کوئی رکشہ نہیں مل رہا تھا، انتظار میں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔

راستہ اس نے ذہن نشین کر لیا تھا مگر چلتے چلتے اس کی کوشش تھی کہ کوئی رکشہ مل جائے، چلتے چلتے احتیاطاً اس نے ایک دو لوگوں سے ایڈریس پوچھا تھا، ہاسٹل ابھی دور تھا، سواری کوئی مل نہیں رہی تھی، اندھیرا اچھا تھا، اسی دوران کچھ خوف سا محسوس کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے، اپنے خوف کو نظر انداز کر کے اس نے وہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ وہم نہیں تھا، مگر ساتھ ساتھ رینگتی سفید کار میں سے پکارتی کریہہ آواز وں نے اس کے سارے اعتماد کو غرق کر دیا تھا، پسینے سے ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں، بری طرح ہراساں ہوتی وہ فٹ پاتھ عبور کرتی سڑک کے دوسرے کنارے پر چلی گئی تھی مگر خطرہ ٹلا نہیں تھا، سڑک پر گاڑیاں بہت کم تھیں، راہ گیر نہ ہونے کے برابر، وہ آسان شکار تھی، وہ یہ جانتی تھی مگر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ حالات کا مقابلہ اسے ہر صورت کرنا ہے، چادر کو چہرے کے گرد ٹھیک کرتے ہوئے وہ بالکل تیار تھی، کہ اچانک کار کا دروازہ کھلا تھا، وہ شخص بڑی دیدہ دلیری سے اس کے سامنے رکتا جانے کیا کہہ رہا تھا جس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے، ہاتھ میں پکڑا بیگ اس نے پوری قوت سے اس شخص کو دے مارا اور برق رفتاری سے بھاگتی چلی گئی تھی، خوف سے اس کا دل بند ہو رہا تھا، بھاری قدم مسلسل اس کے تعاقب میں تھے، اندھا دھند بھاگتے ہوئے طروب کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے جہاں دونوں اطراف میں گاڑیاں ہیں اور کچھ کام کرتے لوگ بھی، ناک کی سیدھ میں بھاگتی وہ اس گیرج میں کام کرتے ورکرز کو حیران کرتی سیدھی اس گیرج کے آفس میں جا گھسی تھی، تب تک اس کے تعاقب میں آنے والے جو پوری طرح بپھرے ہوئے تھے اس کے سر پر پہنچ چکے تھے، طروب نے تیزی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی کہ ایک بھاری ضرب اس کے چہرے سے ٹکراتی آفس میں حق دق بیٹھے چند افراد کو اپنی جگہ سے

اٹھنے پر مجبور کر گئی تھی۔

☆☆☆

عین اس وقت جب وہ دونوں پولیس اسٹیشن سے ذرا ہی فاصلے پر تھے کہ اچانک شاہ زیب کے فون پر آنے والی کال نے ان کا راستہ بدل دیا تھا، شاہ زیب کی خطرناک ڈرائیونگ اسپیڈ پر شاہ میر کو بار بار ٹوکنا بھی پڑا تھا مگر اسے تو جیسے کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

لب سڑک پر وہ ایک روشن جگمگاتا وسیع و عریض گیراج تھا، وہاں ایک پولیس وین بھی موجود تھی، ان دونوں کو وہاں آتے دیکھ ایک شخص تیزی سے ان دونوں کی طرف آیا تھا، یہی شخص اس گیرج کا مالک تھا اور اسی نے فون پر شاہ زیب کو یہاں کا ایڈریس بتایا تھا۔

گیرج کے آفس کا دروازہ عجلت میں کھول کر اندر داخل ہوتا وہ یکدم اپنی جگہ ساکت ہوا تھا، اگر وہ طروب تھی تو واقعی وہ فوری طور پر اسے نہیں پہچان سکا تھا، دوسری جانب ایک کونے میں کھڑی شکستی کانپتی طروب نے جو اس کو دیکھا تو دیوانہ وار اسی کی طرف بھاگی آئی تھی، شاہ زیب کے سینے سے سر لگائے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر چکی تھی، تب ہی شاہ میر کے ساتھ گیرج کا مالک اندر آیا تھا۔

''میرے گیرج میں کام کرنے والے لڑکوں نے ان تینوں بدمعاشوں کو اپنے قبضے میں رکھا جب تک پولیس یہاں نہ پہنچ گئی، خوب درگت بنی ہے ان رئیس زادوں کی، پولیس وین میں ڈال رہی ہے ان تینوں کو، بس آپ لوگوں کے آنے کا انتظار تھا۔'' گیرج کا مالک تفصیل بتا رہا تھا، شاہ زیب نے روتی ہوئی طروب کا چہرہ اپنی طرف اٹھا کر اس کی چوٹ کا جائزہ لیا تھا۔

اس کے دائیں جبڑے سے رخسار کی ہڈی تک کا حصہ سوج کر نیلا پڑ چکا تھا، چند لمحوں تک وہ اس کی چوٹ کا جائزہ لیتا رہا تھا اور پھر وہ طروب کا ہاتھ پکڑے اپنے ساتھ اسے کھینچتا باہر نکل گیا تھا، شاہ میر نے اس کے بگڑے تیوروں پر اسے روکنا چاہا تھا مگر وہ سن کہاں رہا تھا، لب بھینچے وہ جارحانہ انداز میں اس وین کی طرف گیا تھا جس میں وہ تینوں لڑکے موجود تھے، طروب کی حالت تو ایسی ہو گئی تھی کہ کاٹو تو بدن میں خون کا قطرہ تک نہیں۔

''بتاؤ ان میں سے کس نے تمہیں ہاتھ لگایا تھا؟'' شاہ زیب کے بپھرے انداز اور سخت لہجے نے طروب کی آواز بند کر دی تھی مگر شاہ زیب کے تیوروں پر اس نے بمشکل کانپتے ہاتھ سے درمیان میں موجود لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ زیب کی پشت کی طرف چھپنے کی کوشش کی تھی مگر اگلے ہی پل اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

''آ کا جان! نہیں۔'' دہل کر چیختے ہوئے طروب نے اس کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر روکنا چاہا تھا مگر تب وہ ایک ہی جھٹکے میں اس لڑکے کو کالر سے پکڑ کر وین سے نکال چکا تھا۔

''اپنے باپ کا مال سمجھا تھا۔'' شاہ زیب نے دھاڑتے ہوئے ایک گھونسا اس لڑکے کو رسید کیا تھا، خوف سے طروب کی چیخیں بلند ہو گئی تھیں کہ تب شاہ میر سرعت سے اسے اپنے قریب کرتا ایک طرف ہٹ گیا تھا، طروب کی آنکھیں خوف اور وحشت سے پھٹ گئی تھیں، اس نے کہاں دیکھے تھے شاہ زیب کے یہ تیور، شاہ میر سمیت کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی، جو اس لڑکے پر تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر رہا تھا، ایک بھونچال سا آ گیا تھا وہاں، شاہ زیب کی دھاڑوں اور اشتعال پر طروب کی حالت

مزید غیر ہو رہی تھی، شاہ میر نے محسوس کرتے ہی اسے تسلی دے کر گاڑی میں بٹھایا تھا اور پھر شاہ زیب کو ٹھنڈا کرنے اس طرف دوڑ گیا تھا، طروب کو کچھ ہوش نہیں کہ پولیس نے کیا کاروائی کی، کب ان لڑکوں کو حراست میں لے کر وہاں سے گئی، کب ان کی اپنی گاڑی گیرج سے روانہ ہوئی، اس کے اوسان گھر پہنچنے تک خطا رہے تھے، سن دماغ نے تب کام کرنا شروع کیا جب اس نے گھر میں قدم رکھا۔

☆☆☆

صوفے پر دبکی بیٹھی وہ اس وقت بالکل بھی شاہ زیب کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی، اس لئے تو شاہ میر کے ایک ہی اشارے کو غنیمت سمجھ کر گھر میں داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم میں آ چھپی، جو جلال وہ شاہ زیب کا دیکھ چکی تھی اس کے بعد تو اسے اپنی بھی خیر نظر نہیں آ رہی تھی، ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے شاہ میر نے کافی ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ بالکل کسی سہمے ہوئے ہرن کے بچے جیسی لگ رہی تھی۔

''فکر مت کرو، وہ اس وقت غصے میں ضرور ہے مگر تم سے فی الحال کوئی باز پرس کرنے نہیں آئے گا۔'' شاہ میر کے تسلی دینے پر بھی اس کا ڈر ختم نہیں ہوا تھا۔

''جانتی ہو، تمہارے چہرے نے مجھے سارا غصہ بھلا دیا ورنہ اب تک تین چار تھپڑ لگا چکا ہوتا تمہیں، کیوں خود کو خطرے میں ڈالا تم نے؟ جانتی ہو ہم کتنے گھنٹوں سے تمہاری تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے، شاہ زیب کس قدر پریشان تھا اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتیں، اتنا پریشان میں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی میں نے اسے اتنے اشتعال میں کسی پر تشدد کرتے دیکھا، اس نے تو حق پر ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی سے تکرار تک نہیں کی، تم تو خود جانتی ہو اس کی فطرت کو، بہر حال تم نے آج جو کیا اس نے مجھے بہت مایوس کیا، شاہ زیب سے تم ناراض تھیں، ٹھیک ہے مگر مجھے تو تم نے کسی گنتی میں نہیں رکھا، میں ہی اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ شاہ زیب سے زیادہ تم مجھ پر بھروسہ کرو گی، ہماری بے خبری میں اگر تمہیں کوئی نقصان خدانخواستہ پہنچ جاتا تو میں بھی بھی خود کو معاف نہیں کرتا۔'' شاہ میر کے ناراضی سے کہنے پر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔

''اس دنیا میں رہنے کے لئے اپنے حقوق پہچاننا ضروری ہیں، اس زمین پر قدم جمائے رکھنے کے لئے اپنے حق کو حاصل کرنا ضروری ہے، تم کسی سیارے کی نہیں اس دنیا کی مخلوق ہو، اپنے حق کو چھوڑ دینا کہاں کی عقلمندی ہے، تمہارے اس ایثار اور قربانی کے جذبے سے تمہیں کچھ حاصل وصول ہونے والا نہیں، جس حق سے اس گھر میں آئی ہو، اس حق سے یہاں رہو۔'' شاہ میر کے سمجھانے پر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئی تھیں۔

''وہ بھی تو نہیں چاہتے کہ میں اس گھر میں رہوں نہ ہی شہر بینہ چاہتی ہے تو پھر میں کیسے......''

''اس کا تو نام بھی مت لو تم۔'' شاہ میر نے ناگواری سے درمیان میں اسے ٹوکا تھا۔

''نہ تم سے زیادہ اہمیت ہے اس کی نہ تم سے زیادہ حق رکھتی ہے وہ اس گھر پر۔''

''یہ تو آپ کہتے ہیں مگر میں جان چکی ہوں، آغا جان بیزار ہیں مجھ سے، پچھتا رہے ہیں مجھے ساتھ یہاں لاکر، اسی لئے تو مجھ بوجھ سمجھ کر اتار پھینکنا چاہتے ہیں، آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اب اس گھر میں نہیں رہنا چاہتی، آپ میرے لئے کسی ہاسٹل کا بندوبست کر دیں۔'' اس

کی بات ادھوری رہ گئی جب شاہ زیب کی آمد ہوئی تھی، اس کے خطرناک حد تک سنجیدہ تاثرات کو دیکھنے کے بعد طروب کی ہمت نہیں ہوئی تھی نگاہ اٹھانے کی۔

''شاہ! گر اسے لگتا ہے کہ میں اس سے بیزار ہوں، اسے یہاں ساتھ لا کر پچھتا رہا ہوں یا یہ کہ اسے بوجھ سمجھ کر جان چھڑانا چاہتا ہوں تو اسے ایسا ہی سمجھنے دو مگر ایک بات اسے اپنی زبان میں سمجھا دو کہ آج جو حرکت اس نے کی اس کو دہرانے کا پھر کبھی سوچا بھی یا میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم بھی باہر نکالا تو میں اس کے ہاتھ پیر توڑ کر ایک کونے میں اسے ڈال دوں گا اور میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں ایسا ہی کروں گا۔''

اس کے بھڑکتے لہجے اور وارننگ پر طروب کی سانس ہی رک گئی تھی، ساکت نظروں سے وہ اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی جو بات ختم کر کے اسی جارحانہ قدموں سے واپس جا رہا تھا۔

''چلو ایک مسئلہ تو حل ہو گیا، اب مجھے دنیا کی کوئی طاقت روزانہ تمہارے ہاتھ سے بنا کھانا کھانے سے نہیں روک سکتی۔'' مسکراتے ہوئے شاہ میر نے اس کے ہراساں تاثرات کو دیکھا تھا۔

''فی الحال تو میں نے بڑا آرڈر کر دیا تھا، یقیناً تم بھی بھوک محسوس کر رہی ہو، اب جلدی سے جا کر ہاتھ منہ دھو آؤ، ہم دونوں یہیں پیٹ پوجا کر لیں گے۔'' شاہ میر بولتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

''اور ہاں کل تک اس کا غصہ ٹھنڈا ہو ہی جانا ہے، اس لئے کل ہی تم اس سے معذرت کرنا اور یہ ضروری ہے کہ بہرحال غلطی تم سے سرزد ہوئی ہے۔'' شاہ میر کی تائید پر وہ خاموش رہی تھی۔

☆☆☆

دن چڑھے اس کی نیند سیل فون کی چنگھاڑتی آواز سے ٹوٹی تھی، حسب توقع شاہ میر کی کال تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری، چوٹ میں زیادہ درد تو نہیں ہے؟''

''آپ نے جو رات میں ٹیبلٹس دی تھیں، انہوں نے کافی اثر دکھایا بہت معمولی سا درد ہے اب۔'' اسے بتاتے ہوئے طروب نے اپنے چہرے کو چھوا تھا، سوجن بھی اسے اب زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''آپ اور آکا جان کس وقت گئے پتہ ہی نہیں چلا، آپ مجھے آواز ہی دے دیتے میری موجودگی کے باوجود آپ دونوں نے ناشتہ تک نہیں کیا ہو گا۔'' وہ شدید شرمندگی سے بولی تھی۔

''اب کہاں تک آوازیں لگا لگا کر ملکہ طروب کو اس غفلت سے بیدار کروں کہ ہوش کے ناخن پکڑو، تمہارے اختیار میں ہی ہے سب کچھ، کرنے پر آؤ تو جو چاہو کر سکتی ہو مگر یہ ہماری ملکہ طروب ہیں کہ خودترسی کے خول سے ہی باہر نہیں نکل رہی ہیں۔'' شاہ میر نے خشمگیں لہجے میں جتایا تھا۔

''سوری، اب میری طرف سے آپ کو کوئی مایوسی نہیں ہو گی۔'' وہ کچھ شرمندگی سے بولی تھی۔

''لگتا ہے سمجھ گئی ہو، بہت اچھی بات ہے، ایسے ہی ڈھٹائی کی حد تک مضبوط رکھنا خود کو اپنے آکا جان کی طرح۔'' شاہ میر کے مسکراتے لہجے پر وہ بھی مسکرائی تھی۔

چائے کے سپ لیتی وہ اب آگے کے لائحہ عمل پر سوچ رہی تھی، شاہ میر کی ہدایتیں بالکل ٹھیک تھیں، اس طرح خودترسی میں مبتلا رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا، جب اسے اس

گھر میں رہنا ہے تو سب سے پہلے اسے اس گھر کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا، یہاں اپنے قدم جمانے ہوں گے، جہاں تک معاملہ تھا شاہ زیب اور شہرینہ کا تو اس بارے میں وہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی، کیونکہ اس بارے میں سوچنے سے ہی اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔

شروعات اس نے کچن سے کی تھی، دوپٹہ کمر سے باندھے وہ کچن کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی کہ گھر کی ملازمہ جس کے ذمے گھر کی صفائی، ستھرائی، دھلائی تھی اس کی آمد ہوگئی تھی، زیتون ایک معمر خاتون تھی، پوتے نواسوں والی عورت تھی مگر بہت محنت کش، ایماندار اور مضبوط اعصاب کی مالک، یہاں کے دیگر اپارٹمنٹس میں بھی وہ کام کرتی تھی، یہاں اسے قدسیہ نے ہی کافی مطمئن ہونے کے بعد مستقل رکھا تھا، حالانکہ شاہ زیب بالکل اس حق میں نہیں تھا مگر قدسیہ جانتی تھیں کہ صفائی وغیرہ کے لئے اگر کسی ملازمہ کو یہاں نہ رکھا تو شاہ زیب کی دن رات کی محنت سے خریدا گیا گھر کباڑ خانہ بن جائے گا۔

زیتون اسے ایک طرف ہٹا کر خود کچن کی دھلائی کرنے لگی تھی، ساتھ ساتھ وہ قدسیہ کے لئے بھی دکھ کا اظہار کرتی اور دلاسے دیتی رہی تھی، کچن سے فارغ ہو کر طروب اس کے ساتھ ہی ڈسٹنگ وغیرہ کرواتی رہی تھی، زیتون کو اس نے کل ذرا جلدی آنے کی تاکید کی تھی، کیونکہ وہ کل ہی سارے پردے، کورز اور بیڈ شیٹ کو واش کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

لنچ اس نے ہلکا پھلکا ہی لیا تھا، شاہ میر سے اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ اور شاہ زیب لنچ عموماً اکیڈمی میں یا پھر باہر ہی کرتے ہیں مگر اکیڈمی کی ذمہ داریوں کے باعث ایسے بہت کم ہی ہوتا کہ وہ دونوں باہر لنچ کریں، آج طروب نے اسے تاکید کر دی تھی کہ رات کے کھانے کے لئے وہ دونوں وقت پر پہنچ جائیں۔

لاؤنج کے دیوار گیر آئینے کے سامنے نم بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اس نے وال کلاک میں وقت دیکھا تھا، رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے، آدھے گھنٹے پہلے شاہ میر نے کہا تھا کہ ان دونوں کو پہنچنے میں پندرہ منٹ لگیں گے، کافی مستعدی سے اس نے کچن کے بجائے ہال میں ڈائننگ ٹیبل ریڈی کر دی تھی بس ان دونوں کے آنے پر گرم گرم کھانا ڈشز میں نکالنا تھا، پشت پر چمکتے سیاہ ریشمی بالوں میں کچر انکا کر اس نے اپنے عکس کو آئینے میں دیکھا تھا، کاٹن کے ہلکی سی ایمبرائیڈری سے لیس فیروزی لبادے میں اسے اپنا آپ تھکا تھکا ہی دکھائی دیا تھا، تھکے تھکے قدموں سے وہ ٹیرس پر آ گئی تھی، چند منٹ ہی گزرے تھے جب مین گیٹ سے گرے سوک نمودار ہوئی دکھائی دی تھی۔

''شکر ہے ہمارے نصیب بھی جاگے، کوئی مسکرا کر ہمارے لئے بھی دروازے پر استقبال کے لئے موجود ہے اب۔'' شاہ میر کے کہنے پر وہ دھیرے سے مسکرائی تھی جبکہ اندر آتے شاہ زیب نے ایک اچٹتی مگر گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی، چوٹ کا نشان اب بھی اس کے چہرے پر موجود تھا مگر کل کی طرح خطرناک حد تک سوجن چہرے پر نہیں تھی۔

''بہت خوب، یعنی ہماری ملکہ طروب نے اپنی سلطنت کا چارج سنبھال لیا ہے، گھر بھی خوب چمک رہا ہے، خوشبوئیں بھی عمدہ اٹھ رہی ہیں کچن سے، میں تو ٹوٹ پڑوں گا کھانے پر، ویسے بنایا کیا ہے؟'' اس کے پیچھے ہی کچن میں آتا شاہ میر اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

''فریز کیا ہوا چکن ہی دستیاب تھا گھر میں،

اس لئے چکن پلاؤ اور چکن کباب ہی بنا سکی ہوں۔" وہ شرمندہ سی ہو کر بتا رہی تھی۔

"محترمہ! آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ بھی ہمارے لئے کسی شاہی کھانے سے کم نہیں۔" بھاپ اڑاتے پلاؤ کی ڈش اس سے لیتے ہوئے وہ بڑی عاجزی سے بولا تھا۔

اس سے پہلے کہ بھوک سے بے چین ہو کر وہ دوبارہ شاہ زیب کو پکارتا اس کی آمد ہو گئی تھی، طروب نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تھا جو گہرے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ شاہ میر کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔

"ملکہ طروب کی بدولت اب تم میرے ڈنر کے اخراجات سے آزاد ہو چکے ہو، تمہیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔" شاہ میر کے کہنے پر اس نے بس ایک نگاہ طروب کے جھکے چہرے پر ڈالی تھی۔

کھانا خاموشی سے کھاتے ہوئے چند منٹ گزرے تھے جب شاہ میر بولا تھا۔

"طروب! کچن کے لئے جو سامان وغیرہ چاہیے اس کی لسٹ بنا کر مجھے دے دو بلکہ بہتر یہ ہو گا کہ تم میرے ساتھ ہی چلنا مجھے گھریلو، خانہ داری کی چیزوں کی خریداری کا بالکل تجربہ نہیں۔"

"جی کل ہی لسٹ بنا لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر دوپہر تک تیار رہنا۔" اسے تائید کر کے وہ شاہ زیب کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"اگر تم جانا چاہو تو طروب کے ساتھ چلے جاؤ، ایک گھنٹے کی بات ہے۔"

"نہیں، تم چلے جانا۔" شاہ زیب نے جواب دیا تھا۔

"میرا خیال ہے جو سامنے اسٹڈی روم کے نام پر کمرہ ہے، اسے طروب کے لئے سیٹ کر دینا چاہیے، کیا خیال ہے طروب؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شاہ میر بولا تھا۔

"کیا ضرورت ہے، میں جہاں ہوں ٹھیک ہوں۔" وہ بولی تھی۔

"ضرورت کیوں نہیں ہے؟" شاہ میر نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"ہمارا کیا ہے ہم تو جہاں سینگ سمائیں ایڈجسٹ کر جاتے ہیں مگر تم لڑکی ہو تمہیں پرائیویسی کی ضرورت ہے، ویسے بھی مجھے تو مطالعے سے کچھ زیادہ رغبت نہیں، نہ ہی ہم دونوں کے پاس اسٹڈی روم میں جانے کا وقت ہوتا ہے، تمہارا فری ٹائم ان کتابوں کے ساتھ اچھا گزرے گا، بس وہاں کچھ ترتیب اور کچھ فرنیچر کی ضرورت ہو گی، تم کیا کہتے ہو؟" شاہ میر نے خاموشی سے کھانا کھاتے شاہ زیب کو مخاطب کیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" شاہ زیب کے مختصر جواب پر طروب گہری سانس لے کر پانی کے گلاس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، ٹیبل صاف کرنے میں شاہ میر نے بڑی فراخدلی سے اس کی مدد کی تھی، برتن دھو کر کچن کی صفائی کرنے کے بعد اس نے شاہ میر کی فرمائش پر کافی تیار کی تھی، لاؤنج میں شاہ زیب لیپ ٹاپ میں اور صوفے پر نیم دراز شاہ میر اپنے فون میں مصروف تھا، دونوں کو کافی کے مگ تھمانے کے بعد طروب کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ رکے یا جائے۔

"تم نے اپنے لئے کافی نہیں بنائی؟"

"نہیں، موڈ نہیں کافی کا۔"

"کھڑی کیوں ہو، آکا جان کا لیپ ٹاپ چھین کر بھاگو گی کیا؟ بیٹھ جاؤ۔" اس کے شرارتی لہجے پر شاہ زیب بس ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا جبکہ طروب شرمندہ سی ہو کر صوفے پر ٹک گئی تھی، کافی دیر تک شاہ میر ایسے ہی اِدھر اُدھر کی

باتیں کرتا رہا تھا، طروب کو بھی وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا لیکن وہ اس لمحے چونک گئی جب شاہ میر باتیں کرتے کرتے ہی نیند میں ڈوب گیا، طروب کو اندازہ تھا کہ صرف اسے وقت دینے کے لئے شاہ میر اپنی تھکن بھلائے نیند کو پرے دھکیلتا رہا تھا مگر اب نیند اس طرح حاوی ہوئی تھی کہ وہ خود بھی بے خبر رہا، طروب کو اپنے دل میں اس کی قدر پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی تھی، دھیرے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ شاہ میر کی طرف بڑھی تھی دوسری جانب شاہ زیب نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا تھا جو احتیاط سے شاہ میر کا سیل فون جو اس کے سینے پر دھرا تھا اسے اٹھا کر ٹیبل پر رکھنے کے بعد واپس صوفے کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی اور پھر شاہ میر کے صوفے سے لٹکے ہاتھ سے اس نے پہلے رسٹ واچ اتاری تھی اور پھر ہاتھ کو تھام کر دھیرے سے شاہ میر کے پہلو میں ہی صوفے پر رکھ دیا تھا، شاہ میر کی رسٹ واچ بھی سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر وہ وہاں سے جا رہی تھی جب غیر متوقع طور پر ابھرتی پکار نے اسے بری طرح چونکا کر رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''یہاں آ کر بیٹھو۔'' شاہ زیب نے دائیں جانب صوفے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تھا، دوسری جانب وہ جو دنگ تھی، کچھ تذبذب کے ساتھ سر جھکائے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔

''طروب! ایم رئیلی سوری، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' اس کے لہجے کی ندامت کو محسوس کر کے طروب نے نگاہ اٹھائی تھی مگر وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں میری بہت سی باتوں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے، تمہاری تکلیف میں اضافہ کیا ہے لیکن میرا یقین کرو میرے ہر عمل ہر بات کے پیچھے تمہاری بھلائی پوشیدہ تھی، میں نے کسی کی وجہ سے تمہیں ہرٹ کرنے کی کوشش نہیں کی، میں تمہارے لئے سب کچھ ٹھیک کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے اس وقت بھی سب سے بڑھ کر، سب سے اہم تم ہو، تمہارے لئے میں کبھی کسی کی غلط بات برداشت نہیں کر سکتا، دنیا ہمارے دل میں نہیں جھانکتی نہ ہی وہ ہماری نظر سے سب کچھ دیکھتی ہے، دنیا وہی سب دیکھتی ہے جو وہ دیکھنا چاہتی ہے۔''

''معافی میں آپ سے مانگتی ہوں، میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی، کبھی کبھی حالات ایسے دوراہے پر لے جاتے ہیں کہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ہم کچھ سمجھنا نہیں چاہتے، نظریں چرا لیتے ہیں حقیقت سے۔'' طروب کے سپاٹ لہجے پر شاہ زیب نے بغور اسے دیکھا تھا۔

''یہی بہتر تھا کہ میں ہاسٹل شفٹ ہو جاتی، میں اب وہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن اب میں چاہ کر بھی تمہیں ہاسٹل نہیں بھیج سکتا۔'' شاہ زیب نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کل تمہارے غائب ہونے کے بعد جو خدشات مجھے لاحق ہوئے میں دوبارہ ان میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا، تمہاری طرف سے میں مطمئن نہیں رہ سکوں گا ہاسٹل بھیجنے کے بعد، یہاں سیکیورٹی ہے یا کچھ اور بہر حال مجھے اس گھر سے باہر کے حالات پر بھروسہ نہیں، یہ تمہارا گھر ہے، حق ہے تمہیں کہ تم یہاں رہو، تم چاہو تو مجھے بھی اس گھر سے نکل جانے کا حکم دے سکتی ہو، میں ساری زندگی یہ کوشش کرتا رہوں گا کہ میرے کسی عمل سے تمہیں ایسی کوئی شکایت نہ ہو جو روز قیامت مجھے میرے ماں باپ کے سامنے شرمسار کرے۔'' اس کے گھرے سنجیدہ لہجے پر طروب

نے بس اسے دیکھا تھا۔

''تم سے بس میں اتنی توقع رکھتا ہوں کہ تم اپنے لئے میرے بس ایک فیصلے پر غور کرو۔'' ایک پل کو رک کر شاہ زیب نے پہلے گہری نیند سوئے شاہ میر کو ایک نظر دیکھا اور پھر طروب کو۔

''تم یہاں رہ کر دیکھو گی کہ شاہ میر اس سے کہیں زیادہ مخلص اور اچھا انسان ہے جتنا کہ تم اسے دیکھ چکی ہو۔'' موضوع کا رخ بدلتا محسوس کر کے طروب کے چہرے کے تاثرات بھی بدلے تھے۔

''تم جانتی ہو کہ میں اپنے بعد تمہارے لئے صرف شاہ میر پر بھروسہ رکھتا ہوں، وہ......'' یکدم رک کر شاہ زیب نے اسے دیکھا تھا جو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''طروب!'' اس کی پکار پر بھی وہ نہیں رکی تھی، جانے کیا سوچ کر شاہ زیب اس کے پیچھے گیا تھا۔

''طروب باہر آ کر میری بات سنو۔'' تیسری بار ڈرائنگ روم کے بند دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے بولنا پڑا تھا اس بار ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

''آپ کو سمجھ نہیں آیا کہ میں آپ کی مزید کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔'' اس کے سرخ چہرے اور غصیلے لہجے پر وہ دم بخود کھڑا رہ گیا تھا دوسری جانب طروب مزید کچھ کہے بغیر واپس دروازہ بند کر گئی تھی، شاہ زیب جانتا تھا کہ وہ انجانے میں عجلت کا مظاہرہ کر کے طروب کو ڈسٹرب کر گیا ہے، یہ انداز، یہ خودسر تیور طروب کے کبھی نہیں رہے تھے، وہ بہت ادب، لحاظ اور مروت رکھنے والی لڑکی تھی، اپنی غلطی کا احساس ہونے کے باوجود بہرحال شاہ زیب کو اپنے ساتھ اس کا یہ طرز تخاطب بہت برا لگا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن تک وہ گھر کے لئے اور اپنے کمرے کے لئے کچھ ضروری چیزوں کی خریداری میں مصروف رہی، اس سلسلے میں ظاہر ہے شاہ میر کی مدد حاصل رہی، اس کے اور شاہ زیب کے درمیان قطعی لاتعلقی کو محسوس کرنے کے بعد بھی شاہ میر نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اپنی انا کو پرے دھکیل کر اسے خود ہی اس لاتعلقی کو ختم کرنا ہوگا۔

اس شام وہ گھر کے کچھ کام نپٹا کر اپنے لئے چائے بنا رہی تھی، جب شاہ میر نے کال کر کے بتایا کہ شاہ زیب گھر پہنچ رہا ہے کیونکہ اس کی طبیعت اچانک بہت ناساز ہو گئی ہے، اس کا خیال رکھنے اور اس کی خیریت سے باخبر کرتے رہنے کی اس نے خصوصی تاکید طروب کو کی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی وہ سخت تشویش میں مبتلا ہوئی تھی، رکے بغیر شاہ زیب تیزی سے اپنے کمرے کی سمت گیا تھا، گھبرا کر اس کے پیچھے ہی بھاگی آئی تھی، واش روم کے بند دروازے کے پاس وہ پریشان کھڑی تھی جب شاہ زیب سرخ انگارہ آنکھوں اور نڈھال قدموں سے باہر نکلا تھا، وومیٹنگ نے اس کی حالت اتنی ڈاؤن کر دی تھی کہ وہ بے ترتیب سا بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔

''لنچ میں کیا لیا تھا آپ نے؟ شاہ نے آپ کو ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کا کہا تھا گئے تھے آپ؟'' طروب کے سوالوں کے جواب میں وہ بس سر پکڑے درد سے کراہ رہا تھا۔

''میں آپ کے لئے دودھ اور ٹیبلٹ لاتی ہوں، منٹوں میں سر درد دور ہو جائے گا۔'' اسے تسلی دیتی وہ کچن کی سمت دوڑی تھی۔

طروب کے بہت اصرار پر وہ بمشکل تمام ٹیبلٹ کھانے کے لئے اٹھ کر بیٹھا تھا، ٹیبلٹ کے

ساتھ اس نے بمشکل چند گھونٹ لیے تھے اور تکیے پر سر گرا لیا تھا، دودھ کا گلاس طروب نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہی تھا جب شاہ زیب نے سرعت سے اٹھنے کی کوشش کی مگر دیر ہو گئی، طروب جو پہلے سے ہوشیار ہو گئی تھی تیزی سے اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر شاہ زیب کے سامنے کر دیا تھا، دودھ کے چند گھونٹ سالم ٹیبلٹ سمیت طروب کے ہاتھوں میں آ گئی تھی، واش بیسن میں ہاتھ دھو کر وہ گیلا ٹاول لے کر الٹے قدموں واپس آئی تھی، ٹاول سے شاہ زیب کا شدید بخار میں تپتا چہرہ صاف کرتے ہوئے اس کے اوسان خطا ہونے لگے تھے، اس وقت جب نیم غشی کی کیفیت میں اس نے شاہ زیب کو کچھ بڑبڑاتے سنا تھا، ذرا جو کان لگا کر سنا تو دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا، وہ کلمہ پڑھ رہا تھا اور پڑھے جا رہا تھا، چند لمحوں تک وہ وحشت سے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر شاہ زیب کے فون سے ہی شاہ میر کو کال کرتے ہوئے اس کی سسکیاں بلند ہو گئی تھیں۔

''آپ جلدی آ جائیں، اگر ان کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی، وہ کلمہ پڑھ رہے ہیں۔''

''بے وقوف لڑکی! رونا بند کرو، وہ کوئی آخری کلمہ نہیں پڑھ رہا، میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' واقعی کوئی دس منٹ کا وقت ہی گزرا ہو گا جب شاہ میر ڈاکٹر کے ہمراہ آ پہنچا تھا، اس دوران وہ شاہ زیب کے بخار کی شدت کو دیکھتے ہوئے اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی تھی۔

طروب کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے، ڈاکٹر چیک اپ کر کے فارغ ہوئے تو شاہ میر ان کے ساتھ ہی چلا گیا تھا، اس کی واپسی کی راہ دیکھتی وہ شاہ زیب کو بھی تسلی دیتی رہی تھی، بخار کی شدت اور سر درد میں کوئی کمی نظر نہیں آ رہی تھی، وہ ایک منٹ کے لیے بھی پرسکون نہیں ہوا تھا، ضبط کی شدت سے اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھڑک رہی تھیں، اس کی آگ کی طرح جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھے وہ دعائیں پڑھ پڑھ کر اس کے سر اور سینے پر پھونک رہی تھی، اسی دوران شاہ میر دوائیں وغیرہ لے آیا تھا جو ڈاکٹر نے لکھ کر دی تھیں۔

''اف میرے خدا، کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔'' شاہ میر نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

''کیوں روئے جا رہی ہو احمق؟''

''دیکھ نہیں رہے ان کی حالت کلمہ پڑھنے پر آ گئے ہیں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بات مکمل بھی نہیں کر سکی تھی کہ ایک بار پھر شاہ زیب کلمہ پڑھتے ہوئے سینے کے بل ہوتا پھر غافل ہو گیا تھا۔

''سال میں ایک بار اس کی طبیعت خراب ہوتی ہے اور اسی میں یہ پورے سال کے کلمے پڑھ لیتا ہے، تمہیں پتہ نہیں ہے کیا؟'' شاہ میر خشمگیں لہجے میں بولا تھا۔

''میں تو پہلی بار دیکھ رہی ہوں، آپ ہی ایک بار امی کو بتا رہے تھے کہ یہ بخار میں اللہ اکبر کے ورد کے سوا کچھ بول ہی نہیں رہے تھے۔'' شاہ زیب پر نظر جمائے وہ کمزور آواز میں بولی تھی۔

''اللہ اکبر کا ورد بھی سن لینا، پہلے کلمے پڑھ کر ایمان تازہ کر لینے دو۔'' دوائیاں چیک کرتا وہ بولا تھا۔

''اب ذرا جلدی سے دودھ کا گلاس لے آؤ، میں اسے اپنے سامنے ٹیبلٹس دیتا ہوں اور تمہیں بھی سمجھا دیتا ہوں کہ ایک گھنٹے بعد کون سی ٹیبلٹس دینی ہیں، ذرا جلدی مجھے اکیڈمی پہنچنا ہے۔'' عجلت میں باہر جاتی طروب کو ہدایت دیتا وہ شاہ زیب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا، شاہ میر کو وہ

گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی، گیٹ بند کرتے ہوئے اس کی سماعتوں سے شاہ زیب کی پکار ٹکرائی تو وہ ہول کر واپس کمرے میں بھاگی آئی تھی۔

''یہیں بیٹھی رہو، میرے سر پر دم کرو، سر پھٹ رہا ہے میرا۔'' اس کی سرخ انگارہ آنکھوں اور برہم سے مگر تکلیف سے دوہرے لہجے پر وہ جھٹ پھر اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔

''دوا کا اثر ہوتے بخار کم ہوگا تو درد بھی ختم ہو جائے گا، آپ کی طبیعت تھوڑی ہی دیر میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' طروب نے اسے تسلی دی تھی۔

''بخار نہیں ہونا چاہیے، اب تو امی بھی نہیں ہیں، میرے لئے دعا کرنے کے لئے۔'' اس کے کراہتے لہجے پر طروب کا ہاتھ اس کی پیشانی پر ساکت ہوا تھا، شاہ زیب کی بند آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دل آہنی شکنجے میں جکڑا تھا، دل میں درد کی لہریں اٹھتیں اس کے بند لبوں سے ٹکرا رہی تھی، شاہ زیب تو پھر غافل ہو گیا تھا مگر اس کا سر دباتے ہوئے طروب کا چہرہ گرم سیال سے بھیگتا رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بیت گیا تھا، اسے احساس ہی نہ ہوا تھا، اس کا ہاتھ مستقل شاہ زیب کے سر پر حرکت کر رہا تھا، چونکی وہ اس وقت جب اپنے ہاتھ کی ہتھیلی تلے اسے ہلکی ہلکی نمی محسوس ہوئی تھی، چند لمحوں تک وہ اس کے سرخ چہرے اور پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطروں کو دیکھتی رہی تھی، اس کے وجیہہ چہرے پر نقاہت سی پھیلی تھی، پتلی سی مغرور کھڑی ناک تلے لب خشک دکھائی دے رہے تھے، اپنے دوپٹے سے بہت احتیاط کے ساتھ اس کے چہرے سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے طروب کا دل بہت عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا، دھیرے دھیرے اس کے لائٹ براؤن نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے یکدم اسے اپنے ہی آپ سے کچھ خوف اور گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی، تب ہی اس کے بے سدھ وجود کو حرکت کرتے دیکھ کر طروب نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹایا تھا، نیند میں ہی وہ سینے کے بل ہوتا گہری نیند میں ہی تھا، اس پر چادر ٹھیک کرتے ہوئے وہ اس کے سرہانے سے اٹھ کر بیڈ کے قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی، بیڈ کے کنارے رکھے اپنے بازوؤں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ بغیر پلک جھپکے جانے کیوں بس اسے دیکھے گئی تھی، تکیے پر رکھے شاہ زیب کے چہرے کا رخ اسی کی جانب تھا، ایک طویل عرصے سے وہ اسی ایک شخص کے چہرے کو جاگتی اور بند سوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی، یہ چہرہ کسی یونانی دیوتا کا نہیں تھا، وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ اگر محبت کا کوئی چہرہ ہوتا تو بالکل اس خوابیدہ معصوم سے چہرے جیسا ہوتا، راحت کہاں تھی؟ اس کے مہربان سائے تلے، زندگی کہاں تھی، اس کی بانہوں کے مضبوط حصار میں، دل کا قرار کہاں تھا، بس اس کی ایک محبت بھری نگاہ میں، اس کے دامن کو چھوڑنا، اس سے جدا ہونا تو موت تھی، ایک ٹک اس کی بند آنکھوں کو دیکھتی وہ اردگرد سے غافل تھی۔

اس نے سنا تھا سچے اور بے لوث جذبے اثر رکھتے ہیں، وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب کے لئے اس کے جذبے صبح کی روپہلی کرن جیسے تھے اور نیت پر کھوٹ سے بالاتر، پھر کیوں اس کے جذبے اثر نہیں کرتے، وہ کوئی سنگ مرمر کا مجسمہ تو نہیں تھا، جو بھی تھا اس انجان کے سوا وہ کسی اور کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتی تھی، اتنا قریب آ جانے کے بعد وہ اب کسی قیمت پر اسے اپنے جذبوں سے غافل نہیں رہنا دینا چاہتی تھی، خاموش جذبوں کو وہ

اب زیان دینا چاہتی تھی، چھیننا نہیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اپنی سوچوں میں وہ اس قدر غافل تھی کہ شاہ زیب کی بند آنکھوں پر نظر جمائے رکھنے کے باوجود وہ اس کی کھلتی آنکھوں کا اندازہ بھی نہ کر سکی تھی، جب احساس ہوا تو دیر ہو چکی تھی، نظر وہ چرانا نہیں چاہتی تھی، اس کی نم آنکھیں اور شاہ زیب کی نیم وا آنکھیں، بنا پلک جھپکے اس گہرے خاموش نگاہوں کے ارتکاز میں کوئی جادو، کوئی سحر تھا، جانے کیوں طروب کے دل میں ایک کیف آگیں سی سرخوشی جاگی تھی، جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا تھا، شاہ زیب کے خوابیدہ سے چہرے اور سرخ خاموش نیم وا آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مگر بھرپور مسکراہٹ رینگ گئی تھی، شاہ زیب چند لمحوں تک خاموش نظروں سے اس کی مسکراہٹ کا عکس اس کی جھلملاتی آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا اور پھر نیم وا آنکھیں موند کر گردن کا رخ بدل کر اس کی جانب سے چہرہ پھیر گیا تھا، بے ساختہ اس کی اس حرکت پر طروب کے لبوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی، اس کی رگوں میں سرشاری اور نئی زندگی جیسے دوڑنے لگی تھی، کارپٹ سے اٹھ کر وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی۔

''چہرہ یا نگاہ پھیر لینا بہادری نہیں۔'' مسکراہٹ چھپائے وہ ذومعنی لہجے میں بولی تھی اور پھر اس کی پشت پر ہاتھ ٹکا کر قدرے اس کے شانے پر جھکی تھی۔

''میں آپ کے لئے بہت مزیدار سا سوپ بنانے جا رہی ہوں، بس پندرہ منٹ لگیں گے، تب تک شاہ بھی آ جائیں گے، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیجئے گا۔'' بند آنکھوں سے اس کی آواز سنتے ہوئے وہ اپنی پشت پر اس کے ہاتھ کا گداز لمس اور اپنے شانے پر بکھرتی بھینی بھینی سی موتیا کی بند کلیوں کی خوشبو کو محسوس کرتا رہا تھا اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی۔

☆☆☆

دوبارہ جب غنودگی کا زور ٹوٹا تو سر اور وجود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا، البتہ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، چند لمحوں تک وہ کھلے دروازے کی سمت دیکھتا رہا تھا، گہری خاموشی سے اندازہ ہوا تھا کہ شاہ میر کی واپسی ابھی نہیں ہوئی ہے، گریبان کے بٹن کھولتا وہ بیڈ سے اٹھ کر وارڈ روب کی سمت گیا تھا، طروب کی بدولت اب وارڈ روب میں روزانہ کچھ لباس پریس شدہ ہینگ ہوئے مل جایا کرتے تھے، اس سہولت سے شاہ میر نے خوف فائدہ اٹھایا تھا، ہینگ کیا آف وہائٹ آرام دہ شلوا سوٹ نکال کر وہ واش روم کی سمت چلا گیا تھا، باتھ لے کر طبیعت کچھ فریش ہو گئی تھی، کمرے سے باہر آتے ہوئے لاؤنج تک اس کی متلاشی نظریں گئیں تھیں مگر طروب شاید کچن میں تھی۔

کچن کے باہر ہی اندر سے ابھرتی آواز پر اس کے قدم رک گئے تھے۔

''شاہ! کہیں ایسا تو نہیں، شہرینہ کی ناراضی اور قطع تعلق کی وجہ سے وہ ٹینس ہوں اور ان کی طبیعت پر اس کا اثر ہوا ہے۔'' کھٹ پٹ کی آوازوں کے درمیان طروب کی آواز سنائی دی تھی۔

''ابھی اتنے برے دن نہیں آئے، زیب پر، شہرینہ اور جونک میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے، اس کا نہ ہونا ہی شاہ زیب کی اچھی صحت کی ضمانت......'' شاہ میر کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''یہ تو آپ سوچتے ہیں۔'' وہ بولی تھی۔

''میری سوچ میں کوئی مبالغہ نہیں، شاہ

زیب مرد ہے، اپنی انا اور زبان کا پاس رکھنے کے لئے وہ کسی حد تک بھی جا سکتا ہے مگر اپنی زبان سے نہ پھر سکتا ہے نہ کمٹمنٹ سے۔"

"لیکن پھر بھی۔"

"ارے اب کیوں دماغ کھپا رہی ہو شہرینہ اور شاہ زیب نامہ طویل کر کے، بھوک سے آنتیں چیخ رہی ہیں میری۔"

"بس پانچ منٹ۔" شاہ میر کی دہائی پر وہ بولی تھی۔

"پانچ منٹ کیا تم پانچ صدیاں لے لو مگر کبھی تو اس بارے میں سوچو کہ تمہارے آکا جان نے کتنے قابل اور خوبصورت بندے کا انتخاب کیا ہے تمہارے لئے۔" شاہ میر کے لہجے میں شرارت تھی۔

"فضول مذاق۔" وہ مصروف انداز میں اتنا ہی بولی تھی جبکہ شاہ میر مسکراتے ہوئے کچن میں داخل ہوتے شاہ زیب کی طرف متوجہ ہوا تھا جس کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں نظر آتے منظر پر۔

کاؤنٹر کے پاس طروب کافی مصروف نظر آ رہی تھی مگر اس کا دوپٹہ کرسی کی پشت پر پڑا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے نصیب دشمناں؟" شاہ میر نے مسکراتی نظروں سے اس کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا۔

"دعا ہے تمہاری۔" بولتے ہوئے شاہ زیب نے کرسی سے دوپٹہ اٹھایا تھا۔

"یہ پکڑو۔" طروب کو متوجہ کرتے ہوئے وہ لہجے کی ناگواری نہیں چھپا سکا تھا، فوراً آگے بڑھ کر دوپٹہ لے کر شانوں پر ڈالتے ہوئے وہ واپس کاؤنٹر کی طرف گئی تھی مگر اسے سانپ ضرور سونگھ گیا تھا، دوپٹہ شاہ زیب سے لیتے ہوئے بس ایک پل کو نگاہ ٹکرائی تھی، جو کچھ طروب کو اس کی آنکھوں میں نظر آیا تھا، وہ اس پر گھڑوں پانی ڈال گیا تھا، کھانا ٹیبل پر لگاتے ہوئے وہ کافی نروس تھی شکر تھا کہ شاہ میر، شاہ زیب کی طرف ہی متوجہ تھا، کھانے کے دوران شاہ میر نے نہ صرف کھانے کی بلکہ شاہ زیب کے لئے بنائے گئے سوپ کی بھی بہت تعریف کی کھانے کے بعد وہ شاہ میر کی فرمائش آنے سے پہلے ہی اس کے لئے کافی بنانے کی تیاری کر رہی تھی کہ شاہ میر نے آ کر اسے روک دیا تھا۔

"آئسکریم اور واک کا موڈ ہو رہا ہے، فٹا فٹ چلو۔"

"اس وقت؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"تو کیا ہوا، اب چلو جلدی، شاہ زیب کو بتا دیا ہے میں......"

"شاہ! مجھے اس حلیے میں باہر نہیں جانا۔"

"کیا ہوا ہے حلیے کو، بس ٹھیک ہے، چلو اب۔" اس کی ایک سنے بغیر شاہ میر اس کا ہاتھ پکڑے باہر کھینچ لے گیا تھا، لاؤنج میں موجود شاہ زیب سے کچھ کہنے یا اجازت لینے کا موقع بھی طروب کو نہیں ملا تھا۔

دبے قدموں وہ لاؤنج میں آئی تھی، آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک نظر شاہ زیب کے کمرے کی جانب دیکھا تھا، دروازہ چوپٹ کھلا تھا، نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں بیڈ پر اسے شاہ میر سویا ہوا نظر آیا تھا، شاہ میر کے ساتھ جب وہ گھر واپس آئی تو ان دونوں کے انتظار میں شاہ زیب لاؤنج میں تھا، طروب کو یاد تھا کہ سونے سے پہلے اس کو ٹیبلٹس لینی ہیں۔

"میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں، تم میرے لئے مزید پریشان مت ہو۔" طروب نے اس سے پوچھا تھا کہ ٹیبلٹس وہ ابھی لے گا یا کچھ دیر بعد جواباً شاہ زیب کے سرد مہری سے کہنے پر وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی جبکہ وہ فلور کشن

پر سر رکھے کمبل لیتا یقیناً وہیں سونے کا ارادہ رکھتا تھا اسی دوران شاہ میر چینج کر کے باہر آیا تھا۔

''زیب! تم یہاں سو رہے ہو کیوں؟''

''کیا فضول سوال کر رہے ہو، میں کمرے میں سوؤں یا یہاں، قیامت آجائے گی کیا؟'' اس کے جھلائے انداز پر شاہ میر بھی ایک پل کو حیران ہوا تھا۔

''چندا! میری بلا سے تم باتھ ٹب میں جا کر سو جاؤ، مجھے تو بہت دن بعد خالی بیڈ مل رہا ہے، میں چلا سونے، گڈ نائٹ ملکہ طروب! زندگی رہی تو آپ کے ہاتھوں سے بنا ناشتہ کریں گے، دوپہر کے ایک یا دو بجے تک کیونکہ کل چھٹی کا دن ہے۔'' شاہ میر بولتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔

''دو منٹ تو لگیں گے ٹیبلٹس کھانے میں، پھر سو جاتے۔'' جھجکتے ہوئے طروب نے ایک آخری کوشش کی تھی مگر نہ شاہ زیب نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا تھا نہ ہی کوئی جواب دیا، ناچار لاؤنج کی لائٹس آف کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف آگئی تھی، اس کا کمرہ تو سیٹ ہو چکا تھا مگر سوئچ بٹن کام نہیں کر رہے تھے، آج جب وہ کھانا اور سوپ تیار کر رہی تھی تو شاہ میر نے گھر آکر اس دوران پہلا کام یہی کیا تھا کہ بٹن چینج کر دیئے تھے، الگ تھلگ اس کمرے میں اس کی پہلی رات تھی، پرائیویسی سے زیادہ اسے یہاں بہت تنہائی اور وحشت سی محسوس ہو رہی تھی، سارا دھیان اس کا شاہ زیب کی طرف بھی تھا، آج اسے یہ محسوس کر کے بہت اچھا لگا تھا کہ اس کے اور شاہ زیب کے درمیان فاصلے بہت حد تک کم ہو گئے ہیں، صرف اسے ہی نہیں کہیں نہ کہیں شاہ زیب کے لئے بھی اس کا قریب ہونا اہم تھا لیکن پھر شاہ زیب کے سرد انداز نے اسے ساری خوش فہمی سے دور کر دیا تھا، اسے اندازہ تھا کہ وہ لاپروائی کا مظاہرہ کر گئی تھی، اسے شاہ میر کی موجودگی میں دوپٹے سے بے نیاز نہیں رہنا چاہیے تھا، لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رات میں شاہ میر کی ضد پر باہر جانے پر وہ برہم کیوں نظر آ رہا تھا، اس نے سوچا تھا کہ شاید یہ اس کا وہم ہو، اب تک وہ باہر شاہ میر کے ہمراہ ہی جاتی رہی تھی، یہ کوئی پہلی بار تو نہیں تھا، نہ ہی شاہ زیب انجان تھا، بڑھتی وحشت اور کمرے کی تنہائی سے گھبرا کر وہ اب لاؤنج کی طرف آگئی تھی، کچھ دیر تک وہ صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھے تذبذب میں مبتلا کھڑی رہی تھی، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سویا ہوا نہیں ہے، بغیر کوئی آہٹ کیے وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی اور کچھ جھجکتے ہوئے شاہ زیب کے شانے کو چھوا تھا جو دوسری سمت کروٹ لئے ہوئے تھا مگر طروب کے چھوتے ہی وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتا فوراً اٹھ بیٹھا تھا، جبکہ اس کی حیران سوالیہ نظروں پر طروب بری طرح شرمندہ ہوتی سمٹ سی گئی تھی۔

''کیا ہوا؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' مدھم زرد روشنی میں شاہ زیب نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''وہاں کمرے میں بہت عجیب سا لگ رہا ہے، اسی لئے۔'' سر جھکاتے ہوئے وہ بات ادھوری چھوڑ گئی تھی، گہری سانس لے کر شاہ زیب نے اسے دیکھا تھا جو اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی بار بار نہ رکنے والے آنسو صاف کر رہی تھی۔

''امی کی یاد آ رہی ہے؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شاہ زیب نے پوچھا تھا، جواباً آنسو روکنے کی کوشش کرتی وہ بس اثبات میں سر ہلا سکی تھی۔

''مجھے بھی۔'' اس کے مدھم لہجے پر طروب

نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
''گھر بہت یاد آ رہا ہے، میرا یہاں دل نہیں لگ رہا، مجھے واپس گھر چھوڑ آئیں، میں رہ لوں گی وہاں۔'' بہتے آنسوؤں کے ساتھ کانپتے لہجے میں بولی تھی۔
''ہمیں یہاں چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟'' شاہ زیب کے سوال پر وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی، اس کے رخساروں پر بہتے آنسو دھیرے سے صاف کرتے ہوئے شاہ زیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا، طروب کا دل چاہا تھا کہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روئے، اتنا روئے کے دل کا سارا درد سارا غبار نکل جائے، یہ پہلا موقع تھا کہ جس میں اس کا درد بانٹ کر وہ اسے احساس دلا رہا تھا کہ وہ بے سائبان نہیں رہ گئی ہے۔
''جانتی ہو، تمہارے اچانک غائب ہونے پر مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے جو کچھ باقی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا، میں بالکل تہی دست رہ جاؤں گا اگر تم مجھے نہ ملیں۔'' ساکت نظروں سے وہ اسے دیکھ رہی تھی جو ایک پل کو رکا تھا۔
''تم نے مجھ سے کئی گناہ زیادہ وقت امی اور ابو کے ساتھ گزارا ہے، میں تو پرندے کا وہ بچہ تھا کہ جس نے پر نکلتے ہی وہ اڑان بھری کے پھر پلٹ کر اس گھونسلے کی جانب نہیں دیکھا جو اس کی بنیاد تھا، تم میرے ماں باپ کا سایا بن کر رہیں، اب بھی تم ان کی پرچھائیں ہو، جو فرض جو حق مجھ پر تھے ان کے، وہ سب تم پورے کرتی رہیں، میرے لئے تم میری اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اہم ہو طروب، مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ تمہارے ساتھ سختی کر کے میں نے امی کی روح کو بھی بے سکون کیا ہے، اسی لئے تو وہ ایک بار بھی میرے خواب میں نہیں آئیں، نہ ہی ابو، ان دونوں کی زندگی میں بھی میں ان کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکا اور اب تمہیں تکلیف پہنچا کر ان کی روح کو بھی تڑپا دیا ہوگا، لیکن تم تو جانتی ہو کہ میرا مقصد صرف تمہاری بھلائی تھا، میں کبھی کہاں اس حق میں تھا کہ میرے گھر کی عزت گھر سے باہر رہے، ہاسٹل کتنا ہی محفوظ کیوں نہ ہو مگر وہ گھر کا نعم البدل تو نہیں۔''
''میں سب سمجھتی ہوں، میری نظر میں اس جگہ سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں جہاں آپ موجود ہوں، میں امی ابو کی پرچھائیں ہوں تو آپ ان کے وجود کا حصہ ہیں، تو پھر آپ اور میں کیسے الگ الگ ہو سکتے ہیں، دنیا اس تعلق کو کس نظر سے دیکھتی ہے مجھے اس کی فکر نہیں ہے، مجھے بس آپ کی پرواہ ہے۔'' نظر جھکائے وہ بھیگے لہجے میں بول رہی تھی۔
''آپ یہ مت سوچیں کہ آپ نے امی ابو کی امیدوں کو پورا نہیں کیا، ان دونوں کو تو آپ پر بہت فخر تھا، وہ آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے، آپ نے ان کے اس خواب کو پورا کیا، دور رہ کر بھی آپ نے ان سے اپنا تعلق بہت مضبوط رکھا، میرا یقین کریں، وہ دونوں آپ سے بہت خوش اور مطمئن ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں، یہ بات مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے۔''
''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' شاہ زیب کے مدھم لہجے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''یہ بالکل سچ ہے۔'' طروب کے جواب نے ایک عجیب سی پرسکون ٹھنڈک اس کے سینے میں بکھیر دی تھی۔
''میں کوشش کروں گا کہ جلد ہی تمہارے ساتھ گھر جاؤں تھوڑا سا انتظار کر لو۔'' شاہ زیب کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
''آپ اب مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟''

طروب کے سوال پر شاہ زیب نے اسے دیکھا تھا، خوابناک سی زرد روشنی میں اس کے چہرے پر بکھری معصومیت اور خود پر جمی بھنورا سی آنکھوں نے دل کی کیفیت عجیب کی تھی، فوراً ہی وہ اس کے چہرے سے نظر ہٹا گیا تھا۔

''شاہ بس یہ کوشش کرتے ہیں کہ میں یہاں خوش رہوں، رات کے وقت باہر نکلنا مجھے بھی ٹھیک نہیں لگا تھا لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔'' نظر جھکائے وہ نادم سے لہجے میں بولی تھی۔

''وہ ایسا ہی ہے، خود بھی خوش رہتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے، کسی کو پریشان اداس نہیں دیکھ سکتا، میں ناراض نہیں کسی بات کو لے کر، تم سمجھدار ہو میں تم سے یہی امید رکھتا ہوں کہ تم محتاط اور کچھ ریز رو رہو تو اچھا ہے۔'' شاہ زیب کا لہجہ سنجیدہ تھا مگر اس میں چھپی تاکید طروب تک پہنچ گئی تھی۔

''کافی وقت ہو گیا ہے، تمہیں اب جا کر سونا چاہیے، مجھے تو ابھی نیند آنا مشکل ہے۔''

''میں بھی یہیں سو جاؤں، کمرے میں مجھے نیند نہیں آئے گی۔'' اس نے اجازت طلب نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے، لیکن صرف آج ہی، کمرے میں رہو گی تو اس سے انسیت ہو گی۔'' وہ بولا تھا۔

''میں آپ کے لئے نیم گرم دودھ اور ٹیبلٹس لے آتی ہوں، اس کے بعد آپ کو یقیناً نیند آ جائے گی۔''

''ایسا ہے تو پھر لے آؤ۔'' شاہ زیب کے کہنے پر وہ ہلکا سا مسکرا کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

صوفے پر کشن ٹھیک کر کے اس پر سر رکھتے ہوئے طروب نے اسے دیکھا تھا جو صوفے سے ذرا اور دور ہوتا دراز ہو رہا تھا، آنکھیں بند کیے وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں تھی۔

ایک وہ زمانہ بھی گزرا تھا جب آنکھیں دید کے لئے ترستی رہتی ہیں اور آج یہ عالم تھا کہ وہ ساری رات بھی اسے دیکھتی رہتی تو وہ چہرہ اوجھل ہونے والا نہیں تھا، ایک ہاتھ سر کے نیچے اور دوسرا سینے پر رکھے وہ بھی سونے کی کوشش میں تھا، شاید طروب ایک ٹک اسے دیکھے گئی تھی، پتہ نہیں وہ واقعی اتنا شاندار تھا یا پھر اسے ہی ہر انداز میں شاندار لگتا تھا، اس وقت بھی وہ اسے کسی ماہر سنگ تراش کے ہاتھوں سے بنا سنگ مرمر کا شاہکار دکھائی دے رہا تھا۔

''سو جاؤ طروب۔'' بند آنکھوں سے بنا اس کی جانب رخ کیے وہ بولتا اس کی روح کھینچ گیا تھا، دل دھک سے رہ گیا تھا، چہرہ دوپٹے میں چھپا کر اس نے اپنی دھڑکنوں کے سنبھلنے کا انتظار کیا تھا، دھڑکنیں جانے کب سنبھلیں البتہ نیند ضرور غالب آ گئی تھی۔

☆☆☆

دن کبھی بہت بوجھل اور کبھی بہت سہل انداز میں گزرتے جا رہے تھے، بس ایک اندیشہ انجانا سا تھا جو ہمہ وقت دل میں موجود رہتا تھا، شاید اس اندیشے کو شہرینہ سے منسوب کرنا مناسب تھا، شاہ میر کی تسلی اور یقین دہانیوں کے باوجود وہ مطمئن نہیں تھی، اسے لگتا تھا کہ شہرینہ سے تعلق کے پانچ سال کا مقابلہ اس کے یہ گنتی کے دن کیسے گزر سکیں گے، شہرینہ کے پاس زیر کرنے کے لئے سب کچھ تھا، حسن و نزاکت کے تمام لوازمات رکھتی تھی وہ جبکہ اپنے بارے میں اسے یہ پتا تھا کہ وہ تو کوئی ایسا منفرد انداز بھی نہیں رکھتی تھی کہ جس سے متاثر ہو کر شاہ زیب اس کے لئے اپنی سوچ اور جذبات کو بدل سکتا، بہر حال وہ

اپنے دل میں چھپے جذبات سے مایوس اور ناامید نہیں تھی، اس کی اب یہی کوشش تھی کہ اس کی ذات سے شاہ زیب کو کوئی شکایت نہ ہو، شاہ زیب نے جو محتاط رہنے کی تاکید کی تھی وہ اس نے ذہن نشین کر لی تھی، بلا ضرورت وہ پہلے بھی شاہ میر کے ہمراہ باہر نہیں گئی تھی، بعد میں بھی جب کبھی اسے آئسکریم یا واک کے لئے باہر لے جانا چاہا تو اس نے شاہ زیب کی ناراضی سے ڈر سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا ورنہ سچ تو یہ تھا کہ باہر کی کھلی فضا میں نکلنا چاہتی تھی، شاہ میر بھی یہ دیکھتا تھا کہ وہ سارا دن گھر میں تنہا گزار دیتی ہے، شاہ میر اور شاہ زیب اکثر اکیڈمی سے واپس آنے کے بعد بھی باہر چلے جاتے تھے اور وہ پھر ان دونوں کی واپسی کے انتظار میں تنہا رہ جاتی، شاہ میر کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے وقت دے یا اسے باہر لے جائے مگر جب وہ خود باہر جانے میں سستی دکھاتی تو شاہ میر ناراض ضرور ہوتا مگر فورس نہیں کرتا تھا، ایسے میں اسے شاہ زیب پر بہت غصہ آتا تھا، اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شاہ زیب کو اس کا شاہ میر کے ساتھ باہر آنا جانا پسند نہیں تھا، اس کی ناراضی اور ناگواری کا اندازہ طروب کو اس کی آنکھوں سے ہو جاتا تھا اور اس کے تاثرات سے بھی، جبکہ طروب کے لئے ناقابل برداشت تھی اس کی ذرا سی بھی ناراضی۔

اس وقت وہ ٹیرس کی باؤنڈری پر ہاتھ ٹکائے گارڈن ایریا کی معدوم ہوتی رونق کو دیکھتی جانے کس سوچ میں گم تھی کہ شاہ میر کی آمد ہو گئی تھی۔

''یہاں کیوں آ گئیں خیریت؟''

''بس یونہی، مجھے نیوز چینلز اور نیوز پر تبصروں میں کوئی دلچسپی نہیں آپ دونوں حضرات کی طرح۔'' طروب کے جواب پر وہ دھیرے سے ہنستا باؤنڈری پر کہنیاں ٹکائے نیچے کا جائزہ لینے لگا تھا۔

''تم یہاں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی ہو؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شاہ میر نے پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں، کوشش تو کر رہی ہوں۔'' وہ بولی تھی۔

''تم اپنی اسٹڈیز کا سلسلہ پھر سے اسٹارٹ کر دو، مصروفیات بڑھیں گی تو اچھا اثر پڑے گا۔''

''سوچوں گی اس بارے میں۔'' وہ بے دلی سے بولی تھی۔

''نالائق لڑکی۔'' شاہ میر کی خشمگیں نظروں پر وہ ہنسی تھی، تب ہی اس کی نظر ٹیرس کے دروازے کی سمت گئی تھی جبکہ اس کے ہنستے چہرے سے نگاہ ہٹاتا شاہ زیب جتنی خاموشی سے وہاں آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس چلا بھی گیا تھا، شاہ میر کی پشت دروازے کی سمت تھی اس لئے وہ اسے نہیں دیکھ سکا تھا، طروب کو بہت عجیب لگا تھا یہ، اسی لئے وہ شاہ میر کی بات بھی دھیان سے نہ سن سکی تھی۔

''ایک بات سچ سچ بتائیں، کیا واقعی آغا جان نے بھی شہرینہ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا ہے؟'' اس کے اچانک سوال نے شاہ میر کو حیران کیا تھا۔

''میں بات کیا کر رہا ہوں اور تم درمیان میں کس فتنے کا ذکر لے آئیں۔''

''آپ میری بات کا جواب دیں۔'' وہ زچ ہوئی تھی۔

''وہ کیوں کوئی رابطہ کرے گا، نہ میں ہی اسے ایسا کرنے دوں گا، لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا ہے، شہرینہ آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والی نہیں، کیونکہ ابھی بھی اسے شاہ زیب سے

بہت کچھ مل سکتا ہے۔'' شاہ میر کے طنزیہ لہجے پر وہ خاموش رہی تھی۔

بیک کراؤن سے پشت ٹکائے وہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھا، بس ایک نگاہ اٹھا کر اس نے شاہ میر کو دیکھا تھا، جو کچھ تیز نظروں سے اسے دیکھتا بیڈ پر نیم دراز ہوا تھا۔

''کیا ہوا ایسی خطرناک نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''مجھے کافی دن سے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے طروب کو میرے ساتھ باہر کہیں جانے سے منع کیا ہے۔'' شاہ میر کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا۔

''یہ تمہارے دماغ کا خبط ہے، میں ایسا کیوں کروں گا، طروب نے ایسا کچھ کہا تم سے؟'' شاہ زیب ناگواری سے بولا تھا۔

''نہیں اگر ایسا نہیں ہے تو وہ کیوں تمہارے بارے میں ایسی بات کہے گی، مجھے ایسا محسوس ہوا تو تم سے پوچھ لیا۔'' شاہ میر نے کہا تھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ تمہیں ایسا لگنا ہی نہیں چاہیے، دوسری بات یہ کہ تم کوئی غیر نہیں ہو جو میں بے سروپا پابندیاں طروب پر لگاؤں گا۔'' ناگوار لہجے میں بول کر وہ دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''پھر شاید طروب کو میرے ساتھ باہر جانے میں کچھ پرابلم ہو، سارا دن وہ گھر کے اندر گزارتی ہے، تم ہی کبھی اسے اپنے ساتھ باہر لے جایا کرو۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو، اسے باہر جانا ہوتا ہے تو وہ تم سے ہی کہتی ہے، ہر بات تم سے شیئر کرتی ہے، تم سے کیا پرابلم ہو سکتی ہے اسے۔'' شاہ میر کی جانب دیکھے بغیر وہ بولا تھا، البتہ اس کی پیشانی پر ناگواری کے بل شاہ میر سے چھپے نہیں رہ سکے تھے، مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس نے ہاتھوں کا تکیہ بنا کر ایک بار پھر شاہ زیب کو دیکھا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ تم طروب کو میرے لئے راضی کر لو گے؟'' شاہ میر کے سوال پر وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''تم خود جا کر راضی کر لو اسے، کیا مشکل ہے۔'' شاہ زیب کے بگڑے سے انداز پر وہ اپنی ہنسی نہیں روک سکا تھا۔

''مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے زندگی میں، کیوں ابھی مروانے پر تلے ہو، محترمہ کی شخصیت ہی نہیں عادتیں بھی تم سے کافی ملتی جلتی ہیں، تم نے اسے میرے لئے چنا ہے تو راضی کرنے کی ذمہ داری بھی تمہاری۔'' شاہ میر کے غیر سنجیدہ انداز پر وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے وہ ایک پل کے لئے کچن میں داخل ہوتی طروب کی طرف متوجہ ہوا تھا، شانے پر دوپٹہ درست کرتی وہ کچھ تذبذب میں دکھائی دے رہی تھی۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' باٹل سے پانی گلاس میں نکالتے ہوئے وہ سرسری لہجے میں بولا تھا۔

''آپ مجھ سے کس بات پر ناراض ہیں؟'' وہ بمشکل پوچھ سکی تھی۔

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' پانی کا ایک گھونٹ بھر کر اس نے سنجیدہ نظروں سے طروب کو دیکھا تھا جبکہ طروب کو بہت مشکل لگا تھا وضاحت کرنا۔

''آپ مجھ سے بات جو نہیں کرتے تو......'' اٹکتے لہجے میں وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھی نہ ہی اس کی جانب دیکھ سکی تھی۔

''کمال ہے، شاہ سے اتنی باتیں کرنے کے

بعد اور کون سی باتیں رہ جاتی ہیں جو تمہیں مجھ سے کرنی ہیں۔'' کچھ تھا اس کے لہجے میں کہ طروب گنگ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''بہرحال اگر تمہیں کچھ کہنا ہے مجھ سے تو ضرور کہو۔'' اپنے چبھتے لفظوں کا احساس ہوتے ہی وہ کچھ نرم لہجے میں بولا تھا مگر اس وقت وہ نادم سا ہوا تھا جب طروب کچھ بھی کہے بغیر پلٹتی تیزی سے کچن سے نکل گئی تھی۔

طروب کا خاموش ردعمل ناراضی کی صورت میں صبح سامنے آ گیا تھا، ناشتے کے لوازمات ٹیبل پر چنے ہوئے تھے جب وہ کچن میں داخل ہوا تھا۔

''آج موسم کچھ ناساز گار ہے۔'' شاہ زیب کو معنی خیز لہجے میں مخاطب کرتے شاہ میر کا اشارہ طروب کی طرف ہی تھا جبکہ شاہ زیب تو پہلے ہی بھانپ چکا تھا طروب کے بہت سنجیدہ تاثرات اور خاموشی کو ایک بار بھی اس نے نگاہ اٹھا کر شاہ زیب کو نہیں دیکھا تھا۔

''موسم کی فطرت ہے بدلنا، ساز گار بھی ہو جائے گا۔'' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے طروب کو دیکھا تھا، جس نے اورنج جوس گلاس میں بھر کر شاہ میر کے سامنے رکھا تھا اور پھر جگ وہیں ٹیبل پر رکھ کر کاؤنٹر کی سمت چلی گئی تھی۔

''ملکہ طروب نے آج میری فرمائش پر تازہ تازہ جوس میرے لئے تیار کیا، تم کڑوی کسیلی چائے پر ہی اکتفا کرو۔'' اسے جتاتے ہوئے شاہ میر مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا تھا۔

''ہنس لے بیٹا، ہنس لے، تیرا ہنسنا بنتا ہے۔'' شاہ زیب کے خشمگیں لہجے پر وہ مزید اسے جلانے کے لئے ہنسا تھا، چائے کا مگ تھامے طروب نا چاہتے ہوئے بھی ٹیبل کے گرد آ بیٹھی تھی۔

''تم ناشتہ نہیں کر رہی ہو؟'' شاہ میر نے پوچھا تھا۔

''نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ مختصراً بولی تھی جبکہ شاہ میر نے چونک کر شاہ زیب کو دیکھا تھا جو اس کے جوس کا گلاس اٹھا کر نوش کرنے لگا تھا۔

''تمہارے سر پر سینگ نہیں مگر ہو تم مکمل بارہ سنگھا۔'' شاہ میر نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا تھا جو جوس کا گلاس خالی کر کے ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔

''طروب! تمہیں برا تو نہیں لگا میں نے تمہارے جان سے پیارے آکا جان کو بارہ سنگھا کہا؟'' شاہ میر نے جان بوجھ کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''آپ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔'' وہ سنجیدگی سے ہی بولتی اپنی چائے کی طرف متوجہ رہی تھی۔

''صبح صبح بے عزتی۔'' شاہ زیب گہری سانس لے کر بولا تھا تب ہی شاہ میر عجلت میں اپنی جگہ سے اٹھا تھا کہ باہر سے اسے اپنے فون کی چیخنے کی آواز آئی تھی۔

''ہماری ایسی قسمت کہاں کہ کوئی ہمیں جان سے پیارا رکھے۔'' شاہ زیب کے ٹھنڈی آہ بھرنے پر طروب نے بے اختیار نظر اٹھائی مگر اگلے ہی پل اس کی مسکراتی نظروں سے نگاہ چراتے ہوئے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

''اپنا ناشتہ بارہ سنگھا کے ساتھ شیئر کرنا میں بذات خود......'' اپنی پلیٹ طروب کے سامنے کرتا وہ مسکراتے لہجے میں بولا تھا جبکہ اس بار بے ساختہ مسکراتے ہوئے طروب نے اس کی پلیٹ میں سے ایک سینڈوچ اٹھا لیا تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

عابی ناز

''ابا جی! یہ دوائی کھا لیں۔'' رضوانہ نے گہری نیند سوئے اکبر خان کے کندھے کو ایک بار پھر سے ہلایا، اس کے ایک ہاتھ میں دوا کی پڑیا تھی تو دوسرے ہاتھ میں دودھ کا گلاس، اکبر خان نے مندی مندی سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگے، اپنا نحیف و بے جان سا لرزتا وجود سنبھال کر اٹھنے میں انہیں پانچ دس منٹ درکار تھے اور رضوانہ کے پاس پانچ دس منٹ کا وقت نہیں تھا، بچے ابھی سکول سے آئے تھے اور اب بیگز جوتے اور یونیفارم کمرے میں اِدھر اُدھر پھینک کر دھما چوکڑی میں مشغول ہو چکے تھے رضوانہ نے ابا جی کو کندھوں سے پکڑ کر بیٹھنے میں مدد دی، دودھ کا گلاس وہ قریبی چھوٹے سے میز پر رکھ چکی تھی، انہیں سنبھال کر دوا کھلانے کے دوران وہ کوئی پانچویں بار بچوں کو چلا چلا کر اودھم مچانے سے منع کر چکی تھی مگر وہاں اثر ہی کسے تھا، رضوانہ جانتی تھی جب تک وہ خود جا کر انہیں دو دو ہاتھ لگاتی ہوئی کمرے کی چیزیں پھر سے ترتیب دے کر اپنے ان تین افلاطون بچوں کو کھانے کے لئے اپنی نگرانی میں نہ بٹھائے گی تب تک ان کا یہ طوفان تھمنے والا نہیں، اسی لئے جلدی سے ابا کو دوائی دے کر دودھ کا گلاس انہیں تھمائی۔

''احتیاط سے ختم کر لیجئے گا گلاس ابا جی!''

کہہ کر وہ تیزی سے بچوں کے کمرے کی طرف بڑھی، جہاں بچے اسے دیکھتے ہی ذرا سنبھلے تھے مگر وہ پھر بھی انہیں ڈانٹتی ڈپٹتی ایک دو دھموکے جڑتی ان کے کپڑے بدلوانے لگی، ان کا پھیلاوا سمیٹ کر کھانا دینے سے پہلے وہ ایک بار پھر ابا جی کے کمرے میں آنا نہیں بھولی تھی کہ آیا انہوں نے دودھ کا گلاس خالی کیا یا نہیں؟ مگر یہ کیا؟ ابا جی دودھ والا خالی گلاس زمین پر رکھ کر سیدھے ہوئے تو اس کی نظر ان کی قمیض اور گیلی ہوئی شلوار پر پڑی۔

''ابا جی! یہ کیا آپ نے دودھ آج پھر گرا لیا اپنے اوپر۔'' اسے یکدم ہی ڈھیروں کوفت اور جھنجھلاہٹ نے گھیر لیا تھا لیکن پھر بھی وہ لہجے کو حتی المقدور نارمل رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی، بچے بھوک بھوک اور کھانا کھانا کی رٹ لگاتے ہوئے اسے ستا رہے تھے جبکہ ابا جی کی وجہ سے اس کے کاموں میں ایک اور اضافہ ہو چکا تھا۔

''بس بیٹا بہت احتیاط سے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی ان کانپتے ہاتھوں کا کیا کروں جن سے ایک گلاس بھی نہیں سنبھلتا۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سے کہہ رہے تھے۔

''چلیں اٹھیں اب میں بیڈ کی چادر بدل دوں اور آپ کو دوسرے کپڑے لا دیتی ہوں آپ کپڑے بدل لیں۔'' ان کی شرمندگی و بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا مگر بے زاری پھر بھی لہجے سے عیاں ہو گئی۔

''ارے نہیں بہو بیٹا! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں کچھ دیر تک ہوا لگے گی تو خود ہی خشک ہو جائیں گے سارے کپڑے، تم بچوں کو کھانا دو۔'' وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ہزار بکھیڑوں میں الجھی بہو کے کندھوں پر ان کی وجہ سے مزید بوجھ بڑھے۔

"دے دوں گی کھانا بچوں کو پہلے آپ اٹھیئے اور یہ کپڑے بدلیے۔" وہ اکبر خان کا نیا استری شدہ سوٹ اٹھا لائی تھی اور پھر ان کے منع کرنے اور نہ کرنے کے باوجود ان کے کپڑے بدلوا کر بیڈ کی چادر بدلنے لگی، اکبر خان کی بیماری کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے اتنا سا کام نمٹانے میں اس کا آدھا گھنٹہ صرف ہو گیا اور اس دوران وہ دو تین مرتبہ بھوک سے بلکتے اور اپنے اردگرد

منڈلاتے بچوں کو بری طرح سے جھڑکتی ہوئی پیٹ چکی تھی مگر اندر کی کھولن پھر بھی کم نہ ہو رہی تھی، اکبر خان مداوے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے بہو کے موڈ کی بحالی کے لئے تینوں بچوں کو اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتے دس دس کے نوٹ تھما رہے تھے، جبکہ بہو یہ سب کچھ نظر انداز کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی اب وہ بچوں کو وہیں سے کھانے کے لئے آوازیں لگا رہی تھی مگر بچے اس کے منع کرنے اور ڈپٹنے کے باوجود دس کا نوٹ تھامے نزدیکی دوکان کا رخ کر چکے تھے، کھانا وہیں پڑا پڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا، رضوانہ کا موڈ ٹھیک ہونے کی بجائے مزید خراب ہو گیا۔

☆☆☆

بچوں کو سکول بھیج کر اس نے سکھ کا سانس لیا، صبح صبح جب تک وہ سب سکول نہ جاتے اپنی طرح طرح کی فرمائشوں اور شرارتوں سے اسے ہولائے رکھتے، پہلے تو صبح انہیں اٹھانا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، مستزاد ان کی الگ الگ ناشتے کی فرمائش اسی دوران ان کی ٹائی، ٹوپی، جرابیں، جوتے، بیٹی کی چھوٹی سی دوپٹے نما پٹی بیگ اور ان میں ٹھونسی جانے والی کاپیاں کتابیں جو وہ خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتی اور ساتھ ہی ساتھ انہیں کوستی ہوئی ذمہ دار ہونے کا درس بھی دیتی، یہی وقت وسیم اور ابا جان کے ناشتے کا بھی ہوتا کہ وسیم کو کام کے لئے نکلنا ہوتا تھا تو ابا جی کو بھی وقت پر دوا دینے کی فکر لگی رہتی، اگر کبھی وہ وسیم کے جلدی مچانے پر اسے پہلے ناشتہ لا کر دیتی تو الٹا ڈانٹ ہی کھانے کو ملتی۔

''تمہیں میں نے ہزار بار سمجھایا ہے کہ مجھے ابا جان سے پہلے کھانا نہیں کھانا، پہلے انہیں دیا کرو۔''

''مگر آپ کو تو جلدی نکلنا ہے، ابا جان گھر پر ہی ہیں۔'' وہ منمناتی۔

''ہاں ہاں بیٹا تم کھاؤ تمہیں جلدی ہے میں تھوڑی دیر تک کھا لوں گا، ابھی بھوک نہیں مجھے، یوں بھی بچوں نے تنگ کر رکھا ہے بے چاری اکیلی بچی کس کس کو سنبھالے؟'' ابا جان فوراً اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے۔

''مجھے کچھ نہیں پتہ ابا جان میں آپ سے پہلے نہیں کھاؤں گا کھانا بس۔'' وہ اپنے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر ان کے آگے رکھ دیتا تو اکبر خان بیٹے کے اس پیار پر نثار ہوتے ہوئے اس کا کندھا تھپکتے سب کو کہاں نصیب ہوتی ہے اتنی فرمانبردار اولاد، ابا جان کے بے حد اصرار پر وسیم کہتا۔

''تو پھر آپ بھی میرے ساتھ ہی کھائیے آج ہم باپ بیٹا ایک ہی برتن میں کھائیں گے۔'' مگر تب تک رضوانہ ابا جان کے ناشتے کی ٹرے سجائے پہنچ جاتی اور اکبر خان مسکراتے ہوئے بہت غیر محسوس انداز میں اپنی ٹرے الگ کر لیتے مبادا ان کی بیماری کے جراثیم ان کی اولاد میں بھی منتقل نہ ہو جائے، انہیں کیا خبر کہ ان کی بیماری جھوٹے برتنوں سے لگنے والی نہ تھی۔

ابا جان کو صبح کو دوا کھلا کر فارغ ہوئی تو خود ناشتہ کر کے کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگی، اس کے بعد صفائی کے لئے کمر کس لی، ابھی وہ فرش دھو کر وائپر لگا رہی تھی جب ابا جان کی گوبر اور مٹی کے نشان چھوڑتی ہوئی چپل کو دیکھ کر ٹھٹکی اپنی گھنٹہ بھر کی محنت پر پانی پھرتے دیکھ کر اس کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے، اگر ابا جی کی جگہ اس کا کوئی بچہ ہوتا یا کوئی اور تو وہ یقیناً اسے پیٹتی یا کم از کم الجھ تو ضرور ہی پڑتی مگر وہاں سامنے ابا جان تھے جو ابھی باہر سے لوٹے تھے اور گیلے فرش پر چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چیزوں کو تھام کر گرنے سے

بچنے کی سعی کرتے ہوئے اندر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ابا جان! آپ کے پاؤں......'' اپنے غصے کے برعکس وہ بولی تو صرف اتنا، ابا جان نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اپنے پیروں اور پھر جوتوں سے پیچھے رہ جانے والے نشانات کو دیکھا۔

''معاف کرنا بیٹا! میں گھر بیٹھے بیٹھے اوبھ گیا تھا تو ذرا گلی تک گیا مگر وہاں سنبھلتے سنبھلتے بھی پاؤں نالی میں جا پڑا۔'' وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی مشقت میں مبتلا اسے وضاحت دے رہے تھے، جیسے اپنی چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کا بہت بڑا جرم کیا ہو، وہ زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے مگر اب اندر جانے کی ہمت بھی نہ تھی کیونکہ اس طرح کمرے کی صفائی کا بھی ستیاناس ہو جاتا، رضوانہ کو غصے کے باوجود ان پر ترس آ گیا تھا اسی لئے چپ چاپ پائپ اٹھا لائی اور ان کے پاؤں دھلانے لگی۔

''اب باہر مت جائیے گا، چل کر اپنے بستر میں بیٹھیں۔'' اس نے پتہ نہیں پابندی لگائی تھی یا آرڈر؟ ابا جان خاموشی سے اندر کی طرف چل دیئے اور وہ دوبارہ سے سارا فرش دھونے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

اکبر خان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا، مین بازار پر ان کی اپنی پرچون کی دوکان تھی جسے محنت اور ایمانداری سے چلا کر انہوں نے اپنی پانچ اولادوں کو اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ پروان چڑھایا تھا اور اس میں ان سے زیادہ حصہ ان کی شریک حیات عفت بیگم کا تھا، جنہوں نے مردوں کی طرح ان کے شانہ بشانہ ہر کام اور ذمہ داری کو بطریق احسن سنبھال کر ان کی زندگی کی سختیوں کو آسانیوں اور دکھوں کو خوشیوں سے بدل دیا تھا، سب سے بڑی بیٹی وردہ نے میٹرک کیا وہ ایک ذہین طالبہ تھی اور اس کی مزید پڑھنے کی خواہش کو دیکھتے ہوئے اکبر خان نے اسے ایف اے کروایا لیکن اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دی، کیونکہ ایف اے کے دوران ہی انہوں نے ایک اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی منگنی اور پھر ایف اے کے بعد اس کی شادی بھی کر دی، وردہ کا سسرال زیادہ دور نہیں تھا تو زیادہ نزدیک بھی نہیں تھا، گھر داری میں الجھ کر اس کا میکے میں چکر کم سے کم ہوتا گیا، اس کے بعد سلیم بڑا ہوا تو ڈاکٹر بنانے کے بعد اکبر نے اس کا بھی بیاہ رچا دیا، لیکن وہ شادی کے ایک سال بعد ہی نظریں بدل گیا، بیگم اور سسرال میں سلیم ایسا مگن ہوا کہ اماں ابا کی فکر اور قدر گھٹتی چلی گئی، عفت بیگم اپنے جان سے پیارے بیٹے کو یوں بدلتے نہ دیکھ سکیں تو محض ایک ہی سال میں اسے الگ کر دیا، سلیم بھی گویا یہی چاہتا تھا سو بیوی کو لے کر الگ دنیا بسا بیٹھا، سلیم سے چھوٹا وسیم اتنا بھی چھوٹا نہ تھا کہ حالات کو سمجھ نہ پاتا وہ بھائی کی بے وفائی پر کڑھتے ہوئے خود سے عہد باندھتا رہا کہ وقت آنے پر چاہے کچھ ہو جائے لیکن وہ اپنے ماں باپ کو اس طرح اکیلا نہیں چھوڑے گا، کیونکہ سلیم کی جدائی پر اس نے کئی بار اماں اور ابا جان کو چپکے چپکے آنسو بہاتے دیکھا تھا، وسیم نے ٹرسٹ پلازہ میں اپنی کپڑے کی دوکان بنائی اور چند ہی سالوں میں اپنی محنت اور ماں باپ کی دعاؤں سے ایک چھوٹا کاروبار سیٹنڈ کر لیا، اس سے چھوٹا علیم تھا جو سلیم کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور اماں اب نے اس کی خواہش کے مطابق سلیم کی طرح اس پر بھی پیسہ لٹاتے ہوئے اسے ڈاکٹر بننے دیا، وقت آگے بڑھا تو اکبر خان اور عفت بیگم نے ایک بار پھر بڑے چاؤ اور چاہت سے اپنے دونوں بیٹوں کے گھر ایک

ساتھ آباد کیے، یوں رضوانہ اور زینت ایک ساتھ ان کے گھر کو رونق بخشنے آ پہنچیں، اکبر، عفت اور ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ساجدہ اپنی دونوں بہوؤں اور بھابھیوں کے ساتھ بہت خوش اور نازاں تھے، سلیم اور اس کی بیوی کے دیئے زخم بھرنے لگے تھے، زندگی خوشیاں سمیٹ لائی تھی لیکن وقت کا کام گزرنا ہے اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے، یہ وقت بھی گزر گیا اور محض پانچ سال بعد عفت بیگم اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں، اکبر خان کے لئے یہ زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا جس کا ازالہ ناممکن تھا، اس ناقابل تلافی نقصان نے اکبر خان سے جینے کی سکت ہی چھین لی مگر پھر بھی وہ اپنے ان دونوں بیٹوں کو اپنی بیساکھیاں اور اپنے مضبوط بازو بنا کر چلنے لگے گرے تو وہ تب جب علیم ان کا ساتھ چھوڑتے ہوئے ان کے آدھے جسم کو مفلوج کر گیا، علیم کے علیحدگی اختیار کر لینے کے بعد وسیم نے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے اپنی بھرپور محبت اور تعاون سے انہیں سنبھالنے کی کوشش تو بہت کی مگر سب کچھ اس کے اختیار میں کہاں تھا، تام اختیارات کی مالک اور صاحب قدرت اس ذات نے تو کچھ اور ہی رقم کیا تھا، پینسٹھ سال کی عمر میں انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا جسے بروقت علاج اور مکمل دیکھ بھال سے کنٹرول کر لیا گیا، لیکن اس اٹیک نے ان کی ہمت کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔

کچھ ہی عرصے میں وہ بہت ضعیف کمزور اور لاغر لگنے لگے تھے، وسیم نے ان کا کام چھڑوا کر انہیں گھر پر مکمل آرام کی تاکید کی اور ساجدہ سمیت پورے گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی تھی، ساجدہ بی اے کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ اکبر خان کے تمام کام بصد خوشی اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی، رضوانہ کا رویہ بھی اکبر کے ساتھ بہت اچھا تھا، وسیم کے بچے سارا دن دادا، دادا چہکتے ان کے آس پاس منڈلاتے تو اکبر خان کو زندگی کے دکھ بھولنے لگتے۔

برا وقت ایک بار پھر گزر چکا تھا، ساجدہ اور رضوانہ نے ابا جی کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، علیم، وردہ اور سلیم بھی اکثر بال بچوں سمیت ان سے ملنے چلے آتے گھر کی خوشیاں اور رونق لوٹ آئی تھی، ساجدہ نے ڈبل ماسٹرز کر لیا تھا اور وسیم چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو لیکن ساجدہ نے باپ کی گرتی ہوئی صحت بڑھتی ہوئی کمزوری اور ضعیف کے پیش نظر شادی سے انکار کر دیا، وہ کسی طور باپ کو ان حالات میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی، باپ کے ساتھ اس کی محبت اور انسیت میں کسی طور شک کی گنجائش نہ تھی لیکن بیٹیوں کو کوئی بھلا کب گھر بٹھا سکا ہے جو ساجدہ بیٹھی رہتی، ابا کے لاکھ سمجھانے وسیم کے تسلی دلانے اور رضوانہ کے یہ ذمہ داری بخوشی اٹھانے پر بالآخر اسے پیا کرتے ہی بنی، رضوانہ کا ابا جی کے ساتھ رویہ تسلی بخش تھا اور پھر وسیم کی بھی اکبر کے ساتھ اٹیچمنٹ سے وہ بخوبی آگاہ تھی، وسیم ساجدہ سے بھی کہیں بڑھ کے کیئرنگ تھا باپ کے معاملے میں اور پھر تھا بھی بیٹا جو بیٹی کی نسبت ان کی ضروریات کو زیادہ بہتر طور پر پوری کر سکتا تھا، چنانچہ اس طرح ساجدہ بے فکر ہو کر پیا گھر سدھاری اور اب وسیم بچوں اور ابا جی کی مشترکہ ذمہ داریوں نے رضوانہ بے چاری کو گھن چکر بنا ڈالا تھا، وہ سارا سارا دن بوکھلائی ہوئی یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں کام نمٹاتی مگر کام تھے کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتے، شروع شروع میں تو وہ گھبرا کر رونے بیٹھ

جاتی لیکن اب ایک سال ہونے کو تھا اور اس کی گھبراہٹ کبھی کبھار بیزاری اور تلخی میں ڈھل جاتی، جس کا ازالہ وہ تھوڑی دیر بعد احساس ہونے پر خود ہی کبھی ابا جان کے پیر دبا کر کبھی ان کے لئے اچھی سی چائے بنا کر تو کبھی ان کی پسندیدہ ڈش بنا کر کرتی، وسیم سے نہ کبھی ابا جان نے اس کی شکایت کی اور نہ کبھی اس نے ہی وسیم اور ابا جان کے درمیان آنے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

وہ بڑے دن کے بعد خوشگوار موڈ میں ٹی وی کے سامنے آ بیٹھی تھی، آج سنڈے تھا اور اس نے کل ہی تینوں بچوں یعنی ثوبان، فرمان اور لائبہ کو ویک اینڈ گزارنے کے لئے ان کی آنٹی کے گھر بھیجا تھا، کپڑے بھی اس نے کل شام ہی دھو لئے تھے تاکہ آج کا دن وہ آزادی اور مرضی سے گزر سکے، ابا جی کو وہ تھوڑی دیر پہلے دیکھ کر آئی تھی وہ دوائیوں کے زیر اثر سو رہے تھے، پچھلے تین سال سے وہ پارکنسوزم (رعشہ) بیماری کا شکار ہو چکے تھے، دو دن بدن مہنگے سے مہنگے علاج کے باوجود بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی، آج کل ڈاکٹرز ان کو جو نسخہ استعمال کروا رہے تھے اس میں اکثر میڈیسنز اعصاب اور دماغ کو پرسکون رکھنے کے لئے غنودگی والی اور نیند آور تھیں اس طرح رضوانہ اور وسیم بھی ابا جان کے ساتھ ساتھ کافی ریلیکس ہو گئے تھے، ٹی وی پر اس کی پسندیدہ مووی آ رہی تھی وہ بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی جب اچانک اسے دھڑام کی آواز سنائی دی، وہ چونک کر سیدھی ہوئی سب سے پہلا ذہن میں آنے والا خیال ابا جان کا تھا وہ سرپٹ ان کے کمرے کی طرف دوڑی۔

''ابا جی!'' کمرے میں پہنچ کر اس نے پکارا تو اسے ابا جان کی ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں، اس نے دیکھا ابا جان واش روم کے دروازے میں گھٹنوں کے بل گرے تھے اور اب بے آواز روتے ہوئے اٹھنے کی لاحاصل سعی میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔

''ابا جی! آپ ٹھیک تو ہیں؟ کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟'' وہ سرعت سے ان کے پاس پہنچی۔

ابا جی نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ ان کے بے بسی سے بہتے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی، ابا جان کو اس طرح بے چارگی میں روتا دیکھ کر رضوانہ کی بھی آنکھیں ڈبڈبا گئیں وہ انہیں کندھوں اور بازوؤں سے تھام کر اٹھنے میں مدد دیتی بمشکل چارپائی تک لائی تھی۔

''آپ نے مجھے بلایا ہوتا ابا جی، آپ اس طرح اکیلے کیوں گئے؟'' وہ کہہ کر آنسو صاف کرنے لگی۔

''بیٹا اور کتنا بوجھ ڈالوں میں تم پر، پہلے ہی تم گھر بھر کی ذمہ داریاں نبھاتی تھک جاتی ہو مزید میں......'' وہ اب بھی بہو کے سامنے نادم سے رو رہے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ابا جی! اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ کیوں بوجھ بننے لگے ہم پر۔'' وہ ان کی چارپائی پر ہی بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگی، ابا جان نے اپنا نحیف اور کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر شفقت سے رکھا۔

''جیتی رہو میری بچی، اللہ تمہیں دونوں جہان میں سکھی رکھے۔'' وہ بے اختیار اسے دعائیں دینے لگے، ساتھ ہی ساجدہ کا عکس بھی ذہن میں جھلملایا، تو آنکھیں پھر سے ساون برسانے لگیں۔

☆☆☆

ساجدہ، وردہ، سلیم اور علیم کی فیملی سمیت جس جس کو بھی اکبر خان کی چوٹ اور علالت کا

پتہ چلا تھا وہ ان کی عیادت اور بیمار پرسی کو ضرور آیا، ابا جان کے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی مگر صد شکر کہ ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی، گھر میں آنے والے مہمانوں کا ایک تانتا سا بندھ گیا تھا، دھان پان سی رضوانہ کی سپیڈ میں کئی گنا اضافہ ہو گیا مگر اسے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کس کو اور کس طور سنبھالے، ایسے میں جب کہ سب موجود ہوتے اس کے ابا جان کی چارپائی کے گرد پھیروں کی تعداد لاشعوری طور پر بڑھنے لگتی، نجانے وہ دنیا کی باتوں سے ڈرتی تھی یا دوسرے کاموں میں الجھ کر ابا سے غفلت نہ برتنا چاہتی تھی، اسی لئے کبھی چائے، کبھی جوس کبھی پھل تو کبھی سوپ لئے آن موجود ہوتی، ابا جان بھی سب کی موجودگی میں اس کی خدمت گزاری پر دل کھول کر اس کی تعریفیں کرتے۔

''بہت نیک اور سعادت مند بچی ہے، بہت خیال رکھتی ہے میرا۔'' وہ مسکرا کر کہتے تو دوپٹے سے پسینہ صاف کرتی ہوئی رضوانہ بھی مسکرا دیتی، جبکہ دیورانی جیٹھانی پہلو ہو لے سے بدل کر رہ جاتیں، دھیرے دھیرے روٹین معمول پر آتی گئی یہاں تک کہ ساجدہ بھی پندرہ دن بعد ابا کی طبیعت سنبھلنے پر واپس اپنے سسرال پہنچ گئی، جب تک وہ یہاں رہی رضوانہ کا ہاتھ بٹاتی اور دلجمعی سے ابا کی خدمت کرتی رہی مگر اب اس کے جانے کے بعد مسائل پھر سر اٹھائے کھڑے ہو گئے، بچے اور ان کی پڑھائی فراموش ہونے لگی تو اس نے گھر میں ہوم ورک کروانے کی بجائے بچوں کو ٹیوشن رکھوا دی، مزید چند ماہ گزر گئے، وہ اور ابا کی طبیعت دونوں ہی قدرے نارمل ہو چکے تھے مگر خدا جانے یہ ابا کی بیماری کا اثر تھا یا انہیں دی جانے والی ہیوی میڈیسنز کا کہ ان کا حافظہ نہایت ہی کمزور ہو گیا تھا، وہ ایک ہی بات سات آٹھ بار پوچھتے لیکن پھر بھی بھول جاتے یہاں تک کہ انہیں اپنا کھانا پینا اور نماز تک بھولنے لگی تھی، ایک دن تو حد ہی ہو گئی، اماں کا فون آیا تھا میکے سے اور اس پندرہ منٹ کی کال کے دوران ابا جی نے سینکڑوں بار اسے ڈسٹرب کیا تھا۔

''وسیم کا فون ہے کیا؟ کس کا فون ہے؟ وسیم ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ دروازے اچھی طرح لاک کر لو بہو، وقت کیا ہو گیا مجھے ابھی نماز پڑھنی ہے۔'' حالانکہ وہ نماز پڑھ چکے تھے، عشاء کی، رضوانہ ان کی باتوں کے آدھے ادھورے جواب دیتی موبائل لے کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی، لیکن پھر بھی ان کے سوالات اور مسلسل بڑبڑاہٹ ختم نہ ہوئی تو تنگ آ کر رضوانہ نے فون ہی بند کر دیا۔

''ابا جی وسیم کسی کام کے سلسلے میں لیٹ ہو گئے ہیں بتایا تو تھا آپ کو۔'' وہ ان کے پھر سے دہرانے پر عاجز آ گئی۔

''اور دروازے کرلوں گی میں خود ہی لاک آپ کو بڑے بڑے ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں مجھے بھی فکر ہے گھر کی۔'' اس کے الفاظ سے زیادہ اس کا لہجہ تلخ اور سنگین تھا، یکدم ہی اس پر جھلاہٹ سوار ہوئی تھی اور وہ کنٹرول کرتے کرتے بھی کہہ گئی ابا جان چپ چاپ اسے دیکھتے رہ گئے جبکہ وہ منہ پھیر کر فرمان کی طرف متوجہ ہو چکی تھی جو لاؤنج میں گیند بیٹ کھیل رہا تھا۔

''کمینے ابھی ٹی وی توڑ دے گا گیند سے، یہ کوئی جگہ اور وقت ہے بال کھیلنے کا، رکھو اسے اور سو چل کر صبح سکول کے لئے اٹھتے نہیں بدتمیز نالائق۔'' وہ اماں سے بات نہ ہو سکنے کا غصہ بچوں پر انڈیلتی انہیں کمرے میں لے گئی، بیزاری اور اکتاہٹ کا یہ ایک اور شدید دورہ تھا جو اسے پڑا۔

☆☆☆

''ہائے رضوانہ تم کیسے اس طرح ہر وقت کاموں میں جتی رہتی ہو؟ اپنی رنگت دیکھو ذرا کیسے سرسوں کی مانند پیلی ہو رہی ہے اور صحت بھی کتنی دبلی ہوگئی ہے کچھ ہی عرصے میں، ذرا تو خیال کرو اپنی صحت کا۔'' عاصمہ بھابھی اپنی نند کی حالت دیکھ کر ماتھا پیٹنے لگیں۔

''بس بھابھی کیا کروں تین تین بچوں اور سسر سمیت گھر بھر کی ذمہ داری مجھ پر ہی جو ٹھہری۔'' رضوانہ نے ہلکا سا مسکرا کر توجیہہ پیش کی۔

''ارے تو کیا ایسے ہی صحت گنوا دو گی اپنی عمر دیکھو اور حالت دیکھو، تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ایسی الہڑ غیر ذمہ دار اور فیشنل ایبل و ماڈرن ہوتی ہیں پینتیس، چالیس سال کی عورتیں بھی اپنی کیئر کی وجہ سے اپنی عمر سے تین گناہ چھوٹی نظر آتی ہیں اور ایک تم ہو کہ ابھی سے دادی ماں لگنے لگی ہو، بھئی بچوں کی ذمہ داری تو مانا کہ پیرنٹس کی ہی ہوتی ہے مگر یہ سسر صاحب والی سر درد تم نے الگ ہی پال رکھی ہے، تمہاری نندیں، دیورانیاں، جیٹھانیاں بھی تو ہیں ناں وہ کیوں نہیں سنبھال لیتیں ان بڑے میاں کو؟'' عاصمہ بھابھی اس سے ملنے اور خیر خیریت دریافت کرنے آئی تھیں مگر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس کی صحت اور سسر سے جان چھڑوانے کی پالیسی پر لیکچر دینا ہرگز نہ بھولی تھیں۔

عاصمہ بھابھی سے ملنے کے بعد ہر بار رضوانہ کے دل پر ان کی باتوں کا بڑا بوجھ سا آن پڑتا تھا، وہ پہروں اداسی اور خود ترسی کا شکار رہتی مگر پھر سر جھٹک کر ساری سوچیں بھلاتی اور اپنے کام میں مگن ہو جاتی لیکن اس بار وہ ایسا نہیں کر پائی تھی، آخر ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں عاصمہ بھابھی، ایک عرصے سے اس نے اپنی ذات کو پس پشت ڈال رکھا تھا، شوہر، بچوں، سسر اور سسرال والوں کے چکر میں اس کی اپنی ذات گھن چکر بن کر رہ گئی تھی، دوست، کتابیں، ٹی وی، ناولز اور دوسری بے شمار ایکٹوٹیز میں کھوئی رہنے والی رضوانہ خود سے بھی بیگانہ لگنے لگی تھی۔

''عجیب ہو تم بھی یار شادیاں تو سبھی لڑکیوں کی ہوتی ہیں مگر کوئی یوں تمہاری طرح غائب نہیں ہوتی، سسر صاحب اتنے ہی بیمار ہیں تو انہیں ہاسپٹل بھیج دوناں یا پھر ایک کل وقتی نرس رکھ لو جو ہمہ وقت ان کا خیال رکھے کم از کم تمہاری تو جان چھوٹ جائے گی، اس جھنجھٹ سے، بیکار میں ٹینشن بنا رکھی ہے تم نے اپنے لئے۔'' رضوانہ ابھی تک بھابھی کی باتوں کے اثر سے آزاد نہ ہو پائی تھی اسی لئے گھبرا کر پہلے والی رضوانہ بننے کی کوشش میں اپنی پرانی دوست عبرینہ کو فون کر ڈالا اور اب عبرینہ سے بھی ایک لمبا لیکچر سننے کے بعد ہمت جواب دینے لگی تھی۔

''مجھے دیکھو میرے ساس سسر بھی تو بوڑھے ہیں اور میرے میاں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں، جب میری شادی ہوئی تو سب نے کہا کہ اب اماں ابا کو سنبھالنے کی ذمہ داری چھوٹے بہو بیٹے کی ہے مگر میں نے تو اسی وقت اشعر (شوہر) کو کہہ دیا کہ بھئی مجھ سے نہیں ہوتے یہ سب چونچلے اور نہ میں سنبھال سکتی ہوں انہیں، ان کے چکروں میں اپنی ہیپی میرڈ لائف کا ستیاناس ہو جاتا ہے، بس تب سے فیصلہ ہوا کہ اماں ابا ایک ایک ماہ اپنے چاروں بیٹوں کے گھر رہا کریں گے، بڑے بیٹوں کا بھی تو فرض ہے ناں آخر؟ ویسے بھی میں تو جاب کیری کرتی ہوں تم یقین کرو رضوانہ جب ساس سسر ادھر آتے ہیں میرے پاس تو اپنی روٹین کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے، ان کے جانے کے بعد ہی سکھ کا سانس لیتی

ہوں، تم یہ مسلسل اریٹیشن کیسے برداشت کر لیتی ہو؟'' عبرینہ کے بعد نورین نے بھی کچھ ایسی ہی باتیں اور احوال سنایا تو بالآخر رضوانہ نے ان کے اکسانے پر فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ وسیم سے بات کرے گی کہ ابا کی حالت اور رضوانہ کی سہولت کے پیش نظر یا تو اپنے بھائیوں سے بات کرے کہ وہ ابا کو سنبھالنے کی اس مشکل ذمہ داری میں ان کی مدد کروائیں یا پھر وہ ایک کل وقتی ملازمہ ابا کے لئے ارینج کر لے، لیکن وسیم نے جب بھائیوں سے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی ملازمہ کا انتظام نہیں ہو سکتا تو رضوانہ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا، وسیم سے ہونے والی منہ ماری کے بعد وہ بچوں سمیت کچھ دن کے لئے اپنے میکے میں چلی آئی یہ ناراضگی کا اظہار بھی تھا اور اس طرح اسے سوچ بچار کا اچھا موقع بھی فراہم ہوتا وہ ماں کے سامنے اپنے سارے دکھڑے سنا کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی، رضوانہ کو میکے آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ ساجدہ کے سسر کے انتقال کی خبر مل گئی۔

''بھابھی میرے سر سے دست شفقت اور سایہ رحمت اٹھ گیا، میرے ابا کے دعاؤں کے لئے اٹھنے والے ہاتھ جو میری ہر مصیبت اور آفت کو ٹال دیا کرتے تھے اب نہیں رہے بھابھی۔'' ساجدہ، رضوانہ کے گلے لگی کچھ اس طرح بلک بلک کر روئی کہ جیسے اس کے سسر کا نہیں سگے باپ کا انتقال ہوا ہو، اس کی درد بھری باتیں اور تڑپ دیکھ کر نہ صرف رضوانہ بلکہ وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں، ساجدہ کی دو نندیں، دو دیور اور ایک جیٹھ تھا مگر ساس سسر کی ذمہ داری خود اس نے اپنے سر لے رکھی تھی، آج تک ساجدہ کے سسرال سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ملی اور نہ ہی کبھی ساجدہ کے منہ سے کوئی گلہ سنا، اب بھی وہ اپنی ضعیف العمر ساس کو جن کی آنکھوں کی بینائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، اپنے ہاتھوں سے کھانے کے چھوٹے چھوٹے لقمے کھلا رہی تھی، وہ مسلسل انکار پر اڑی تھیں لیکن ساجدہ جانتی تھی کہ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا، وہ پہلے ہی اتنی کمزور اور ضعیف تھیں کہ چند دن کی بھوک ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی اس لئے بڑے پیار اور بچوں کی طرح لاڈ سے سمجھا بجھا کر انہیں کھانے کے لئے راضی کر رہی تھی، ساس بہو کا ایسا پیار دیکھ کر جہاں بہت سے لوگوں کو رشک آیا تھا وہیں کچھ عورتیں اسے ڈرامے بازی اور دنیا دکھاوا کہہ کر ناک بھوں بھی چڑھا رہی تھیں، لیکن رضوانہ جانتی تھی کہ یہ دنیا دکھاوا نہیں تھا، بلکہ ساجدہ کو بزرگوں سے انسیت، ہمدردی اور محبت ہی ایسی تھی۔

''ارے ساجدہ بڑے میاں اپنی زندگی کی ساری خوشیاں سمیٹ چکے تھے اب بڑھاپے میں تو نرے دکھ ہی دکھ رہ جاتے ہیں اچھا ہوا کہ اللہ نے انہیں پردہ نصیب کر دیا، ورنہ تو سنبھالنے والے بھی تنگ آ جاتے ہیں، چلو آزمائش ختم ہوئی تمہاری اور ان کی بھی، اب تم اپنا اور اپنے بچوں کا خیال رکھنا۔'' یہ ساجدہ کی کوئی دوست یا ہمسائی تھی شاید جو اس سے ہمدردی دکھانا چاہ رہی تھی۔

''جب تک والدین سلامت رہیں بچوں کو کچھ نہیں ہو سکتا ثریا ہماری خوشیوں کی سلامتی ہمارے بزرگوں کی دعاؤں سے گہرا تعلق رکھتی ہے جب تک ان کے دل اور زبان سے دعائیں نکلتی رہیں میں نہیں مانتی کہ ہمیں کوئی آنچ آ سکتی ہے، تم بھی اپنے بزرگوں کی صحت و سلامتی کے لئے دعا اور ان کی خدمت کر کے دیکھنا گھر کے ساتھ ساتھ دل میں بھی سکون بھر جائے گا۔''

ساجدہ کے جواب نے جہاں اس عورت کو چپ کروا دیا تھا وہیں رضوانہ کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

''یار یہاں تو الٹی آنتیں گلے پڑ گئی ہیں، میں کیا کروں اب؟ ہاں ہاں وہی میری نند صاحبہ آج پانچواں دن ہے بال بچوں سمیت آ کے یہاں بیٹھ رہی ہے، میں نے ہمدردی کے دو بول کیا بول دیئے وہ مہارانی تو گھر کا رستہ ہی بھول گئیں، پہلے ہی اس کے ماں باپ کا وبال کیا کم تھا جو اب یہ مصیبت بھی گلے کو آ گئی، ساس سسر کو سنبھالوں یا اسے اور اس کے بچوں کو؟ حد ہی ہو گئی بھئی۔'' رضوانہ کچن سمیٹنے کے بعد عاصمہ بھابھی کے کمرے میں چائے دینے گئی مگر وہ کسی سے فون پر محو گفتگو تھیں، پشت دروازے کی طرف ہونے کی وجہ سے دیکھ ہی نہ پائیں، جب رضوانہ اپنے گھر سے آئی تھی تو ارادہ مضبوط کر کے آئی تھی کہ جب تک وسیم اس کی بات مان نہیں جاتا تب تک وہ واپس جائے گی نہیں لیکن ساجدہ سے ملاقات کے بعد وہ عجیب شش و پنج میں گھری اپنے محاسبے اور موازنے میں الجھی تھی، اسی الجھن میں مزید دو دن گزر گئے اور آج عاصمہ بھابھی کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں چبھتی بے چینی اضطراب اور الجھن کی آخری کیل بھی کھینچ نکالی تھی، گتھیاں سلجھ گئی تھیں اسے بے ساختہ ساجدہ کی بہت پہلے کہی جانے والی بات یاد آئی جو وہ اکثر سب سے کہتی تھی۔

''جب تک ہم دوسروں کے والدین کا احترام اور احساس نہیں کرتے ہم یہ امید کیسے کر سکتے ہیں کہ کوئی ہمارے والدین کا احترام یا احساس کرے گا۔''

دو آنسو لڑھک کر زمین بوس ہوئے اور وہ چپ چاپ واپسی کے لئے چل دی، ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی کہ تلافی ممکن نہ ہوتی، وہ بر وقت اپنی جنت میں لوٹ آئی تھی جہاں اس کے اپنوں سمیت ہزاروں خوشیاں اس کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

سدرۃ المنتہیٰ

چھبیسویں قسط کا خلاصہ

امرت کو فرید کے سوال نے پریشان کیا ہوا ہے۔
امرکلہ سے ماں شادی کی بات کرتی ہے وہ ٹال دیتی ہے۔
جیل میں موت کی بات ہوتے بات بدل جاتی ہے، چار قیدی اپنی اپنی ترنگ میں، جن میں ایک امرکلہ کا باپ ہے جو اب تک ٹافیاں بانٹتا ہے، اس کے نام پہ، امرکلہ فرید حسین کے ساتھ گھر آتی ہے۔
نواز حسین کا رشتہ لے کر اور فرید فاطمہ کو مٹھائی کھلاتا ہے۔
فنکار کو گاؤں والے منانے آتے ہیں کہ گدی نشین بن جاؤ۔
امرت فنکار کو بہت سناتی ہے، ھالار کے لئے، ھالی ناامید ہو کر لوٹ جاتا ہے، امرت دروازے کے پیچھے کھڑی ساری کاروائی سننے کے لئے رکتے ہوئے ھالی کو رستے میں رک کر انتظار کرنے کا ٹیکسٹ کرتے ہوئے سوچتی ہے سب ہاتھ سے گیا۔

ستائیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیئے

''ہم پہلی بار تم سے کچھ مانگنے آئے ہیں عبدالحادی۔''
لوگ فنکار کو گھیرے ہوئے تھے۔
امرت کے اندر خوف کی کئی لہریں ایک بار میں اٹھی تھیں اور معدوم نہ ہوئیں، ہلکورے لینے لگیں۔
وہ بن دیکھے محسوس کرسکتی تھی کہ یہی خوف ان کے چہرے پر پرچھائیں بن گیا ہوگا۔
''ہم پہلی بار تم سے کچھ مانگنے آئے ہیں۔'' کتنی تقرار تھی، وہ کئی لہجے تھے، کئی آوازیں اور اس کا باپ ایک۔
کتنا عجیب ہے کسی کو باپ کی طرح سوچنا جب عادت نہ ہو مگر ہمدردی بڑھ جاتی تھی، دباؤ بڑھنے لگتا ہے۔
''ہمیں یقین ہے تم انکار نہیں کرو گے۔'' وہ لفظوں کو بندوق کی گولیوں سے بھر کے لائے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ ہمیں یقین ہے کہ تم مرنا پسند کرو گے۔
''ہم ویسے ہی تمہیں مار کر دم لیں گے اس سے بہتر ہے کہ تم خود سر دے دو۔'' یہ اچھا طریقہ تھا، اسے غصہ آنے لگا۔
''یہ گوہر اندر کھڑا کیا کررہا ہے، چپ کی دیوار بنا ہوا ہے۔'' اس نے گوہر کو یہی ٹیکسٹ کیا۔
''ہمارے گوٹھ والے مجھے قتل کردیں گے۔'' آگے ایموشن سا ئی تھی، جس جواب سے غصہ مزید بڑھ گیا تھا۔
''وہ انہیں ایموشنل بلیک میل کررہے ہیں گوہر۔''
''میں جانتا ہوں۔''
''تو پھر بولو۔''
''بنتا نہیں ہے، انہیں خود فیصلہ لینے دو امرت۔''
''وہ الجھے ہوئے ہیں گوہر۔''
''نہیں، وہ فیصلہ کریں گے امرت، تم انتظار کرو۔'' وہ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔
''تم سالوں بعد لوٹے ہو، تمہیں ہم اپناتے ہیں۔''
''لاھوت جوان ہے۔'' ان کے منہ سے کوئی تو آواز نکلی۔
''وہ باغی ہے، اس کا دماغ خراب ہے۔''
''میں بھی باغی تھا اور میرا بھی دماغ خراب تھا۔''
''یہ کمزور سا احتجاج۔''
گوہر کا میسج آیا۔
''دیکھو وہ اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں، زیادہ اچھا کریں گے۔''
''جو اپنی زبان رکھتا ہو، اسے کسی اور کی ضرورت نہیں ہوتی۔''
''ہونی بھی نہیں چاہیے۔''
''ہم تمہیں معاف کررہے ہیں، تم لوٹ آئے ہو۔''

''میں لوٹا نہیں ہوں، میں بس آ گیا ہوں۔''

''مگر تم آ گئے ہو تو ہمیں قبول ہو، اپنی گدی اپنے کام سنبھالو، اپنے فرائض پورے کرو، ازالہ کر دو، اپنی غلطیوں کا، تم لوٹائے گئے ہو۔''

''مجھے معاف مت کرو، مجھے سزا دو، پتھر مار کر نکال دو۔''

''ٹھیک ہے ہم تمہیں سزا دے رہے ہیں، تمہیں یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں، تم قبول کرو۔'' امرت کو تاؤ آ گیا۔

''یہ اپنی منوا کر چھوڑیں گے۔'' اس نے لاھوت کو سائیڈ پر ہو کر کال کی۔

''کہاں ہو؟''

''یہیں کھڑا ہوں، تم کہاں ہو؟''

''میں بھی یہیں کھڑی ہوں، باہر آؤ۔''

وہ دو منٹ میں باہر تھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے یہاں کھڑی ہو، نکلو یہاں سے جلدی۔'' دبی دبی آواز میں اسے ڈپٹا۔

''مجھے چھوڑو، تم اپنا کام کرو لاھوت، تم یہ سیٹ لے لو، ان کو کہو کہ میں بن جاتا ہوں گدی نشین۔''

''تم نے اسی بے کار بحث کے لئے مجھے بلایا ہے۔'' وہ جھلا کر چلا گیا۔

''لاھوت پلیز، میرے باپ کو بچا لو۔'' اس نے ایک میسج کئی بار کر دیا، وہ تقرار سے گھبرا گیا۔

''وہ اہل ہیں، بڑے ہیں، امرت وہ یہاں رکنا چاہتے ہیں، تم سمجھو۔''

''تو پھر تم چلو اوطاق میں، تمہاری ہمیں ضرورت ہے۔''

''ھالی تم کہاں پہنچے؟'' اس نے فوراً اسے سرچ کیا۔

''مین روڈ کے پاس تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''تب تک کرو گے جب تک میں نہ پہنچوں؟''

''ہمیشہ کروں گا۔''

وہ فی الحال اس پہ غور نہیں کرنا چاہ رہی تھی، اس لئے شکریہ لکھ دیا تھا۔

''تو پھر چلو۔'' تقرار بڑھی۔

''کسی نے کہا یہیں پگ پہنا دیتے ہیں، لاھوت کیا تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' اس نے پھر سے اک کوشش کی۔

''جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے۔''

''تم بزدل ہو لاھوت۔''

''باغی کبھی بزدل نہیں ہوتا۔''

''تم بھگوڑے ہو، ذمہ داری سے بھاگ رہے ہو، اپنی ذمہ داری میرے بوڑھے باپ پر ڈال رہے ہو۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' اسے لاھوت کا جواب آگ لگا گیا۔
''گوہر کچھ کہو، مجھے تم سے یہ امید نہیں ہے۔''
''ان کو فیصلہ خود کرنے دیں، ان کو وقت دیں آپ۔'' امرت کا میسج پڑھنے کے بعد وہ بولا تھا۔
''تم چپ رہو لڑکے، ہمارے خاندانی مسائل میں بولنے کا تمہیں اختیار نہیں ہے۔''
''یہ یہاں کیوں کھڑا ہے، اسے باہر نکالو فوراً۔''
''یہ ہمارا مہمان ہے۔'' لاھوت پہلی بار بولا۔
''اسے کوئی باہر نہیں نکالے گا۔'' فنکار کا کمزور سا احتجاج تھا، گوہر خود ہی باہر نکل گیا۔
''میں وہاں کھڑا ہو کر تماش بین ہی لگ رہا تھا۔'' وہ امرت کے پاس آ کھڑا ہوا۔
''اور یہاں کھڑے ہو کر بھی تم تماشہ ہی سنو گے۔''
''جو تم کرو گی وہیں کروں گا، لاھوت کو ٹیکسٹ کریں۔'' وہ اتنا ہلکا کیوں لے رہا تھا۔
یہ تو حقیقت تھی کہ اس کی وہاں کسی نے نہیں سننی کہنا بیکار تھا۔
''ہم تمہیں تلافی کا موقع دے رہے ہیں، اپنے بڑوں کے سامنے سرخرو ہونے کا۔''
''اور تم خود جانتے ہو کہ تمہیں چنا گیا ہے، بتاؤ کیا تمہیں نہیں چنا گیا، یا اب تمہاری باری نہیں ہے ان فرائض کو نبھانے کی؟ بولو۔''
''کیا اس خاندان حسب نسب کو ہم نے زندگی نہیں دیں؟ اور کیا ہمیں اس سے نام عزت مرتبہ نہیں ملا؟''
''میں کبھی نام پر نہیں مرا۔'' پھر سے کھوکھلا احتجاج، نہ اقرار نہ انکار۔
''جھوٹ نہ بولو، تمہیں نام ہی چاہیے تھا، تمہیں نام بنانے کی خواہش تھی، یہاں ہر کوئی نام پر مرتا ہے، نام سے پہچانا جاتا ہے، نام کے لئے جیتا ہے اور مرنے کے بعد بھی اپنا نام چھوڑ جاتا ہے۔'' وہ سرخ ٹوپی والا نکی شکل کا چالاک آدمی تھا، رشتے میں پھپھی زاد لگتا تھا، ساتھ بیٹھ گیا۔
''تمہیں فیض ملا ہے، تمہارے ہاتھ میں شفا دی گئی ہے۔''
''دیکھو ڈاکٹر بھی تو یہی کام کرتے ہیں۔''
''تمہیں ایک بار پھر یہ موقع ملا ہے، تم دوبارہ یہ غلطی نہیں کرو گے۔'' کندھے کے گرد بازو پھیلا لیا تھا، فنکار ڈھیلا پڑ گیا۔
''میں ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔''
''تم ذمہ داری اٹھانے کے ہی قابل ہو اور تم ہی ہو ہمارے خاندان کے آخری بزرگ۔''
امرت کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔
''امرت وہ خود یہاں رکنا چاہتے ہیں، یہ لوگ بھی کچھ غلط نہیں کہہ رہے۔'' گوہر لاھوت کی زبان بول رہا تھا جو پچاس فیصد درست تھی۔
''اسے پگ پہناؤ۔'' فنکار کانپ رہا تھا۔
دروازہ دھڑم سے کھلا وہ آدھا چہرہ ڈھانپے چادر میں قید اندر آئی۔

''میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔''
''تم کون ہولڑکی۔'' سرخ ٹوپی والا اٹھا چہرے پہ جلال تھا۔
''یہاں تو جو بھی چاہے منہ اٹھا کر آ جاتا ہے۔'' دوسرا بڑبڑایا۔
''میں بھی اسی خاندان کا حصہ ہوں، مجھے آپ باہر نہیں نکال سکتے۔''
''امرت باہر جاؤ۔'' لاھوت نے اسے ٹوکا۔
''میں تمہارے منہ لگنے نہیں آئی، ہم گھر پہ بات کریں گے، یہاں کوئی اپنا فیصلہ سنا کر انہیں پگ نہیں پہنا سکتا۔''
''ہم عورتوں سے بحث نہیں کرتے، تم اندر جاؤ، گھر لے جاؤ انہیں لاھوت۔'' وہ آگے بڑھا۔
''جن پیروں سے چل کر آئی ہوں، ان پہ خود جا سکتی ہوں۔'' وہ ان کی طرف بڑھی۔
''چلیں آپ میرے ساتھ۔''
''خاتون آپ گھر جائیں، یہاں پورا خاندان کھڑا ہے، ہماری عورتیں عزت دار ہیں، وہ گھروں میں رہتی ہیں، ایسے دندناتی نہیں پھرتیں۔'' اعتراض پہ اعتراض تھا، گوہر بھی اندر آیا۔
''امرت باہر چلو۔'' دبے لفظوں میں کہا، اسے اندازہ تھا امرت ٹلے گی نہیں اور یہ لوگ بدمزگی پر اتر آئیں گے۔
''ہم انہیں لے کر جا رہے ہیں۔'' وہ باپ کے پاس کھڑی تھی، ان کا ہاتھ تھاما، پہلی بار تھاما تھا، وہ نم ہو گئے۔
''یہ یہاں رکنا چاہتا ہے بچی، مردوں کے معاملات میں تم مت آؤ، چلو ہم عزت سے تمہیں گھر چھوڑ دیتے ہیں، میں رشتے میں تمہارا چاچا لگتا ہوں۔'' باقی سارے بپھرے تھے، وہ سرخ ٹوپی والا بات کر رہا تھا۔
''ہم اسے زنجیر نہیں پہنا رہے، عزت دے رہے ہیں۔''
''یہ زنجیر ہی ہے۔''
''پگ عزت ہوتی ہے۔''
''آپ لوگوں کی پہنائی ہوئی زنجیر میں بدل جاتی ہے۔''
''امرت بڑوں سے تمیز سے بات کرو۔'' لاھوت بولا۔
''تم مجھے تمیز مت سکھاؤ۔''
''گھر کے مردوں کو اس طرح نہیں ٹوکتے بچے، چلو شاباش گھر چلو۔'' سرخ ٹوپی والا اس تک آیا، سر پہ تھپکی دی۔
''چلو بچے۔''
''بہت شکریہ چاچا جی، میں یہاں سے جانے کے لئے آئی ہوں۔''
''آپ چلیں۔'' وہ انہیں ابا کہنا چاہتی تھی۔
''اپنی بیٹی کو کہو وہ جائے، سارے مرد دیکھ رہے ہیں، اس کا یہاں کھڑے ہونا نامناسب ہے۔'' کسی نے آہستگی سے جھک کر اسے کہا۔

''تم جاؤ بیٹا۔'' وہ یہی تھی جو کچھ دیر پہلے کھڑی اسی جگہ لڑ رہی تھی، انہیں برا بھلا کہہ رہی تھی اور ابھی اس نے ان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' یہ کیسا جملہ تھا، وہ اس کے بعد کچھ کہہ نہ سکے۔

''اچھا ٹھیک ہے، پگ پہناؤ، تم لوگ رسم کرو، بچی یہیں رکی رہے گی۔''

''بیٹا تم بیٹھ جاؤ سائیڈ میں۔'' چاچے نے رستہ نکالا۔

''پگ لاھوت کو پہنایئے جو حقدار ہے، وہ جوان ہے ساری ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے۔''

''ان کی عمر نہیں ہے۔''

''یہ کھیتوں میں ہل نہیں چلا رہے یہاں۔'' کسی نے خفت سے ٹوکا۔

''تمہاری بیٹی مردوں کے منہ لگ رہی ہے حادی اسے کہو چپ رہے۔''

''امرت چپ ہو جاؤ۔'' بے بسی کتی عجیب چیز ہے، ڈوب مرنے کے قابل کر کے چھوڑتی ہے۔

''چپ رہنے کے لئے میں یہاں نہیں کھڑی، آپ چلیں میرے ساتھ۔''

''میں ان کو ناراض نہیں کر سکتا۔'' ٹوٹی پھوٹی آواز۔

''مجھ پہ اپنے خاندان کا بہت قرضہ ہے، بہت مقروض ہوں میں ان کا، قرض بہت چڑھ گیا ہے، اتارنے دو۔''

''میرا بھی آپ پہ بہت قرض ہے۔''

''میں مانتا ہوں بیٹا، پہلے ان کا ہے، پھر تمہارا۔''

''آپ کو پتہ ہے آپ کے لئے مشکل ہو جائے گی۔''

''ان کے لئے کوئی مشکل ہو گی لڑکی، یہ راضی ہیں، آپ خاموش رہیں۔'' سارے کھڑے تھے، گھیرا تنگ تھا۔

''انہیں کہو کونے میں کھڑی ہو جائیں۔'' کونے میں دو نو جوانوں نے دل ہی دل میں کچھ ارادے کر لئے تھے۔

سرخ ٹوپی والے نے اسے دل ہی دل میں بہو تسلیم کر لیا تھا۔

''اسے کنٹرول میں رکھنے کا سب سے بڑا طریقہ بیٹے۔'' انہوں نے امرت کی طرف التجائی نظر کی، اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا۔

''میری ماں۔''

''بیٹی کو عزت دی جاتی ہے تو اسے ماں کہا جاتا ہے۔'' وہ اسے ماں کہہ رہے تھے، کمزور کر رہے تھے، وہ پہلی بار ابا کہنا چاہتی تھی، کہہ نہ سکی۔

''آپ ایک بار پھر مجھے اپنی زندگی سے نکال رہے ہیں۔'' ایک کمزور سی کوشش۔

''میں تمہاری زندگی میں شامل ہوں۔''

''آپ میری زندگی سے نکل رہے ہیں پھر سے۔''

''میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔''

''یہ ہمیں نہیں لوٹا سکتا، وہی نام کا چاچا۔'' امرت نے ہاتھ چھوڑ دیا، حالانکہ وہ اس ہاتھ کو تھام کر رکھنا چاہتے تھے۔

''آپ میری زندگی سے نکل چکے ہیں۔'' اسے لگا جیسے پتھر پے در پے اس پہ برس رہے ہیں، گوہر اس کے پیچھے لپکا تھا، لاہوت نے ٹھنڈی سانس بھری تھی، رسم شروع ہوگئی۔

وہ گوہر کے ساتھ پوری خاموشی کے ساتھ بائیک پر مین روڈ تک آئی تھی، گوہر کو اندازہ تھا وہ ایک طوفان کو اپنے اندر لئے آ رہی ہے، وہ خود خاموش تھا، اس کی کیفیت سمجھتا تھا۔

اس کا ری ایکشن جتنا تیز ہوتا کم تھا، مگر وہ چپ تھی جیسے صدمے میں ہو، اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایسے ناکام ہو کر لوٹے گی، ایسے ناکام ہو کر لوٹنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

بار بار ہارنا، جس کے لئے امیدیں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوں، گوہر اس کی چپ کو توڑنا چاہتا تھا، مگر اس وقت وقت خود کو وہ بھی بے بس پا رہا تھا، ھالار گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا، ان دونوں کو دیکھ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''مجھے پتہ تھا وہ نہیں آئیں گے، وہ بدل چکے ہیں۔'' اس نے پھر سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی، گوہر فرنٹ پہ آ گیا، وہ پیچھے بیٹھ گئی۔

''امرت تمہارا سامان تو گھر پہ رہ گیا، لے لیں؟ کیا خیال ہے۔''

''میں یہاں جتنی چیزیں لے کر آئی تھی وہ سب وہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔''

''اس نے کس حد تک خود کو کمپوز کیا ہوا ہے۔'' گوہر کو اندازہ تھا۔

''تم نے کیا سوچا ہے ھالار؟'' وہ اس سے مخاطب تھی۔

''جوزف کو کہہ دیا ہے ٹکٹ کا، میرا یہاں رکنا بے کار ہے، سوچا ہے جاتے ہوئے چابیاں دے جاؤں گا نواز کو کہ مالک مکان کو لوٹا دے۔'' وہ بھرا ہوا تھا۔

''تمہارا یوں جانا نہیں بنتا ھالی؟'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ ھالار چلا جائے، سب کچھ غلط ہو رہا تھا، ایسے ہو رہا تھا جیسے نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''کم از کم تم تو یہ بات مت کہو گوہر، تم سے تو کم بھگوڑا رہا ہوں۔'' وہ اپنی عاتش کا کچھ حصہ اس پہ لگا رہا تھا، گوہر ہنس دیا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔''

''مگر رشتے نہیں ٹوٹتے، آپ جتنی دور ہوتے ہیں، اتنا پاس رہتے ہیں، ایک ساتھ ظاہری ہوتا ہے اور ایک وہ جب آپ لمحہ لمحہ کسی کے ساتھ رہتے ہیں۔''

''اچھا بولنے لگے ہو، کچھ بہادر ہو گئے ہو، یہ سب اس کے سامنے کہو تو پورے بہادر بن جنو گے۔'' لہجہ کٹیلا تھا، اس بار وہ ہنسنا چاہتا تھا نہیں ہنس سکا۔

''(سامنا ہو چکا ہے اس سے) بہت سہہ چکا ہوں۔''

''ھالار تمہاری خفگی اپنی جگہ مگر سر نے تمہیں ایک زندگی دی ہے، تمہیں آنکھوں پہ بٹھایا ہے، تمہیں پالا پوسا لاڈ اٹھائے، جب انہوں نے اپنا رستہ خود چنا تو تم نے رستہ بدل دیا، تمہیں کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہیے، بے وفا وہ نہیں ہیں ھالی، بے وفا تم ہو، اب وفا نبھانے کی باری تمہاری تھی،

انہوں نے تمہیں وہ عمر دی ہے جس کی تمہیں ضرورت تھی، کیا عمر کا کچھ حصہ بھی وہ اپنے خاندان کو نہیں دے سکتے، جہاں آ کر وہ ٹھہرے ہیں، انہیں سکون کی گھڑیاں ملی ہیں اور تم لوگ چڑھ دوڑے ہو ان پر۔"

"تم چپ رہو گوہر، ابھی ایک بھگوڑے کی طرف داری کرتے ہوئے جو فخر تم محسوس کر رہے ہو، اسے میں سمجھتی ہوں، عبدالحادی ایک بزدل انسان تھا، بلکہ ہے، جس نے بغاوت کا نعرہ بلند کر کے صرف فرار حاصل کیا، وہ بیٹھ کر حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔"

"ایسا نہیں ہے امرت، جب ہم کسی جگہ ان فٹ ہوتے ہیں جہاں سے ہمیں انصاف نہیں مل سکتا، ہم اگر وہاں تبدیلی نہیں لا سکتے تو فرار ہی ہوتے ہیں، یہ فرار نہیں ہوتا، یہ خفگی کا اعلان ہوتا ہے، یہ رستہ الگ کرنے والی بات ہوتی ہے، یہ اعلان جنگ ہوتا ہے۔"

"مگر یہ بغاوت نہیں ہوتی گوہر، یہ بہادری نہیں ہوتی۔"

"یہ مصلحت ہوتی ہے امرت، تم نے بورڈ کے ادارے کو تب چھوڑا جب وہ تمہیں متاثر نہیں کر رہا تھا، جب وہ تمہیں تمہارا حق نہیں دے پا رہا تھا، حالانکہ تم نے کوششیں کی تھیں، یہ ہمت تم میں ہے، میں مانتا ہوں جو ہمت تب ان میں نہ تھی۔"

"اسے مصلحت کہو، وہ جس روایت کے خلاف نعرہ بلند کر کے نکلے تھے گوہر اسی روایت کی سرپرستی کو آنکھوں پر رکھ لیا۔"

"بیان بدلنا اور رستہ بدلنا کوئی ان سے سیکھے۔"

"جہاں تک میرا خیال تھا کہ میری ماں ایک اچھے شخص سے وفا نہ کر سکی، آج مجھے پتہ چلا ہے کہ ایک بے بھروسہ شخص کے لئے انہوں نے آدھی زندگی دے دی، ایک ایسا شخص جو جگہیں رستے بدلتا رہتا ہے، جس کی فکر بھی خانہ بدوش ہے اور فلسفہ بھی، میں غلط تھی، ایک غلط جگہ امید لگا بیٹھی، آج اس امید کو میں اس گوٹھ کی مٹی میں دفن کر آئی ہوں، مردے نہیں اکھاڑے جاتے، یہ امید میرے لئے مرحومہ ہی رہے گی، عبدالحادی ایک سیلفش انسان ہے، وہ صرف اپنی ذات کے فیصلے کرتا ہے۔" وہ جتنا تلخ بولتی کم تھا، مگر وہ کم تلخ بول رہی تھی، گوہر اسے موقع دے رہا تھا کھول رہا تھا۔

"وقت ثابت کرے گا کہ تم لوگ غلط سوچتے ہو اور انہوں نے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے۔"

"تم سے بحث کے لئے میرے پاس بہت مواد ہے گوہر، مگر فی الحال میں تم پہ اپنا خون جلانا نہیں چاہتی، یہ کلاس ہم اگلی بار پہ رکھتے ہیں۔"

"میں بھی چاہوں گا ہم اس کلاس کو روائنڈ کریں۔" اسے افسوس ہوا کہ وہ طوفان کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہے، اب اکیلے بیٹھ کر روئے گی، اس کے اندر شکست کتنی بھر گئی ہو گی، شاید وہ اگلی صبح پرچے کے کام پہ نہ آئے، شاید اب وہ اچھا اچھا سوچنا چھوڑ دے، شاید وہ، وہ سوچنے سے بھی گھبرا رہا تھا، اسے بہت فکر ہو رہی تھی۔

"امرت تمہیں بھوک لگی ہو گی؟"

"گوہر فی الحال چپ رہو، خدا کے لئے، آنسوؤں کے ساتھ لفظوں کو دھکیلنا بہت مشکل ہوتا

ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا تھا، وہ چپ ہو گیا۔
ھالار نے ایک پیٹرول پمپ پر گاڑی روکی تھی، وہ امرت کے لئے پانی لے آیا تھا، اس نے پانی کی بوتل لے لی تھی۔
''میں چاہتا ہوں ہم آخری بار کچھ باتیں کریں امرت۔''
''خون جلانے کے لئے آخری بار کہنا ضروری نہیں ہے، پرچے کے دفتر آ جانا، مل لیں گے۔''
وہ شہر میں داخل ہو چکے تھے۔
''کل صبح ٹھیک نو بجے علی گوہر پہنچ جانا، بہت کام کا ہرج ہو چکا ہے بہت زیادہ۔'' امرت کا گھر آنے والا تھا، علی گوہر نے اسے داد دینے والے انداز میں مسکرا کر دیکھا۔
''تم بہت ہمت والی ہو امرت۔''
''مجھے تعریف سننے کا ابھی کوئی شوق نہیں ہے، میں چاہتی ہوں وہ پیسہ ضائع نہ جائے، جو بہت اعتماد کر کے عدنان نے مجھے دیا ہے۔'' وہ کچھ کہہ نہ سکا، مگر ذرا مطمئن ضرور تھا، البتہ اس کی آنکھوں میں وہ طوفان ہچکولے کھائے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔
''آنکھیں اگر نہ ہوں تو آئینہ کسے کہیے۔''
فکر اپنی جگہ پہ قائم تھی۔
ھالار اپنی جگہ جا کر سوچے گا متنفر ہو گا، یہ جو بھی ہوا ہے، اس طرح سے نہیں ہونا چاہیے تھا، جانتا بھی تھا کہ ایسا سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆

زندگی اپنا کھیل اپنی مرضی سے کرتی ہے، ہم کچھ سوچتے ہیں، ہوتا کچھ ہے، فرق اس سے پڑتا ہے کہ اچھا ہوتا ہے یا برا، اچھے سے اچھا اور برے سے برا پڑتا ہے۔
اور جب انسان شکستہ ہو کر یہ سوچتا ہے کہ اچھا ہی ہوا، تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔
اس نے بھی یہی کہا تھا گھر پہنچتے کہ اچھا ہی ہوا، جو ہوا اچھا ہوا بہت اگر وہ یہ کہتی کہ سب اچھے کے لئے ہوتا ہے تو سچویشن نارمل ہوتی، مگر وہ کہہ رہی تھی کہ ٹھیک ہوا۔
اس کی ماں نے دیکھتے ہی پوچھا تھا کیا ہوا؟ کیسی ہو تم؟ انہیں آئیڈیا نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی لوٹ آئے گی، تب اس نے کہا تھا، اچھا ہوا، ان کو اندازہ تھا صورتحال سنگین ہے۔
''کھانا کھایا ہے تم نے؟''
''آپ کو ہر وقت میرے کھانے کی کیوں فکر ہوتی ہے۔'' وہ آتے ہی صوفے پہ ڈھے سی گئی تھی۔
''میں اگر نہ فکر کروں گی تو اور پھر کون کرے گا۔''
''کھانے پینے سے فکریں نہیں مٹ جاتیں، تم جس کے لئے گئی تھیں؟'' انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
''میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' اسے لگ رہا تھا اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ کر

کرچی کرچی ہو گیا ہے۔
وہ سوچ رہی تھی وہ امید کہاں سے لائے گی، اسے اپنی ہمت کم پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔
کل صبح اسے دفتر جانا تھا، کام بہت پڑا تھا، کئی مسائل زندہ تھے اور اسے لگ رہا تھا دل مر گیا ہے اس کا۔
جب کوئی امید کو دفنانے کی بات کرتا ہے، اس سے پہلے وہ خود کو اپنے دل کو دفناتا ہے، جب حقیقت مرتا ہے، جسم مرتا ہے تو لوگ دفناتے ہیں اور جب دل مرتا ہے تو خود ہی دفنانا پڑتا ہے، خود دفنانا مشکل ہوتا ہے کسی بھی چیز کو۔
''مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں امی۔'' اس نے لاشعوری طور پہ ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، صوفے کی پشت سے سر ٹکا لیا۔
ایک ماں یا باپ کے لئے سب سے زیادہ اہم کیا ہوتا ہے؟ ان کی اولاد ہوتی ہے ان کے لئے سب سے بڑھ کر۔
(مگر میرے باپ کے لئے نہیں ہے)
''امی اور اسی طرح ایک اولاد کے لئے سب سے بڑھ کر اس کے ماں باپ ہوتے ہیں، دونوں بہت ضروری اور اہم ہوتے ہیں، ماں پاس ہوتی ہے تو باپ کی کمی محسوس ہوتی ہے، باپ ہوتا ہے تو ماں کی۔''
''امی میں نے بہت شروع سے یہ کمی محسوس کی تھی، اللہ نہ کرے اگر آپ نہ ہوتیں میرے پاس اور وہ ہوتے تو یقین مانیں میں آپ کی کمی بھی اتنی محسوس کرتی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ کرتی، ماں بہت ضروری ہوتی ہے، اس لئے اللہ نے آپ کو میرے لئے نرم بنا دیا، مجھے احساس ہے کہ آپ نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے، مجھے وہاں سے لائیں، پڑھایا، اس قابل بنایا کہ میں اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو سکوں۔'' انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا۔
''پھر بھی مجھے لگتا ہے امرت میں تمہیں اتنا خوش نہیں رکھ سکی، اگر رکھ سکتی تو تم آج خوش ہوتیں۔''
''ایسا نہیں ہے امی، ایسا ہر گز نہیں ہے، ہمارے خیالات نہیں ملے سوچ نہیں ملی، ہم نے کبھی بیٹھ کر بات نہیں کی، نہ سلجھائی، آپ کو مجھ سے شکایت تھی کہ میں باپ کی کمی کو کیوں محسوس کرتی ہوں، آپ میری زندگی سے باپ نامی چیپٹر پھاڑ کر پھینک دینا چاہ رہی تھیں، کاش آپ کامیاب ہو پاتیں اس کوشش میں۔'' اس کی آنکھیں تر تھیں، لہجے کے ساتھ ہی۔
''امی میں ڈھونڈتی تھی اس ایک باپ کو، میں نے اسے بہت تلاشا، میں عادتوں میں بھی اس پہ گئی تھی، میرے وہ لاشعوری طور پہ آئیڈیل بن گئے، میری زندگی کا واحد مقصد ان کی تلاش تھا، میں کسی طرح پہنچ گئی ان تک، مگر میں غلط تھی، لاعلم تھی، میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔''
''امرت، تمہارا باپ بہت برا سہی، مگر مجھے یاد ہے وہ تم سے بہت پیار کرتا تھا اور اس نے تمہیں مجھے میری سہولت کے لئے دیا تھا، مجھے خوف تھا وہ تمہیں مجھ سے چھین لے گا، یہ وعدہ میں نے اس سے لیا تھا کہ تم پلٹ کر نہیں آؤ گے کبھی بھی۔'' انہوں نے اپنی تئیں اعتراف کا ایک بم

چھوڑا تھا۔

"مگر وہ تم سے محبت کرتا تھا، مجھے پتہ چلا تھا وہ روتا ہے تمہارے لئے۔"

"میں بری تھی امرت، میں نے شادی کے بعد تمہیں اماں کے پاس چھوڑ دیا، تم بہت روتی تھیں، مگر تب وقار نہیں مانتا تھا، میں مانتی ہوں میں بری ہوں، تمہیں نہ باپ کا ہونا دیا نہ ماں کا، ہاں تمہیں اپنے ددھیال پہنچا دیا تھا، پھر جب مجھے اولاد نہیں ہوئی کوئی جب حسرت بڑھتی گئی، ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، وقار کا تو پھر بھی بیٹا تھا اس کی حسرت اتنی نہ تھی، میں بھی ضد میں آ گئی، اپنی منوانی پر تمہیں لے آئی، تمہیں اسکول ڈال دیا انہیں دکھانا چاہتی تھی، وہ اپنی بچیوں کو دروازے تک نہیں چھوڑتے تھے اور اب ان کے خاندان کی بچی اسکول جا رہی تھی، میرے اندر اس خاندان کے لئے غصہ تھا، میں نے تمہارا بھلا کم سوچا، ضد زیادہ تھی، مگر تمہاری رگوں میں بہت اچھے خاندان کا خون تھا، تمہیں پتہ ہے میں حنان سے تمہاری منگنی پر بھی اسی لئے راضی ہو گئی تھی کہ ان کے ہاں سید خاندان سے باہر نہیں دیتے تھے، میں ان کے یہ اصول توڑنا چاہتی تھی، مگر امرت میں تمہاری بھلائی دیکھ رہی تھی، وہ لڑکا تمہارا خیال رکھتا تھا، تم خوش تھیں، پھر آہستہ آہستہ سب بگڑتا گیا، تم اس سے بیزار ہونے لگیں، مگر میں ماں تھی، چاہتی تھی تم گھر بسا لو۔"

"میں اتنا وقت آپ کی خوشی کے لئے ہی چپ تھی، کر رہی تھی میں یہ شادی، مگر مجھے اللہ نے بچا لیا، میں اللہ کی مشکور ہوں امی، میں اللہ کی بہت مشکور ہوں۔"

"مجھے خوف تھا امرت کہ تم کہیں باپ کے پاس جا کر مجھے چھوڑ نہ دو۔"

"حالانکہ ایسا ناممکن تھا، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی تھی اور یہ یقین بھی میں آپ کو نہیں دلا سکتی تھی، البتہ اب صرف اتنا بتا دوں، میں باپ کے لئے میں تڑپتی تھی، اس خواہش کو میں دفنا آئی۔" یہ کہنا کس قدر مشکل تھا کہ باپ کو دفنا آئی۔

"اب آپ ہر طرح کے خوف سے آزاد ہو جائیں، میری کسی بھی صورت ڈولی یہیں سے اٹھے گی۔"

"امرت خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو، میں نے تمہاری خوشیوں کے لئے رو رو کر دعائیں کی ہیں۔"

"میں خوش ہوں امی آپ کے ساتھ۔"

"تم اس سے ملیں امرت؟"

"اس متعلق اب ہم بات نہیں کریں گے امی، مجھے تکلیف ہوتی ہے اب۔" تکلیف کا نام لیتے ہی آنکھوں میں تکلیف والا پانی بھر آتا تھا، جسے آنسو کہا جاتا ہے، انہیں پتہ تھا امرت بہت کم روتی ہے اور اگر روتی ہے تو کسی کے سامنے نہیں روتی، ابھی وہ کتنی تھکی اور بے بس لگ رہی تھی، ان کا دل کیا جا کر اس شخص سے لڑے جھگڑے، اسے کہے کہ اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ غلط کیا ہے۔

"مجھے سونا ہے امی، میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ رہوں، تم سو جانا، میں بیٹھی رہوں گی۔" وہ نہیں چاہتی تھیں امرت اکیلے میں روئے، وہ اس کے ساتھ کمرے میں آئیں، امرت چینج کرنے کے بہانے واش روم میں

گھس گئی، انہیں پتا تھا وہ رو رہی ہوگی۔

''امرت بچے باہر آؤ، دیر ہوگئی ہے کافی۔'' کچھ دیر بعد انہوں نے دروازے پہ دستک دی۔

وہ باہر آئی تھی، آنکھیں سرخ تھیں، گال سوجھے تھے، وہ بیڈ کے کراؤن کو پکڑ کر چکرانے سے بچنے کے لئے بیٹھ گئی۔

''امرت کیا ہوا بچے؟'' اتنی کمزوری تو اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

''نیند آرہی ہے۔'' وہ لیٹ گئی، دماغ جیسے شل ہو رہا تھا۔

''میرا باپ، میرا باپ جب ملے گا، میں ان سے کہوں گی، یہ فرمائش کروں گی، میں لڑوں گی بہت لڑوں گی ان سے۔'' وہی باتیں جو بچیاں اپنے باپ کے بارے میں کرتی ہیں۔

''وہ تو میرے لئے ٹافیاں بھی نہیں لاتے، ابا میرے لئے ٹافیاں لاتے ہیں۔'' امر کلہ ٹافیاں سے ہی خوش ہو جاتی تھی۔

مگر اس کے پاس ابا نامی ذات کا حوالہ ہی نہ تھا کوئی اور جس کے لئے وہ ترستی رہی۔

دھول اڑاتی بائیک پر نظر آنے والا چہرہ، جانا پہچانا، بورڈ کی طرف سے پہلی بار کیا جانے والا ویران مکان میں انٹرویو۔

''آپ کہانی کیوں لکھتے ہیں؟'' سوال کبھی بہانہ بن جاتے ہیں اور یادیں، اسے لگا اس نے اگر مزید کچھ سوچا تو دماغ پھٹ جائے گا، اس کے سر میں شدید درد ہونے لگا۔

''یہ درد، اتنا شدید۔'' اسے لگا پہلی بار ہی اسے ہوا، لگا جان لے لے گا، انہوں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ دیا، وہ بند آنکھوں سے بچوں کی طرح پھوٹ کر رہ دی۔

☆☆☆

سونا کی آنکھوں کا پانی جیسے رو رو کر خشک ہو گیا تھا۔

اس نے بقیہ ماندہ سادھنا کے بنائے پوسٹرز جو کونوں کھدروں میں چھپے ہوئے تھے، برآمد کیے تھے اور سینے سے لگا کر رکھ لئے تھے۔

بچی کہاں گئی، زمین کھا گئی؟ آسمان نگل گیا، بچی کا کوئی سراغ نہ تھا، وہ حیران و پریشان تھیں۔

اب وہ ملے گی تو...... تو اسے کتنے جھوٹے سچے عہد بندھے ہوئے تھے، تو سے کتنے خالی خال نمایاں جھانکتے تھے، تو...... کے آگے سوچوں کے قافلے تھے، ایک لاشعور ڈراتا تھا، ایسا نہ ہو کہیں کسی گٹر کے نالے، نہیں نہیں وہ سوچنا نہیں چاہ رہی تھیں، سوچنا بڑا مشکل تھا۔

کئی دنوں بعد اس کے اندر کی نرم ماں جاگی تھی اور ایسی جاگی کہ دن بھر تو دن ہوتا مگر رات بھی جگائے رکھتی، ایسی جاگی، روزانہ ایک امید چھوٹی سی، جو بڑی بن جاتی، زندگی کے لئے یہ سب ضرور ہوتا ہے، جسے امید کہا جاتا ہے۔

وہ اگلے دن دفتر آئی تھی۔

''مجھے پتا تھا وہ آئے گی، اس کی آنکھیں اس قدر سوجھی ہوئی تھیں، میں نے اس سے پہلے کبھی اس بہادر لڑکی کو اس طرح آنسو بہا کر بیمار ہوئے نہیں دیکھا تھا، وہ تپی ہوئی تھی بخار میں، پھر بھی مسائل ڈسکس کر رہی تھی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے پتہ ہے وہ بہت بہادر ہے، گوہر میری بیٹی بہت بہادر ہے، وہ مجھ پہ نہیں گئی، وہ اپنے باپ سے زیادہ ہمت والی ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ اسے بیٹی کہنے کا حق کھو چکے ہیں، حالانکہ ان کو پتہ تھا، اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے تھے کہ میں اسے بیٹی کا حق اسی دن کھو چکا تھا، جس دن اس سے اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہوا تھا، مگر یہ کہنا بہت مشکل تھا۔

وہ جانتے تھے کہ وہ اب ان کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہے گی، وہ آج سے نفرت کرنا شروع کر دے گی، اس نے نفرت کرنا شروع کر دی ہوگی، اس لمحے سے جس لمحے کے بعد اس نے کہا تھا۔

''آپ نے مجھے کھو دیا۔''

اس نے پوری پلاننگ کی کہ ہمیں پہلا پرچہ کیسے لانچ کرنا ہے اس کے بعد ہم تین پرچوں تک اس لے سکتے ہیں، پھر ایک فائنل ڈیسیژن ہوگا، یا پرچہ بند کر دینا اور جتنا پیسہ لگایا ہے وہ ڈوبو دینا، ڈوب جائے، یا پرچے پر مزید سرمایہ لگا کر اسے گورنمنٹ سے رجسٹرڈ کروانا، رجسٹرڈ کروانے کے بعد ہمیں اشتہار ملنا شروع ہوں گے وہ بھی کیسے ملیں، ملیں نہ ملیں، کتنے ملیں، پھنس جائیں، کبھی پرچہ آئے گا کبھی نہیں آئے گا، ہم مصنفین کو پے کہاں سے کریں گے، ہم نئے سلسلوں کے لئے ورکرز کہاں سے ارینج کریں گے، ہمیں ایک بھرپور ٹیم ورک چاہیے ہوگا، جس کے لئے ماہانہ ہمارے پاس سرمایہ ہونا چاہیے، جو ہمارے پاس نہ ممکن ہے۔

کہنے لگی میری ذاتی ملکیت میری ایک سونے کی انگوٹھی تھی جو میں نے بہت پہلے اپنی ایک دوست پر قربان کر دی۔

''مجھے پتہ ہے وہ کون ہو سکتی ہے؟'' وہ بڑبڑائے اور بیٹھ گئے۔

''اس کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔'' گوہر مایوس تھا۔

''وہ مجھے بہت برا سمجھتی ہے گوہر اور میں برا ہوں بھی، برے سے زیادہ ناکام شخص ہوں، اتنا ناکام ہوں اپنی بیٹی کو پھر سے خود سے جدا کر دیا، قسمت ایک بار پھر مجھے چانس دے رہی تھی، اس نے میرا ہاتھ تھاما، مجھے لگا، اب وہ مجھے ابا کہے گی۔''

''اس نے آپ کو یہ کہا تھا کہ میرے ساتھ چلیں، سب کے سامنے، بہت مان تھا، اسے آپ پر۔'' انہوں نے تھکی ہوئی آنکھیں موند لیں، آنسو کناروں کے بند توڑ کر بہہ گئے۔

''میں اس سے بہت پیار کرتا ہوں گوہر، وہ میری ذات کا حصہ ہے، میرا خون ہے وہ، وہ ویسی ہی ہے جیسا میں نے سوچا تھا کہ لڑکیوں اور بیٹیوں کو ہونا چاہیے، وہ میری توقع سے زیادہ اچھی ہے، تمہیں پتہ ہے جب وہ پہلی بار میرا انٹرویو کرنے آئی تھی، میں اسے جانتا نہیں تھا، وہ کیسے سوال کرتی ہے، آپ کہانی کیوں لکھتے ہیں؟ جیسے وہ جال بن رہی تھی، مجھے جکڑ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں نڈر پن تھا، اکساہٹ تھی، بغاوت تھی، غصہ تھا، دھونس تھی، قابلیت تھی، اعتماد تھا، عزم تھا، میں تب ہی متاثر ہو گیا تھا، اس کے بعد جب وہ آئی مجھے لگتا دنیا آ گئی ہے، میرے چھوٹے سے گھر میں دنیا آ گئی ہے، پوری دنیا، میں نے اس سے اس کی امیدیں چھین لی، خواہشیں چھین لیں، میں بہت تکلیف میں ہوں گوہر، تمہیں نہیں پتہ میں کتنی تکلیف میں ہوں۔''

وہ ضرور کہتا کہ لگتا تو نہیں، اگر اندر کی تکلیفوں کے بارے میں لاعلم ہوتا تو وہ یہ کہہ دیتا۔

''گوہر وہ مجھے تکلیف سے نکالنا چاہتی تھی، اس میں ہمت تھی۔''
''سر آپ نے اس کا مان کیوں توڑا سر؟''
''گوہر تم سب جانتے ہو، جو دیکھا ہے، وہ البتہ نہیں جانتے جو میرے دل میں ہے گوہر، میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر تم اتنا تو سمجھتے ہو نا کہ میں کچھ سوچ کر ہی رکا ہوں، وہ سمجھتی ہے، میں روایتوں کو روائنڈ کرنے کے لئے رکا ہوں، وہ سمجھتی ہے میں بھی بعض چیزوں کے لئے بیچ چھٹرک رہا ہوں، یا مجھے واہ واہ کا چسکا پڑ گیا ہے، یا میں ذکر کی ہوسے فائدہ اٹھا رہا ہوں، محض تعویذ لکھ دیتا، دعائیں لکھ دیتا، لوگوں کو تسلیاں دے کر روانہ کرنا اور خود کو بزرگ کہلوانا میری بھی خواہش بن گئی ہے، اسے میں کہنا چاہتا ہوں ایسا نہیں ہے، مگر میں ابھی اپنی پوزیشن کلیئر نہیں کر سکتا، وہ دعوؤں پر نہیں رزلٹ پر یقین کرے گی اور رزلٹ ابھی بہت دور ہے، خدا جانے ہے بھی یا نہیں، مگر دیکھنا ہوگا، مجھے یہ سب کہہ لینے دو کہ میرے فیصلے میرے ہاتھ میں نہیں رہے ہیں، مجھے جو سنایا جائے گا وہ سنوں گا، جو کرایا جائے گا کرنا پڑے گا، مگر اس سے پہلے میں اپنے کچھ خوابوں کو ہوا ضرور دینا چاہتا ہوں۔'' گھٹن بڑھ گئی تھی، انہوں نے ہجرے کی کھڑکی کھول دی، جہاں دور دور سے دور دور تک کھیتوں کا ایک لمبا ہرا ابھرا سلسلہ نظر آرہا تھا اور نظر کو تقویت دے رہا تھا، اس نے لمبی سانس بھر کے سانس چھوڑ دی تھی۔
''موت سے پہلے کچھ جینے مرنے کی کشمکش ہر کسی کی زندگی کو نشانہ کرتی ہے گوہر، میرے پاس مستیوں کے لئے بہت کم وقت بچا ہے، مجھے اب قدرت سے دیت ... تنگی کی ... مجھے اپنے حصے کے کچھ کام کرنے ہونگے، اس کے بعد کون کہاں ہو، ہاں مگر میں اس سے روبرو ہو کر ایک بار ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری آخری خواہش میرے لئے کیا ہے یا مجھ سے وابستہ پہلی خواہش تو نہیں کہہ سکتا، کیا تم نے کہا؟ تم نے کبھی اس سے اس کی خواہش پوچھی ہے گوہر؟''
''وہ اپنی دلی خواہشوں کو مجھ پہ کیوں عیاں کرے گی اور میں کیوں پوچھوں گا، صرف ... وہ اسپیس دے دیتی ہے۔''
''میں نے اس سے اس دن یہ پوچھا تھا کہ تمہاری خواہش کا کیا ہوگا، ایک کامیاب سندھی پرچہ، کہنے لگی گوہر، میں اپنی خواہش کو تین ماہ کے اخراجات سے زیادہ نہیں کھلا سکتی، میں نے بہت کھلایا ہے اپنی خواہشوں کو، اب مہنگی ہوتی جارہی ہیں، اوقات سے نکلتی جارہی ہیں، لگام ڈالنی پڑے گی۔'' مایوس ہو گئے گوہر کے منہ سے امرت کی بات سن کر۔
''میں زمین بیچ کر اسے سرمایا دینا چاہتا ہوں گوہر، جو میرا ذاتی خاندانی حصہ ہے، وہ اسی کا ہے، میں چاہتا ہوں وہ اپنا حصہ لے لے۔''
''وہ نہیں لے گی سر، بھول ہے آپ کی۔''
''تم اسے کہنا کوئی ایڈ ہے۔''
''اس عمر اور مقام پہ کھڑے ہو کر آپ ایسی احمقانہ تجویزیں دے رہے ہیں۔''
''میں کیا کروں گوہر، میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کے قابل نہیں رہا، میرا قد میری بیٹی کے قد سے چھوٹا پڑ گیا ہے، جس دن اگر میں جوان ہو گیا، اس کے قد جتنا قد ڈال لیا،

اسے کہنا ابا تم سے بات کرنے آئے گا، تم بیٹی بن کر آئیں تھیں، وہ باپ بن کر آئے گا۔'' عزم آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

''اور اسے کہنا وہ وقت وہ ہوگا جس دن وہ مجھ سے بدلہ لے گی، اسے کہنا، ابا تمہیں بدلہ لینے کا موقع ضرور دے گا اور گوہر جب وہ مجھ سے بدلہ لے لے گی نا، تب مجھے انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔''

''ہوسکتا ہے وہ آپ سے بدلہ نہ لے۔'' آواز جیسے گہرے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

''دعویٰ کرنا بے وقوفی ہے گوہر اور نہ کرنا سمجھداری۔''

''اگر ایسا ہو جائے، فرض کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''وہ مجھے بار بار جیتے جی نہیں مار سکتی گوہر۔''

''کہنا تو یہ چاہیے کہ وہ مجھے مار نہیں سکتی گوہر۔'' اور گوہر نے کہا تھا۔

''اس کے لئے آپ کو جیتے جی مارنا بہت مشکل ہے سر۔''

''میں اسے بدلنے کا موقع ضرور دوں گا گوہر۔''

''محبت کا موقع نہیں دیں گے؟ بدلے کا موق دے گے؟''

''محبت کے قابل کہاں رہا ہوں۔'' آواز گہرے کنویں سے ہی آئی تھی۔

''وہ مجھے ٹھکرائے گی تب بھی جیت اس کی ہوگی، اپنا لے گی تب بھی جیت اس کی، ہار جیت کے دونوں فیصلے جس کے ہاتھ ہوں وہ دونوں صورتوں میں بازی جیت لیتا ہے، میں اسے جیتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، میں ازالہ کرنا چاہتا ہوں اس لمحے کا، جب اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا میرے ساتھ چلیں اور میں نے کہا تھا نہیں جا سکتا، اس نے کہا تھا آپ نے مجھے پھر کھو دیا۔'' آواز بھرا گئی۔

''میں زندگی میں دوسری بار سولی پہ لٹکا تھا اور دونوں بار تختہ میرا اپنا کھچایا گیا تھا، رسہ اپنا تھا، پھانسی اپنی تھی، جو خود کو پھانسی دے، وہ نہ غازی نہ شہید، دوسری بار اسے کھونا آسان نہیں تھا گوہر، پہلے انا تھی، احساس تھا، ماں سے بچی چھیننا نہیں چاہتا تھا، اب کی بار کہنے کو کوئی مجبوری نہ تھی، اسے کبھی نہ کھوتا، اگر وہ چلنے کی شرط نہ ڈالتی، اس نے مجھ سے اپنی خواہش مانگی تھی اور مجرم سے اس کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے گوہر، یہ نہیں کہا جاتا کہ خواہش پوری کرو، اس نے مجھ سے میری آخری خواہش پوچھنے کے سوا اپنی پہلی خواہش بتا دی، حالت تو میری دیکھ ہی آئی تھی۔''

''میں کتنی بار کیوں سر کو وہ آپ کو نکال رہی تھی مشکل سے۔''

''اسے آخری بات کہنا گوہر اور وہ یہ کہ جب میں خاندان کا بیٹا تھا، تب میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اس کا ابا ہوں، امرت کا ابا، جب وہ میدان چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتی، تو ابا کیسے میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔'' آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر جھریوں سلوٹیں بیدار ہوئیں۔

''داڑھی کے سفید بال کتنے محترم سے لگتے ہیں، آپ شیو کب کریں گے، بہت اچھے لگتے ہیں۔'' گوہر بھی عجیب تھا۔

''جب پھر سے جوان ہو جاؤں گا، تب ایک بار شیو کر کے آؤں گا، یہ محض لطیفہ ہے گوہر،

حقیقت بڑی خوبصورت ہوتی ہے، پتہ نہیں کیوں مرد اپنی داڑھی کے سفید بالوں کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے کہ وہ بوڑھا تو نہیں ہو رہا کہیں۔" وہ اتنی دیر بعد ہنسے تھے اور گوہر ہنس نہ سکا تھا، پتہ نہیں کیوں؟

☆☆☆

جیسے تیسے ان کا پہلا پرچہ آ گیا تھا اور اس نے ہر بڑے صوبے کی لائبریری کو پرچہ بھیجا تھا، کچھ دوستوں کو بھی بھیجا، مصنفین تو گنے چنے تھے۔

سینئر مصنفین کے پاس وقت نہ تھا کہ لکھیں، جونیئرز نے ڈھیر لگا دیئے، جن میں سے گن چن کر تین کہانیاں کانٹ چھانٹ کر لگائیں۔

باقی کے سلسلوں سمیت، اس نے اور گوہر نے مل بیٹھ کر افسانے لکھے، وہ بھی مختلف ناموں سے اور لکھنے کے بعد پڑھتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے افسانوں پر تنقید کرتے ہوئے خوب نوک پلک سنوار رہے تھے، کسی بھی صورت پہلا پرچہ مارکیٹ میں آ گیا تھا۔

اسی دن نواز حسین انہیں دعوت دینے آیا تھا شادی کی، اسے شادی کی خوشی سے زیادہ یہ دکھ تھا کہ تانگے کا پہیہ ٹوٹ گیا ہے، سیٹ کا پلاسٹک اکھڑ گیا ہے، اوپر والی سلاخ پر لگا پردہ پھٹ گیا ہے۔

امرت کو اس کی فکر دیکھ کر ہنسی آ گئی، گوہر مسکرایا۔

"میں بہت سنجیدہ صورتحال بتا رہا ہوں اور تم لوگ مذاق لے رہے ہو۔"

"نواز بھا آپ خیر سے شادی شدہ ہونے جا رہے ہیں، عنقریب آپ کی فکریں بدلنے والی ہیں، کل کسی دن آپ اسی جگہ بیٹھ کر بیوی بچوں کے دکھڑے رونے بیٹھ جائیں گے۔"

نواز بھا کا منہ بن گیا، پھر افسردگی چھائی تو کہنے لگا۔

"تانگہ چلانے والا مزدور کسی کو کیا خوشیاں دے سکتا ہے بھلا۔"

"خوشیوں کا تعلق تانگے یا ریل کار سے نہیں ہوتا نواز حسین، دل سے ہوتا ہے۔"

"دنیا میں وہ مرد دیکھے ہیں بھاؤ جو عورت کو صرف نام کی محبت دیتے ہیں، کھانے کو گھر میں کچھ نہیں ہوتا، وہ نشئی شرابی، جواری، یا کاہل ہوتے ہیں، آپ تو مزدوری کرتے ہیں، آپ کو کوئی مایوسی نہیں ہوگی، جیسے جوتا ٹانکنا رومال سینا بھی آتا ہے، بھوک تو وہ بھی نہیں مرتا اور بھوک تو وہ بھی نہیں مرتا جو کچھ کھاتا نہیں، کہیں نہ کہیں سے رزق مل جاتا ہے، آپ اتنے مضبوط توکل والے ہیں، کیوں فکر کرتے ہیں، سنا ہے ماؤں کی دعائیں بیٹوں کے حق میں قبول ہوتی ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ جب ماں نہ ہو تو بہن کو سمجھو، بھائیوں پر جان دیتی ہیں، ایک بہن ہے امر کلہ، اور ایک آپ، دعا کریں، سرخرو ہو سکوں۔"

"آپ امر کلہ کو کب سے جانتے ہیں نواز بھا؟"

"تب پہلی بار ملا تھا جب گولڑوی صاحب کی درگاہ سے نکلتے ہوئے، ہوٹل پر ہم چائے پینے ٹھہرے تھے حالانکہ جانتا کچھ پہلے سے تھا، کبیر بھائی ذکر کرتے تھے اس کا۔"

"کبیر بھائی کو آپ کب سے جانتے تھے؟"

"جب میں نے خود کو جاننا ابھی شروع نہیں کیا تھا، بہت پہلے کی بات ہے۔"

"اسے جانے دو امرت دیر ہو جائے گی۔" گوہر نہیں چاہ رہا تھا وہ ابھی مزید کھلے، امرت

سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

''کس کس کو انوائیٹ کرنا ہے آپ نے؟''

''بس کچھ دوست ہیں اور گھر والے، آپ...... میری دنیا اتنی چھوٹی اور اتنے بڑے لوگوں سے بھری ہوئی اور اتنی خوبصورت دنیا۔'' وہ اس کی بات پر مسکرا دی۔

گوہر کوئی تبدیلی محسوس کر رہا تھا اس میں جو آئی تھی۔

☆☆☆

امر کلہ اور اس نے نواز کے لئے چھوٹی موٹی چیزوں کی شاپنگ کی تھی، گوہر نے اس کے لئے تانگے کے دو پہیے خریدے، امرت نے سیٹ کورز، پردے، چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر جس میں ریڈیو بھی تھا۔

امر کلہ نے اس کے لئے ڈائری، قلم، کتابیں، قرآن پاک کا نیا نسخہ، کپڑے، چار سوٹ ہلکے والے اور ان سب کے لئے اس نے امرت سے پیسے ادھار لئے تھے اور وہ اسے کہہ رہی تھی کہ۔

''مجھے پتہ ہے تم نے واپس نہیں کرنے یہ پیسے۔'' وہ ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''کہ ہاں مجھے بھی شاید کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔''

☆☆☆

صبح بہت دھندلی تھی، کہر چھائی ہوئی تھی، انہوں نے اوطاق کے صحن میں ٹہلتے ہوئے دھندلے آسمان کی طرف دیکھا تھا، آج خاندان کا پہلا فیصلہ ان کے پاس آنا تھا، بوجھ سے کندھے دبتے جاتے تھے۔

کسی لمحے دل کہتا یہ تو نے کیا سر لے لیا، کون سی ذمہ داری کتنی بڑی، مسائل منہ کھولے کھڑے تھے۔

لاھوت ہر اک چیز سے غیر ذمہ دار تھا، اب تو مزید ہواؤں میں اڑتا جاتا۔

عمارہ کو لے کر کراچی کے لئے نکل گیا، ساس سسر کو بھی لے لیا، ماں نے تو حویلی سے قدم باہر نہ نکالنے کی قسم کھا رکھی تھی جیسے، گھر کی روح گھر میں بند، کہتی دنیا دیکھ کر میں نے کیا کرنا ہے میں اپنے گھر میں خوش ہوں، وہ بیوی کو لے کر سسرال گیا اور بوی کے امی ابا کو لے کر دوست کے گھر چلا گیا کچھ دن تفریح کے گزارنے۔

گوہر نے سوچا۔

''یہ توفیق کبھی مجھے نہ ہوئی۔'' کہنے لگا۔

''گوہر سوائے مزاروں، قبرستانوں کے آپ کو کہیں نہیں لے جائے گا، چلیں ہم زندوں کے بیچ گھومنے جاتے ہیں۔''

گوہر کو کیا اعتراض ہونا تھا، البتہ اسے ماں نے بڑا فورس کیا چلنے کے لئے، مگر وہ امرت کے ساتھ پرچے کی تیاریوں میں مصروف تھا، اس لئے معذرت کر لی اور ویسے بھی اس کا کہاں دل کرتا تھا مصنوعی سیر سپاٹے کے لئے بنائی گئی عمارتوں میں گھومنے کا، وہ تو میدانوں، صحراؤں، جنگلوں، آبشاروں کو دیکھ کر جیتا تھا۔

گلیوں، چوراہوں، کھوکھوں، چھوٹی موٹی دوکانوں کے بیچ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور کچھ یوں کو سنتے گزارتا، پلیٹ فارم پر کبھی کبھار کبیر بھائی کے آثار دیکھنے چلا جاتا ان کے کسی دوست سے مل لیتا۔

کبھی مزدوری ڈھونڈنے کے لئے مارا مارا پھرتا، یا تو مزاروں کی چوکھٹوں کی گرد چھانتے ہوئے دل بڑا کر لیتا، سو کہاں ان کے ساتھ ہو لیتا۔

اور ادھر...... فنکار صاحب گدی نشین بن کر بیٹھ گئے تھے، انہیں لگا جیسے ہر جگہ سے اژدے منہ نکالے ان کی طرف آ رہے ہیں، بڑھاپا کتنی کمزور سی چیز ہے، بڑھاپے میں جوان ہونا، جوانوں جیسے فیصلے کرنا، فیصلوں کو قبول کروانا، سکھ، طاقت، حکمت، دانائی، تحمل، عقل، فیصلے کے لئے کیا نہیں چاہیے ہوتا۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد اوطاق سجنے والی تھی، اسے یاد آیا کبھی وہ اپنے باپ بھائی کو کتنی بری نظر سے دیکھتا تھا جب کوئی فیصلہ برارزلٹ لاتا تھا اور آج وہ مسند پر بیٹھا ہوا تھا، جی چاہا اپنا چہرہ تھپڑوں سے لال کر دے، خود پر ہاتھ اٹھانا کتنا مشکل ہوتا ہے، باتیں کسنا، برا سمجھنا، جھٹلا دینا اور تھوپ دینا، لمحے کو لگا ارد گرد کوئی جال بنا ہوا ہے۔

''خود ہی کھائی میں گرے ہو، پر مت مارو۔''

امرت جیسے لاشعور بن کر آ جاتی تھی، اسے لگا یہ لہجہ کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

☆☆☆

وہ اسے قدم گاہ مولیٰ علی پر لے آئی تھی، وہی بھیڑ، وہی ہجوم، وہی لوگ، کچھ پرانے کچھ نئے، اور ساتھ میں سخی عبدالوہاب صاحب کا مزار، امر کلہ کی اچانک طبیعت خراب ہونے لگی۔

''امرت! یہاں اور کون ہے؟ کس کا مزار ہے؟ سخی صاحب کے پاس پہلے تم آئی ہو کبھی؟ یہاں سے چلو امرت، اس سے پہلے کوئی بولنا شروع کر دے، یہاں سے چلو۔''

''کون بولنا شروع کرے گا؟ چلو۔'' وہ نڈھال سی ہو رہی تھی، آنکھیں سرخ ہونے لگیں، نیچے گیٹ کے پاس نواز کھڑا تھا، جو چڑھائی چڑھ کر اوپر آیا، اسے امر کلہ کا اندازہ ہو گیا۔

''امر کلہ ہمت کرو تو سخی صاحب کو سلام کر آئیں؟'' امر کلہ نے عجب بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا، امرت ذرا فکر مند ہو گئی۔

''چلو نواز بھائی، چلتے ہیں۔'' اسے خاصی تشویش ہوئی۔

''امر کلہ کو لے چلو۔'' نواز بھا ایک بار تماشہ دیکھ چکا تھا، دوسری بار نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

امرت کو لگا جیسے وہ آنکھیں بند کر کے چلانا شروع کر دے گی ابھی کہ ابھی۔

''چلو نواز بھا، سخی صاحب کو سلام کر آئیں۔'' (بھاگنے کا وقت نکل گیا ہے) بڑی ہمت کر کے کہا تھا، نواز کو اس پر ترس آ گیا۔

''اب کی بار نہ سہی اگلی بار امر کلہ بہن۔''

''اگلی باری کس نے دیکھی ہے بھا نواز۔''

وہ امرت اور نواز پتلی ہجوم بھری گلی سے گزر کر پتھر پہ پاؤں رکھ کر آئے، وہی پتھر جو پل کی

طرح رکھا تھا، وہی جہاں گوہر گرتے گرتے بچا تھا اور نگار نے عیسیٰ مسیح کی صدا بلند کی تھی، وہی...... اسی جگہ امر کلہ کو چکر آ گیا، اس نے نواز کا بازو تھام لیا تھا اور عیسیٰ مسیح کی صدا نہ بلند کر سکی تھی، زبان پہ تالا پڑا تھا جیسے۔

امرت اسے عورتوں کے سیکشن کی طرف لے آئی تھی۔

''میں نے ایک بار یہاں تمہارے زندہ بچ جانے کی دعا کی تھی اور وہ دعا کرتے ہوئے مجھے خود پر رحم آ رہا تھا، کہ ایک مری ہوئی لڑکی کی زندگی میں صوفی صاحب سے مانگ رہی ہوں، بوجھ ڈال رہی ہوں، صوفی صاحب میری جہالت پر کتنا سوچیں گے، اس کے بعد میں نے یہاں آ کر کوئی خاص دعا نہیں کی، البتہ پروفیسر غفور اور علی گوہر کے ساتھ یہاں آئی ضرور تھی، مجھے یہاں آ کر سکون ملتا ہے امر کلہ۔'' وہ بول رہی تھی اور امر کلہ چپ تھی، اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔

''تمہیں پتہ ہے صوفیوں کے دربار میں حاضری پر ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔'' امرت نے جب اسے دیکھا تو اس نے کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی تھی۔

اسے کیا بتاتی کہ یہاں حاضری دے رہی تھی، بات بہت بڑی تھی، زبان چھوٹی تھی، آنسو چھلک گئے تو بتانے تھے۔

''اب کون تجھے امر کلہ نماز سے روکے گا۔'' بغیر کلمے کے سجدہ ہو رہا تھا، قبلہ رخ پہ۔

''کون پوچھتا کہ وضو کیا؟ کون پوچھتا کہ کلمہ پڑھا؟ کون پوچھتا کہ شناخت بدلی۔''

سجدہ دل کا تھا، پہلا سجدہ دل کا سجدہ تھا، اس نے پہلی بار شکست قبول کی تھی، دوسرا سجدہ پیشانی تک گئی۔

جمعے کی رات تھی اور ذکر کی ہونے سماع باندھ دیا تھا، دلوں کا وجد ناچنے لگا

وہی بت کدہ میں بن کر کرن سجود
ساجد اور مسجود، سچل ہک منگلاج میں۔
سانسوں میں پھوار پڑنے لگی، ذکر کی
وجد میں سارا عالم منصور نظر آیا
مجھے ہر کلی شجر میں تیرا نور نظر آیا

(آخری قسط انشاء اللہ اگلی بار)

بنت حوا

وہ کچن میں داخل ہوئی تو سنک میں پڑے گندے برتن اس کا ڈھیروں خون جلا گئے بکھرا ہوا کچن، گندے برتن اس کی نفاست اور صفائی پسند طبیعت پر ہمیشہ ہی گراں گزرتے تھے۔

''نواب زادی آج پھر چھٹی کر کے بیٹھ گئی۔'' وہ غصے سے بڑبڑاتی قمیض کی آستینیں چڑھاتی تھکن کی پرواہ کیے بغیر کچن کی حالت سدھارنے میں لگ گئی، تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ کام سے فارغ ہوئی اور کچن پر اطمینان بھری نظر ڈالتی فرج کی طرف بڑھی تاکہ کھانا گرم کر سکے اظہر کے کالج سے آنے کا وقت ہو رہا تھا اور اسے خود بھی بڑی زوروں کی بھوک لگ رہی تھی، وہ سالن شام میں ہی پکا کر رکھ لیا کرتی تھی تاکہ سکول سے واپسی پر صرف روٹی بنانا رہ جائے، اس نے آخری روٹی توے پر ڈالی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی اس کا دل دھڑک اٹھا وہ اس دستک کو بہت اچھے سے پہچانتی تھی۔

''لیکن اس وقت۔'' وہ روٹی کے جلنے کی پرواہ کیے بنا دوپٹہ ٹھیک سے لیتی دروازے کی طرف بڑھی اور ایک شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے دروازہ کھول دیا مگر سامنے نظر پڑتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا آج دروازے پر ہی کھڑا رکھو گی کیا؟ اور یہ تم اتنی حیران کیوں نظر آ رہی ہو۔'' رفیق صاحب کے کہنے پر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے سائیڈ پر ہو کر ان کو راستہ دیا۔

''سوری ابو میں سمجھی تھی کہ، کہ آپ شام کو آئیں گے اظہر نے یہی بتایا تھا مجھے۔'' دماغ نے بروقت احساس دلایا کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے سبھی بات بدل گئی اور ان کے ہاتھ سے سفری بیگ تھام لیا۔

''ہاں آنا تو شام کو ہی تھا مگر ریحان نے آج ادھر آنا تھا تو میں نے سوچا کہ چلو اس کے ساتھ چلے چلتا ہوں، ارے بیٹا تم ابھی تک وہاں کیوں کھڑے ہو؟ آؤ بیٹھو۔'' رفیق صاحب کے کہنے پر اس نے پلٹ کر دیکھا، ریحان اس کے پیچھے کھڑا تھا وہ بے خیالی میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔

''اچھا تو ریحان دروازے پر دستک دینے کے بعد جان بوجھ کر سائیڈ پر ہو گیا تھا۔'' وہ ایک لمحے میں اس کی شرارت سمجھ گئی ریحان اسے سلام کرتا رفیق صاحب کے پاس پڑی کرسی پر آ بیٹھا۔

''ابو اندر چل کر بیٹھیں یہاں تو کافی گرمی ہے ابھی۔'' ان دونوں کو برآمدے میں براجمان ہوتے دیکھ کر اس نے گرمی کا احساس دلایا اگرچہ برآمدے میں چکیں ڈال کر گرمی روکنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس سال وہ بھی موسم کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

''چلو تم جلدی سے ٹھنڈا پانی لے آؤ ہم اندر چل کر بیٹھتے ہیں، کھانا تو تیار ہے نا؟'' ریحان کے ہمراہ کمرے میں جاتے ہوئے انہیں اچانک کھانے کا خیال آیا تو مڑ کر پوچھنے لگے۔

''جی ابو تیار ہے میں پانچ منٹ میں لاتی ہوں۔''

''شاباش میرا بچہ جیتی رہو۔'' وہ دعائیں دیتے اندر کی طرف بڑھ گئے مفرا جلدی سے کچن میں چلی آئی تا کہ سکنجبین بنا سکے رفیق صاحب کو سکنجبین بہت پسند تھی، اسے اچھی طرح پتا تھا کہ ریحان کو صرف پیپسی ہی چاہیے ہوتی ہے اور اسی لئے ان کے فریج میں ہمیشہ ہی پیپسی موجود ہوتی تھی کیونکہ وہ کبھی بھی کسی بھی وقت آ جایا کرتا تھا لیکن آج اس نے جان بوجھ کر پیپسی کی جگہ سکنجبین

دیکھ کر ریحان کے منہ کے بگڑتے زاویے اسے مزا دے گئے۔

''چھوٹی سی شرارت کی چھوٹی سی سزا۔'' وہ دل ہی دل میں مسکراتی کھانا لینے چل دی۔

☆☆☆

''ہیلپ چاہیے تو بندہ حاضر ہے مادام۔''

وہ روٹیاں رومال میں لپیٹ کر ہاٹ پاٹ میں رکھتی سلاد بنانے کا سوچ رہی تھی تبھی ریحان کچن میں داخل ہوتے ہوئے پوچھنے لگا، مفرا نے مڑ کر دیکھا وہ فریج سے پیپسی کی بوتل نکال رہا تھا۔

''بے شک تمہیں مفت میں مل جاتی ہے لیکن پھر بھی اتنی پیپسی نہ پیا کرو کہیں تمہاری رنگت بھی پیپسی جیسی نہ ہو جائے۔''

''لوگ تو پیپسی بھی نہیں پیتے پھر بھی کالے ہو جاتے ہیں شاید دوسروں کی خوبصورتی سے جل جل کر۔'' مفرا نے چھیڑا تو وہ بھلا وہ بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا فوراً اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے مفرا کی سانولی رنگت پر چوٹ کی۔

''تو کیوں آتے ہو کالے لوگوں کو دیکھنے کے لئے، جا کر اپنی پھیکے شلجم جیسی دوستوں کے ساتھ گپیں لگاؤ۔''

''ایک تو تمہیں میری کولیگز سے اللہ واسطے کا بیر ہے اب ان بیچاریوں کو کیوں لے آئی ہو درمیان میں۔'' ریحان نے لفظ بیچاریوں پر زور دیتے ہوئے اسے مزید تپانے کی کوشش کی لیکن خلاف توقع وہ ہنس پڑی وہ ساتھ ساتھ اس کے ساتھ سلاد بنانے میں ہاتھ بٹا رہا تھا وہ اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تبھی ایک بار پھر دروازے پہ دستک ہونے لگی۔

''اظہر ہوگا میں دیکھتی ہوں۔''

''ٹھہرو میں کھولتا ہوں، آہ ظالم سماج..... سالا۔''

''اوئے خبردار جو میرے بھائی کو کچھ کہا۔''

''سالے کو سالا نہ کہوں تو اور کیا کہوں محترمہ۔'' وہ اب بھی شرارت پر آمادہ تھا۔

''میں خود جاتی ہوں۔'' چہرے پر چھائی لالی کو چھپانے کی کوشش کرتی وہ خود کچن کے دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن ریحان نے ہاتھ تھام کر اسے جانے سے روک دیا اور خود دروازہ کھولنے چل دیا، حسب توقع وہاں اظہر ہی تھا ریحان کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''ارے واہ ریحان بھائی آئے ہوئے ہیں۔'' وہ خوشگوار لہجے میں کہتا ریحان کے گلے لگ گیا، عمر کے فرق کے باوجود ان دونوں کے درمیان بہت دوستی تھی بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ریحان اظہر کے لئے صرف اچھا دوست ہی نہیں بلکہ بڑے بھائی کی طرح سے جس سے وہ اپنی پڑھائی اور مستقبل کے خوابوں کے بارے میں سارے مشورے بھی کرتا تھا، مفرا نے فٹافٹ کھانا لگایا اور بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا، اس کے بعد رفیق صاحب آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے اظہر ریحان کو اپنے کمرے میں لے گیا جبکہ مفرا کے لئے ابھی بہت کام تھے وہ دل ہی دل میں کاموں کو ترتیب دیتی برتن سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

''بس باجی کیا بتاؤں میرا چھوٹا لڑکا کل سویرے سیڑھیوں سے گر گیا، گاؤں کی ڈسپنسری بند پڑی تھی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے بچے کو لے کر سیدھی شہر پہنچی چار ٹانکے لگے ماتھے پر، ہائے میرا بچہ کیسا بلک بلک کے رو رہا تھا، بس باجی اسی پریشانی میں دو دن آپ کے گھر بھی نہ آ سکی بچی سوچ کے بڑی شرمندگی ہو رہی تھی کہ

آپ کو کتنی تنگی اٹھانا پڑی ہوگی۔'' زرینہ نے اپنا تکیہ کلام (بس باجی) دہراتے ہوئے ایسے لہجے میں آخری فقرہ کہا کہ مفرا خود شرمندہ ہوگئی۔

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں دکھ سکھ تو زندگی میں چلتے ہی رہتے ہیں بس تم کہلوا دیتی کہ نہیں آؤ گی تو اچھا ہوتا۔''

''بس باجی پریشانی میں کچھ خیال ہی نہ رہا۔'' زرینہ نے بے چاری سی شکل بنا کر جواب دیا تو مفرا سر ہلا کر رہ گئی۔

''بے چاری کتنی پریشانی میں رہی اور میں خواہ مخواہ اسے برا بھلا کہتی رہی غریب سہی آخر کو وہ بھی ماں ہے بچہ تکلیف میں چھوڑ کر کیسے گھر سے نکلتی۔'' مفرا پر بقول ریحان سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے کا دورہ پڑ گیا تھا سو اس نے اس دن بھی تھوڑے بہت ضروری کام کروا کر زرینہ کو چھٹی دے دی جاتے سمے کچھ پیسے اور پھل بھی اس کے ہاتھ میں تھما دیئے کہ بچے کا ٹھیک سے علاج کروا سکے، دو دعائیں دیتی رخصت ہوئی اور مفرا باقی بچا کام نمٹانے لگ گئی۔

رفیق صاحب کو اللہ میاں نے دو ہی بچوں سے نوازا تھا مفرا اور اظہر، دونوں ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے، وہ لوگ شہر سے تھوڑا ہٹ کر رہتے تھے لیکن شہر جانے کے لئے بسیں وغیرہ آسانی سے مل جایا کرتی تھیں رفیق صاحب گورنمنٹ سکول میں استاد تھے تھوڑی بہت زمین بھی تھی جو انہوں نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی کہ خود ان کے لئے زمین پر کام کرنا مشکل تھا اور اظہر کی توجہ وہ صرف پڑھائی پر ہی دیکھنا چاہتے تھے، خوش قسمتی سے بیوی سلیقہ شعار ملی اور بچے فرمانبردار سو زندگی آرام سکون سے گزر رہی تھی، لیکن ثریا کی بیماری نے ان کی پرسکون زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اور ایک دن وہ چپکے سے آنکھیں بند کر گئی اس وقت مفرا سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی جبکہ اظہر سکول میں پڑھتا تھا، گھر کے ساتھ ساتھ بھائی اور باپ کی ذمہ داری بھی مفرا پر آ گئی تھی لیکن اس نے بڑی ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے پڑھائی کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی نبھائی، ریحان مفرا کے چچا کا بیٹا تھا جو اس سے عمر میں چند سال ہی بڑا تھا لیکن وہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بہت بے تکلف تھے اس لئے عمروں کا فرق محسوس ہی نہ ہوتا تھا، مفرا کی ماں کی زندگی میں ہی ریحان اور مفرا کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور اب یہ رشتہ اس کی زندگی کی خوشیوں اور خوابوں کا محور و مرکز بنا ہوا تھا ایم اے مکمل ہوتے ہی اس نے ایک اچھے پرائیویٹ سکول میں جاب کر لی اگرچہ رفیق صاحب نے اسے منع بھی کیا تھا لیکن اسے مصروف رہنا اچھا لگتا تھا اور پھر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اظہر کو پڑھائی کے دوران کسی بھی قسم کی مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔

☆☆☆

''ہاہاہاہا میری بھولی بہن آپ کی ماسی ایک بار پھر آپ کو...... معذرت کے ساتھ مگر سچ یہی ہے کہ وہ آپ کو الو بنا گئی ہے۔'' ساری بات سننے کے بعد اظہر بے ساختہ ہنس پڑا۔

''بس رہنے دو تم لڑکے بھلا کہاں سمجھ سکتے ہو ایسی باتوں کو۔'' وہ اظہر کے ہنسنے پر خفا ہوتے ہوئے بولی۔

''اوکے اوکے آپ نے بالکل ٹھیک کیا اللہ آپ کو اس کی جزا دے اچھے سے دولہا کی دعا تو بنا مانگے ہی پوری ہو چکی ہے۔'' اس کے شرارت سے کہنے پر مفرا بھی سب بھول کر ہنس دی۔

آج اتوار تھا کہنے کو چھٹی کا دن لیکن حقیقت میں مصروف ترین دن اتوار کو زرینہ تھوڑا دیر سے

آتی تھی، رفیق صاحب صبح میں صرف چائے لیا کرتے تھے، اظہر بھی دیر تک سو کر چھٹی مناتا اس لئے مفرا اپنے ابو کو چائے دینے کے بعد دیر تک قرآن کی تلاوت کرتی اور پھر ناشتہ تیار کر کے اظہر کو جگاتی دونوں بہن بھائی مل کر ناشتہ اور گپ شپ کرتے پھر زرینہ آ جاتی اور مفرا اس کے ساتھ مصروف ہو جاتی اظہر اکثر کسی دوست کی طرف نکل جاتا کرکٹ کھیلنے چلا جاتا، مفرا نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آج تیسرے دن بھی زرینہ کو چھٹی دے رکھی تھی وہ ایسی ہی تھی دوسروں کا خیال رکھنے والی اور ان کے دکھوں کا اپنا سمجھنے والی۔

''السلام علیکم باجی!'' نورین نے پسینہ پونچھتے ہوئے سلام کیا اور تھکے تھکے انداز میں پہلے گود میں اٹھائے ڈیڑھ دو سال کے بچے کو برآمدے کی سیڑھی پر بٹھایا پھر خود بھی وہیں ٹک گئی۔

''کیسی ہو نورین؟ بڑے دن بعد چکر لگایا بھئی، کہاں غائب تھی؟'' مفرا برآمدے میں ہی ایک طرف بچھے تخت پر بیٹھی سبزی بنا رہی تھی، جب نورین کی آمد ہوئی۔

''آپ کو تو میرے میاں کا پتا ہے جی ماں بہن کے کہنے میں آ کر مجھے مارتا پیٹتا ہے پچھلی دفعہ تو حد ہی کر دی میرا سر پھاڑ دیا یہ دیکھیں۔'' نورین نے سر کے بائیں طرف سے دوپٹہ ہٹاتے ہوئے زخم کا نشان دکھایا۔

''بس پھر میں بھی اپنی بہن کے پاس کراچی چلی گئی مہینہ بھر بعد آئی ہوں، لینے گیا تھا میرا میاں بہت منتیں کر رہا تھا معافی بھی مانگی تو میں آ گئی۔'' اس کے سادگی سے بتانے پر مفرا نے کچھ کہے بنا افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا، سائیڈ میں رکھے کولر سے گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کے بچے کے منہ سے گلاس لگاتی نورین کو اچانک سے زرینہ کا خیال آ گیا۔

''آج زرینہ نہیں آئی ابھی تک؟''

''ہاں آج وہ چھٹی پر ہے، اچھا یہ بتاؤ اس کا بیٹا اب کیسا ہے؟ ٹانکے کھل گئے ہیں اس کے؟'' ذکر آیا تو مفرا نے بھی زرینہ کے بیٹے کی خیریت پوچھ لی کہ وہ ان دونوں کے گھر قریب قریب ہی تھے۔

''اس کے بیٹے کو کیا ہوا باجی؟ وہ تو اچھا بھلا ہے۔''

''اچھا...... میں نے تو سنا تھا وہ سیڑھیوں سے گر گیا اور اسے شہر لے جا کر ٹانکے لگوانا پڑے۔'' مفرا کی بات پر نورین کھلکھلا کر ہنس دی۔

''باجی آپ بھی نہ سچی بڑی بھولی ہیں، جھوٹی سچی باتوں پر یقین کر لیتی ہیں پہلی بات تو اس کا بیٹا بالکل ٹھیک ہے اور دوسری بات انتہائی بیماری میں بھی وہ لوگ کبھی شہر نہ جائیں سیڑھی سے گرنا تو پھر معمولی بات ہوئی ہمارے یہاں ایسے وقت میں ڈاکٹر کے پاس جا کر پیسے ضائع کرنے کی بجائے کپڑا جلا کر زخم میں بھر لیا جاتا ہے باجی اور جس دن کا آپ بتا رہی ہیں اس دن تو ہمارے رشتے داروں کی شادی تھی زرینہ بھی مجھے وہیں ملی تھی آپ کو تو پتا ہے وہ میری ہی برادری کی تو ہے۔'' نورین بنا بتائے سمجھ گئی تھی کہ یہ کہانی زرینہ نے چھٹی اور ایکسٹرا پیسے لینے کے لئے بنائی ہو گی اس کے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ تھی۔

مفرا کو لگا دراصل نورین اسے بھولی نہیں بلکہ بے وقوف کہنا چاہ رہی تھی مگر ظاہر ہے وہ ایسے نہیں کہہ سکتی تھی اس لئے بھولی کہہ دیا۔

''چلو چھوڑو اسے تم سناؤ بہن کیسی تھی

تمہاری؟'' مفرا نے موضوع بدل دیا لیکن در حقیقت اس کے دل میں خود کو اس طرح بے وقوف بنائے جانے پر غصے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت موسم قدرے بہتر تھا ویسے بھی سورج اپنی منزل پر پہنچنے کو تھا سو گرمی کی تیزی میں کمی ہوئی تھی کچھ ہلکی ہلکی چلتی ہوا نے اور کچھ دیر پہلے آنے والے ریحان کے میسج نے اس کے موڈ کو بہت ہی خوشگوار بنا دیا تھا، اس نے لکھا تھا۔

ساتھی! میرے لب پہ
اک مسکان نے ڈیرا ڈال لیا
جب سے یہ معلوم ہوا
میری سوچ پہ، میرے نام پہ
اس کے لب مسکاتے ہیں

میسج پڑھ کے مفرا کے لبوں پہ بھی ایک دلکش مسکراہٹ آ سجی تھی اس نے ہلکی آواز میں میوزک لگا لیا اور جو کپڑے استری کرنا رہ گئے تھے وہ اٹھا کر استری سٹینڈ کے پاس آ کھڑی ہوئی، اظہر کرکٹ میچ کھیلنے گیا ہوا تھا اور رفیق صاحب اپنے کمرے میں مطالعہ میں گم تھے، اظہر عام طور پر تو پینٹ شرٹ ہی پہنتا تھا لیکن کچھ قمیض شلوار بھی خاص طور پر بنواتا تھا اور عام طور پر جمعہ کی نماز پڑھنے انہی کپڑوں میں جاتا تھا لیکن وہ ہمیشہ سفید رنگ کے سوٹ سلواتا تھا موسم چاہے کوئی بھی ہوتا یہ اس کا فیورٹ کلر تھا اور اس پر سوٹ بھی بہت کرتا تھا یہی سب سوچتے ہوئے وہ قمیض سیدھی کرنے لگی تو اسے قمیض کی سائیڈ جیب میں کچھ محسوس ہوا ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذ آ گئے نکال کر دیکھا تو وہ کچھ تڑے مڑے نوٹ تھے جو سوٹ دھلنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے چپک کر اکٹھے ہو گئے تھے۔

''کتنی بار کہا ہے دھونے سے پہلے کپڑوں کی جیب چیک کر لیا کرو لیکن اس کا دماغ پتا نہیں کہاں رہتا ہے کچھ سنتی ہی نہیں۔'' پیسوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی مفرا غصے سے بڑبڑائی اس نے گن کر دیکھے وہ دو سو چالیس روپے کے نوٹ تھے جواب یقیناً ضائع ہو چکے تھے اس نے وہ پیسے استری سٹینڈ کی سائیڈ پر رکھ دیے اور کچھ سوچتے ہوئے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

''آپی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں میں نے بتایا بھی تھا کہ آج مجھے جلدی جانا ہے۔'' اظہر کالج کے تیار ہو کر آیا تو مفرا کو رات کے کپڑوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''تم جاؤ آج مابدولت کا چھٹی کا موڈ ہے۔'' مفرا اس کے لئے ناشتہ نکالتے ہوئے بولی۔

''خیریت تو ہے بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔'' اخبار پڑھتے رفیق صاحب نے پریشانی سے اپنی بیٹی کے چہرے پر نظریں دوڑائیں وہ بلاوجہ چھٹی نہیں کرتی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ابو بس آج تھوڑا کام بھی ہے گھر میں اور جانے کا موڈ بھی نہیں ہو رہا۔'' اپنے ابو کی پریشانی محسوس کر کے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''چلو جیسے ہماری بیٹی کا موڈ بنے۔'' رفیق صاحب بھی مسکراتے ہوئے جواب دے کر ایک بار پھر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے، ان دونوں کے جانے کے بعد میوزک آن کر کے اس نے ایک میگزین اٹھا لیا اور صوفے پر لیٹتے ہوئے میگزین کھنگالنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی بور ہو کر سائیڈ پر رکھ دیا اور پھر آنکھیں بند کر کے سکون سے لیٹ گئی ادھر ادھر کی باتیں سوچتی جانے کب وہ غنودگی میں چلی گئی بلکہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ

رہی تھی خواب میں اچانک عجیب سا شور ہونے لگا اور وہ شور آخر اتنا بڑھا کہ سوتی جاگتی مفرا کی نیند کی وادی سے کھینچ لایا پہلے پہل تو اسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی جب سمجھ آئی تو دروازے کی طرف دوڑی زرینہ جانے کب سے دروازہ بجا رہی تھی، زرینہ کے پاس گھر کی ایک چابی تھی کیونکہ جب تک وہ آتی تب تک مفرا سکول جا چکی ہوتی تھی اس لئے اسے یہ چابی دی گئی تھی تاکہ وہ آ کر اپنا کام کر جایا کرے لیکن آج چونکہ مفرا گھر پر تھی تو اس نے اندر سے دروازہ لاک کر رکھا تھا اس لئے زرینہ چابی کی مدد سے اندر نہ آ سکی تھی اس کی دستک کی آواز ہی مفرا کو نیند سے باہر لائی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں باجی میں کب سے دروازہ بجائے جا رہی ہوں اب تو میں واپس جانے کا سوچ رہی تھی۔'' مفرا اس کی بات کا جواب دیے بنا اندر کی طرف مڑ گئی تو زرینہ بھی باہر کا دروازہ بند کرتی اس کے پیچھے آئی۔

''باجی کا موڈ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔'' اسے مفرا کا رویہ کھٹک رہا تھا۔

''کوئی تو بات ہے کہ باجی نے جواب تک نہیں دیا۔'' اندازے لگاتی زرینہ مفرا کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔

''باجی آج آپ سکول نہیں گئیں؟'' اس نے پھر بات کرنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہی۔

''آج کچھ کام ہے، تم یہ بتاؤ تمہارا بیٹا کیسا ہے؟''

''جی...... جی وہ بہتر ہے اب تو۔'' مفرا کے چبھتے ہوئے لہجے پر وہ تھوڑا سا جھجک کر مگر اب بھی جھوٹ بول رہی تھی ڈائریکٹ کچھ کہنے کی بجائے مفرا نے دو چار باتوں میں اسے جتا دیا تھا کہ وہ اس کا جھوٹ جان چکی ہے، زرینہ چپ چاپ اس کی بات سنتی رہی اور پھر اسی خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

''اچھا باجی اب میں چلتی ہوں۔'' دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی وہ مفرا کے کمرے میں آئی۔

''ادھر آؤ...... یہ پکڑو پیسے۔''

''یہ کون سے پیسے ہیں باجی؟''

''یہ وہ پیسے ہیں جو تم نے کپڑوں کے ساتھ دھو دیئے ہیں اور اب میرے تو کسی کام کے نہیں رہے اپنے بچوں کو دے دینا کھیل لیں گے ان سے۔'' مفرا نے غصہ دباتے ہوئے وہ پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیے جو اظہر کی جیب سے نکلے تھے۔

''اور ہاں سنو اگر تمہارا کام کرنے کا ارادہ ہے تو آئندہ یہ سب نہیں ہونا چاہیے ورنہ مجھے بتا دو ویسے بھی میری دوست اپنی کام والی کی بہن کو میرے پاس رکھوانا چاہ رہی ہے۔'' اس نے جاتی ہوئی زرینہ سے کہا تو وہ کچھ بھی کہے بنا دروازہ پار کر گئی۔

''چینی اور سرخ مرچ دے دو اور ہاں ہلدی آ گئی ہے کیا؟'' زرینہ نے جلدی جلدی گاہک نمٹاتے دکاندار سے سوال کیا۔

''وہ تو پرسوں ہی آ گئی تھی بتایا تو تھا تمہارے میاں کو۔''

''اچھا...... وہ شاید مجھے بتانا بھول گیا ہو گا۔''

''اچھا بھائی جلدی سے میرا سامان تول دو ذرا جلدی میں ہوں۔'' مفرا کے گھر سے نکلتے ہی زرینہ نے اس چھوٹے سے بازار کا رخ کیا تھا جہاں سے وہاں کے لوگ ضرورت کی چیزیں لیا کرتے تھے، وہیں کریانے کی واحد دوکان مفرا کے ایک رشتے دار کی تھی زرینہ اسی دکان پر پہنچی تھی۔

"کتنا کتنا تول دوں؟" دکاندار نے چینی تولتے ہوئے زرینہ کی طرف دیکھا۔
"ہلدی تو تھوڑی ہی چاہیے باقی کی دو چیزیں اتنی اتنی تول دو کہ ڈھائی سو میں سب آ جائے۔" زرینہ نے اطمینان سے جواب دیا دکاندار نے اس کا سامان اسے تھمایا تو اس نے جیب سے نکال کر ڈھائی سو روپے اس کے حوالے کر دیے جس میں دو سو چالیس روپے وہی تھے جو مفرا نے اسے دیئے تھے دس روپے اس نے اپنی طرف سے ملا دیئے۔
"ارے یہ کیسے پیسے ہیں یہ تو دھلے ہوئے ہیں پتا نہیں چلتے بھی ہیں کہ نہیں۔" نوٹوں کی حالت دیکھ کر دکاندار نے منہ بناتے ہوئے کہا اور پیسے واپس اس کی طرف بڑھا دیئے۔
"ارے چلیں گے کیسے نہیں، مفرا باجی نے دیے ہیں مجھے اگر چلتے نہ تو مجھے دیتیں کیا؟" مفرا کا نام سن کر دکاندار نے خاموشی سے پیسے رکھ لئے مفرا اور اس کے خاندان کو وہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا پھر دور رشتے میں اس کی کزن بھی لگتی تھی، زرینہ مسکراتی ہوئی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

اگلے ہی دن زرینہ کا ماما گھر کا کچھ سامان لینے اسی دکان پر پہنچ گیا۔
"کیسے ہو چاچا جی؟" دکاندار جس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی دبلے پتلے جسم اور گہرے سانولے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں لئے وہ ایک چوکنا بلکہ چالاک قسم کا انسان دکھائی دیتا تھا دو نمبر مال اصل قیمت پر بیچ کر خوب کمائی کر رہا تھا۔
"ٹھیک ہوں بشیر پتر یہ چیزیں لکھی ہیں پرچی پر ذرا یہ سامان دے دے آج بڑے مہمان آ رہے ہیں تیری بہن کو دیکھنے۔" بشیر کو پرچی پکڑاتے ہوئے اس نے راز داری سے خاص بات بتائی۔
"واہ چاچا یہ تو بڑی خوشی کی خبر سنائی تو نے، اللہ نسرین بہن کا نصیب اچھا کرے۔"
"آمین آمین۔" زرینہ کا ماما مسکراتے ہوئے سامان اٹھانے لگا جو اس دوران بشیر نے بڑی پھرتی سے شاپروں میں باندھ دیا تھا، بقیہ پیسے دیتے ہوئے بشیر نے دو دھلے ہوئے دو سو چالیس روپے بھی ان پیسوں میں ملا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔
زینے کے نیچے بنی جگہ پر فٹا فٹ روٹیاں پکاتی زرینہ کا ہاتھ بری طرح کانپا بچے کی چیخ سن کر وہ بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف لپکی جہاں سب سے پہلی سیڑھی پر اس کا چھوٹا بیٹا لہولہان ہوا پڑا تھا۔
زرینہ کی ساس اپنی بیٹی کی طرف گئی ہوئی تھی اور میاں کام پہ، بچے صحن میں کھیل رہے تھے ناشتے بناتے ہوئے اس کی نظر بچوں پر بھی تھی کہ کہیں کوئی شرارت نہ کر دیں لیکن سب سے چھوٹا بیٹا جانے کب نظر بچا کر سیڑھیاں چڑھ گیا لیکن کافی اوپر پہنچ کر جانے کیسے پیچھے کی طرف لڑھک گیا اور سارے زینے سے ہوتا نیچے آ گرا، زرینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل اپنے بچے کی خیریت کی دعا مانگ رہا تھا وہ تیزی سے ڈسپنسری کی طرف بڑھتے ہوئے اس وقت کو کوس رہی تھی جب اس نے چھٹی کے لئے یہ بہانہ بنایا تھا جانے کیسی گھڑی تھی جو کہا پورا ہو گیا۔

☆☆☆

"یہ لو زری بیٹے اپنے پیسے، اب ہمارا حساب برابر ہو گیا پورے پانچ سو روپے ہیں گن لو۔" زرینہ نے حیرت سے اپنے ماما کی طرف

دیکھا جس نے کئی مہینے پہلے اس سے ادھار لیا تھا اور جس کا واپس کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اب اچانک اسے پیسوں کی واپسی کا خیال کیسے آگیا تھا۔

''یقیناً نچھو کی شادی کے لئے زیادہ پیسے مانگنے کے لئے رستہ بنا رہا ہے۔'' اس نے فوراً ماما کی نیت بھانپ لی، دوسری طرف زرینہ کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے اشرف سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا اور زرینہ کے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے اسے گدگدانے لگا، بچہ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

''ارے تمہارا بیٹا تو بہت شیطان ہو گیا ہے بھئی میری داڑھی نوچ رہا ہے۔'' بچے کو دوبارہ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے اشرف نے ہنستے ہوئے زرینہ کو مخاطب کیا جو پیسے گن رہی تھی لیکن پیسے دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''کوئی جلدی نہیں ہے ماما یہ پیسے تم رکھ لو بعد میں دے دینا۔'' زرینہ نے پیسے واپس اشرف کے ہاتھ میں تھمانا چاہے لیکن اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''نا بیٹا ادھار جتنا جلدی اتر جائے اتنا اچھا ہے، بچے کے علاج کے لئے تجھے بھی تو ضرورت ہوگی نا، جیسے ہی آج کچھ پیسے ہاتھ آئے تو سیدھا تیرے پاس چلا آیا کہ یہ بوجھ اتار دوں ورنہ تو ہر روز ان پیسوں کا قصہ لے کر بیٹھ جایا کرتی ہے۔''

''ارے ماما تو برا مان گئے وہ تو مجھے بچوں کے کپڑے بنانے کے لئے ضرورت تھی تو تم سے مانگ بیٹھی ورنہ ہم کون سا پرائے ہیں مجھے تیرا اعتبار ہے میرے پیسے کہیں نہیں جاتے اب نچھو (نسرین) کی بات پکی ہوئی ہے مہمانوں کا آنا جانا لگا ہے ایسے ٹیم (ٹائم) تو تجھے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔'' زرینہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ پیسے اشرف کو واپس کردے لیکن وہ بھی آج پکا ارادہ کر کے ہی آیا تھا اس کے کچھ اور بولنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا دھیے اب میں چلتا ہوں چکر لگانا تو بھی نچھو بڑا یاد کر رہی تھی تجھے سلام بھی بھیجا ہے۔'' اشرف زرینہ کے بیٹے کو پیار کرنے کے بعد اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتا رخصت ہو گیا اور زرینہ چپ چاپ وہیں بیٹھی رہ گئی۔

اس کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی تھی اور دائیں ہاتھ کی بند مٹھی میں پانچ سو روپے کے نوٹ تھے جن میں دو سو چالیس روپے دھلے ہوئے تھے اور یقیناً کسی کام کے نہیں رہے تھے، منڈیر پر اترتی شام یہ تماشا دیکھ کر سوچ رہی تھی جس ملک میں عام لوگ ایماندار نہ ہوں وہاں حکمرانوں سے کیا امید کی جاسکتی ہے جبکہ خدا نے قرآن پاک میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جیسے لوگ ہوں گے ویسے حکمران ان پر مسلط کر دیئے جائیں گے، جو جہاں جتنی بے ایمانی کرسکتا ہے کر رہا ہے تو پھر کیسا شکوہ کیسی شکایت؟

☆☆☆

نادان جو ٹھہرا
غزالہ جلیل راؤ

فہد کی عارضی پوسٹنگ اوکاڑہ ہوئی تو اس کا قیام آپی فرزانہ کے ہاں تھا، جو اس کی خالہ زاد تھیں، اسے یہاں آئے ہوئے دو ماہ ہوئے تھے وہ جس علاقے میں رہتا تھا وہاں اونچی اونچی عمارتوں کے سائے میں کچے پکے مکان بھی نظر آتے تھے، اس پکی آبادی کے ایک طرف اور متمول اور صاحب ثروت لوگوں کی کوٹھیاں، فلیٹ اور دوسری طرف بنگلے تھے، درمیان میں ایک طرف چوڑی شفاف روڈ پر ٹریفک اور انسانوں کا بہتا ہوا سمندر، گویا امارت اور غربت ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھیں، دریا کے دو پاٹوں کی طرح الگ الگ جو ازل سے ابد تک یونہی ساحل ساحل چلتے رہیں گے، مگر ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔

فہد ہمیشہ شارٹ کٹ راستہ اختیار کرتا تھا، اس لئے سڑک کراس دوسری طرف سے آفس پہنچ جاتا، آفس زیادہ دور نہیں تھا اور اس کے خیال میں دو تین میل پیدل چلنا چاہیے، صحت کے لئے ضروری ہے۔

وہ جب بھی ادھر سے گزرتا ایک چودہ پندرہ سال کی خوب صورت لڑکی پیڑ پودوں اور گھاس کی کٹائی کرتی نظر آئی اور کبھی سرکاری کوارٹروں کے سامنے لگی بیلوں، پودوں کی کٹائی اور صفائی کرتی ملتی۔

یہ منظر وہ روز دیکھا کرتا تھا، یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگتا، زندگی سے بھرپور اور فطرت کے عین مطابق کبھی کبھی اس کے قدم لمحہ بھر کے لئے رک جاتے، وہ سر اٹھا کر اس بے پرواہ بھولی بھالی معصوم سی لڑکی کو دیکھتا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ لئے آگے بڑھ جاتا۔

کبھی وہ اکیلی ہوتی اور کبھی ایک بوڑھا شخص اس کے ساتھ ہوتا، پھر ایک دن اس نے اس راستے پہ قدم رکھا ہی تھا کہ وہ لڑکی بھاگتی ہوئی اس کی طرف آ گئی، اس وقت اس کے چہرے پر بڑی گھبراہٹ تھی، آج وہ شخص اس کے ساتھ موجود نہیں تھا، فہد اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر رک گئی، اس کی آنکھوں سے پریشانی جھانک رہی تھی۔

''کیا ہوا تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں نظر آ رہی ہو؟'' وہ ایکدم پوچھ بیٹھا۔

''میرے چھوٹے بھائی کو دیکھا ہے آپ نے صاحب جی؟''

''بھائی......!'' فہد نے حیران ہو کر دیکھا۔

''جی میرا ڈیڑھ سال کا چھوٹا سا بھائی صبح سے جانے کہاں چلا گیا ہے، کوئی پکڑ کر لے گیا اسے، وہ میرے بغیر مر جائے گا، میں اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھی، وہ کسی کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتا، اب کیا ہو گا؟'' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ٹپکنے کے لئے تیار تھے، فہد کو اس پر ترس آ گیا اور بولا۔

''بچے تو ادھر بہت سے نظر آ رہے ہیں پر تمہارے بھائی کی پہچان کیا ہے؟''

''اس کے جسم پر پیلی قمیض اور پیروں سے ننگا ہے۔'' وہ بڑی معصومیت سے فہد کو تفصیل فراہم کر رہی تھی، اتنے میں شور سا اٹھا اور کئی آوازیں ایک ساتھ گونجیں، ایک چھوٹی سی بچی جس کے پیروں چھوٹے چھوٹے گھنگھروں والی پازیب تھیں اور بچوں کی فوج اس کے پیچھے لگی تھی۔

''باجی تیرا بھائی مل گیا۔''

''کیا...... کہاں سے ملا؟'' تب اس کی نظر ایک ڈیڑھ سالہ بچے پر پڑی جو اس کے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔

''ہائے کریمو! تو کہاں چلا گیا تھا۔'' وہ

ایک دم جھکی اور اس کی پیشانی پہ منہ رکھ کر رو پڑی۔

''پاگل۔'' فہد کے لبوں سے بے ساختہ نکلا اور مسکرادیا۔

''صاحب جی میرا بھائی آ گیا ہے، اب میں جا رہی ہوں۔'' یہ ان کی پہلی ملاقات تھی، جس نے فہد کو بہت متاثر کیا تھا، اس کے بعد جب بھی وہ ادھر سے گزرتا کبھی وہ بیلوں کی کانٹ چھانٹ کر رہی ہوتی اور کبھی کچرا اکٹھا کر رہی ہوتی، فہد کو دیکھتے ہی اس کے قریب آ گئی۔

''صاحب جی آپ ادھر روز کہاں جاتے ہیں؟'' وہ بڑی بے تکلفی سے سوال کر گئی۔

''میں آفس جاتا ہوں۔''

''کدھر ہے آپ کا دفتر؟''

''ادھر بینک میں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

''اور آپ کا گھر کہاں ہے؟''

''اس طرف فلیٹ میں۔''

''اچھا میں جا رہی ہوں۔'' وہ مڑ گئی۔

''سنو۔'' فہد اس کی بے مروتی پہ کھول گیا۔

''جی!'' وہ بڑے انداز سے پلٹ کر بولی۔

''تم نے مجھے اپنا نام تو بتایا نہیں؟''

''میرا نام شہلا ہے، مگر میرا نام کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''نام کیوں پوچھا جاتا ہے تمہیں نہیں پتا؟''

''اچھا تو اپنا نام بھی بتا دیں؟'' اس نے کمال بے نیازی سے کہا۔

''کیوں؟ تم میرا نام کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''بس یوں ہی۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''آپ نے میرا نام پوچھا تو میں نے بھی پوچھ لیا۔''

''میرا نام فہد رضا ہے، تم فہد کہہ کر پکار سکتی ہو۔''

''اتنی گستاخ نہیں میں کہ نام لے کر پکاروں۔'' اس نے اک ادائے بے نیازی سے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں؟'' فہد کو اسے ستانے میں مزہ آ رہا تھا۔

''بس یوں ہی۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور قلانچیں بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی، وہ بے ساختہ ہنس پڑا، اس کے بعد آفس جاتے اور آتے وقت شہلا درخت کے نیچے بیٹھی اس کی منتظر ہوتی، جب وہ آتا تو وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوتی اور دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلنے لگتے، سامنے جب وہ بلڈنگ نظر آتی جس کے ایک فلیٹ میں وہ اپنی کزن کے ساتھ رہتا تھا، شہلا رک جاتی، دونوں مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور اپنی اپنی سمت چل دیتے۔

☆☆☆

ایک دن عابدہ اسکول کے پرنسپل صاحب کے گھر گئی، ان کی مسز نے کچھ کپڑے اور دوسری چیزیں دینے کے لئے اسے بلایا تھا، انہوں نے عابدہ کو کپڑوں کا شاپر دیتے ہوئے کہا۔

''عابدہ آگے موسم بدل رہا ہے اور شہلا اپنے باپ کے ساتھ پیڑ پودوں کی کٹائی چھٹائی میں لگی رہتی ہے، یہ گرم کپڑے جو ایک دو بار کے استعمال کیے ہوئے ہیں، پہن لے گی اور یہ بچوں کے لئے۔''

''بہت شکریہ بیگم صاحبہ! ہم غریب لوگوں کے لئے یہ کہاں ممکن کہ ہر بدلتے موسم کے کپڑے بنائیں، پیٹوں کا ایندھن ہی بہت مشکل سے بھرتا ہے، اتنی مہنگائی ہے کہ گزارہ ممکن نہیں، یہ تو آپ اتنا خیال کر لیتی ہیں، ورنہ ہر کسی کے

سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا، سر کا سائیں بیمار رہنے لگا ہے، کام بھی نہیں ہوتا، اسی لئے شہلا کو ساتھ لے کر جاتا ہے تا کہ سارا کام سکھا دے، تو اس کی جگہ وہ کام سنبھال لے گی، گھر کا نظام چلتا رہے گا۔''

''میرے لئے تو بے کار ہوتے ہیں، اگر تمہارے کام آجائیں تو میرے لئے خوشی کی بات ہے، اس سے اللہ بھی خوش ہوتا ہے اور بندہ بھی، شہلا نے میٹرک کر لیا ہے، نمبر بھی اچھے حاصل کیے ہیں، میری مانو تو آگے پڑھنے دو۔''

''شہلا کے علاوہ چھ بچے اور ہیں اور ہاشم بیمار رہتا ہے، اگر شہلا پڑھائی میں لگ گئی تو لگی بندھی تنخواہ بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی، ہاشم کہتا ہے، اپنی زندگی میں شہلا کی شادی کر دوں، اپنی زندگی میں بیٹی کو اپنے گھر کا کر دیکھ لوں، لیکن ابھی اسے بھی میں نے سمجھایا ہے بات پکی کر دی ہے اتنا ہی کافی ہے۔''

''ٹھیک ہے، مگر کسی ڈھنگ کے بندے، پڑھے لکھے بندے سے کرنا، ذرا تو سکھ اسے بھی ملے۔''

''بیگم صاحبہ ہم غریب لوگوں کو پڑھا لکھا بندہ کہاں ملے گا، ہم ٹھہرے مزدور لوگ، دہاڑی دھپہ کرنے والے، ہمارے گھر کا دوزخ ہمیں پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتا، جو وقت تعلیم پہ لگائیں گے اتنے وقت میں ایک دہاڑی کے دو تین سو روپے مل جاتے ہیں، شہلا کو بھی اس کے ابا نے اپنے شوق سے دس جماعتیں پاس کرا دی ہیں، پھر ایسا بندھن کس کام کا جو ذرا دیر کا ہو، ہم غریب اور جاہل لوگ ہیں، ہماری سوچیں، ہمارے خیال اس حد تک ہیں جس ماحول میں ہم رہتے ہیں، جس لڑکے سے ہم نے بات طے کی ہے، خاندان کا لڑکا ہے دیکھا بھالا ہے، شادی بھی ہو جائے گی، انہیں جلدی نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' مسز عمرانہ تعجب سے بولیں۔

''کیا کرتا ہے لڑکا؟''

''وہ جرنیٹر ٹھیک کرنے کا کام کرتا ہے، دو چار جماعتیں بھی پڑھا ہوا ہے، اخبار دیکھ لیتا ہے، بڑا نیک اور شریف بچہ ہے، اپنی شہلا کو بڑا سکھ دے گا۔''

''شہلا کو پسند ہے وہ؟'' عابدہ ہنس پڑی اور گہری ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''بیگم صاحبہ غریبوں کی پسند اور ناپسند کیا، پھر میری شہلا تو بڑی سمجھدار ہے، جو دیا کھا لیا، پہن لیا، کبھی ضد نہیں کی، وہ کبھی ہمارا سر نیچا نہیں کرے گی۔''

جمال واقعی ہی اچھا اور شریف لڑکا تھا، کم گو اور محنتی وہ کسی ورکشاپ پر کام کرتا تھا، کبھی کبھار اپنی خالہ کو دیکھنے چلا آتا، شہلا اور اسے بہت اچھی لگتی تھی، دو چار باتیں بھی ان کے بیچ ہو جاتی تھیں، پھر وہ چلا جاتا، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جمال ہی اس کی تقدیر کا فی الوقت مالک ہے، پھر خواب دیکھنے سے فائدہ۔

☆☆☆

پھر ایک دن اپنے راستے میں فہد کو دیکھ کر ٹھنک گئی اور فہد کو بھی قینچی ہاتھ میں لئے پودوں کی کٹائی اور کبھی گھاس پر مشین چلاتی ہوئی اس دبلی پتلی، سپید رنگت، براؤن آنکھوں والی لڑکی دل کو بھا گئی اور فہد آتے جاتے لمحہ بھر کے لئے رک کر اسے ضرور دیکھ لیتا تھا، ایک دن اس کی ریشماں کھو گئی، شہلا بولائی بولائی پھرتی رہی اور اچانک بچوں کی سی بے ساختگی سے اس سے پوچھ بیٹھی۔

''صاحب! آپ نے میری ریشماں کو دیکھا ہے؟''

بس وہ لمحے تھے جب دونوں کے درمیان

سے اجنبیت کی دیوار ہٹنے لگی، دونوں گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔

''شہلا تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، پھر تم نے مزید تعلیم کیوں حاصل نہیں کی؟''

''فہد صاحب! پڑھنا لکھنا، کالج جانا سب پیٹ بھرنے کی باتیں ہیں، جن کے گھر کا چولہا نہ جلے، پیٹ خالی ہو، اسے حال کی فکر ہوتی ہے، مستقبل کی نہیں، مانا کہ تعلیم انسان کی شخصیت کو نکھار دیتی ہے، اسے شعور دیتی ہے لیکن جن حالات میں ہم پرورش پاتے ہیں نا وہاں بچے وقت سے پہلے سمجھدار ہو جاتے ہیں اور گہری باتوں کا تعلق عقل اور حالات سے ہوتا ہے، تعلیم سے انکار نہیں مگر یہ سب ممکن نہیں صاحب جی۔''

''ہاں میں اتفاق کرتا ہوں تمہاری بات سے، مگر تعلیم اپنی جگہ، اپنی اہمیت رکھتی ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے ریلیف مل جاتا ہے اور کچھ اساتذہ بچوں کی فیس وغیرہ خود ادا کرتے ہیں، مگر شوق شرط ہے۔'' وہ مسکرایا، فہد نے غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر ہونٹوں کو سکوڑا، وہ اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا، پھر بھی اس نے کوشش کے طور پہ کہا۔

''اپنے ابا کے ساتھ کام کرتی ہوں، بلکہ کچھ وقت بعد میں ہی سارا کام سنبھال لوں گی، شوق بہت ہے لیکن میرے حالات اجازت نہیں دیتے اور کسی طرح پرائیویٹ طور پر تعلیم جاری رکھ بھی لوں تو فائدہ کیا ہوگا؟ یہاں لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ڈگریاں ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں، ایک سیٹ کے لئے ہزاروں امیدوار ہوتے ہیں اور نوکری اس کو ملتی ہے جس کی سفارش، میرٹ کا تو ڈھونگ ہوتا ہے، پھر ایسی صورت میں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ہوں ٹھیک کہتی ہو، ہمارا سارا نظام ہی بگڑا ہوا ہے اور ہم سفارش اور رشوت کے لئے مجبور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نا اہل لوگ اس سیٹ پر آ جاتے ہیں جس کے وہ اہل نہیں ہوتے۔''

''یہی تو بات ہے، لیکن غریب اور ضرورت مند لوگوں کے پاس پیسہ ہو تو اپنا چھوٹا موٹا کام نہ کر لیں اور غریبوں کی سفارش کرتا کون ہے؟''

''خیر چھوڑو ایک بات کہوں؟''

''جی صاحب!'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''دیکھو شہلا مجھے یہ صاحب جی کا لفظ اچھا نہیں لگتا، تم میرا نام لیا کرو، اچھا لگے گا مجھے۔''

''پھر کیا کہوں؟'' وہ بولی۔

''فہد۔''

''نہیں، یہ نہیں کہہ سکتی میں، یہ بے ادبی ہے۔''

''چلو یہاں تھوڑی سی بے ادبی جائز ہے۔''

''سوری، میں آپ کا نام نہیں لے سکتی۔''

''کیوں بھئی تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے ہمارا نکاح ہو گیا ہے اور میرا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''آپ باتیں بہت اچھی کرتے ہیں، اچھا یوں کریں میں آپ کو صرف آپ کہہ کر بلا لیا کروں گی۔''

''نہیں صرف فہد۔''

''فہد صاحب۔''

''آپ کو نہیں تو مجھے فہد صاحب کہنا اچھا لگتا ہے۔'' اب وہ چپ ہو گیا، پھر کہنے لگا۔

''چلو خیر تمہاری مرضی، مگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سی بات؟''

''وہی تعلیم والی۔''

''میں نے کہا نہیں کہ یہ باتیں پیٹ بھرے کی ہوتی ہیں، پڑھنا، لکھنا اور خواب دیکھنا، فہد صاحب ہم جس قدر غریب لوگ ہیں اسی قدر غیرت مند بھی ہیں، ابا بیمار رہتا ہے اور ماں کو گھر کی پریشانیوں نے بیمار کر رکھا ہے، بھائی چھوٹے ہیں، ابا ماں کا کام کرتے ہیں اور اب ان کی جگہ میں ان کا کام کرنے لگی ہوں اور فارغ وقت میں لفافے بناتے ہیں، بھائی بھی ساتھ لگ جاتے ہیں، تب کہیں روٹی ملتی ہے۔''

''یہ اتنی گہری باتیں بغیر استاد کے کیسے سیکھ لیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بہت سی باتیں سیکھنے کے لئے کسی استاد کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ ہی اسکول کالج میں پڑھنے کی، جیسے ماں کی آغوش بچے کی ابتدائی درس گاہ ہوتی ہے اسی طرح وہ ماحول اور وہ فضا جہاں بچہ پرورش پاتا ہے ایسے بہت کچھ تفویض کر دیتی ہے، انجانے میں جس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی، میں اس وقت بہت چھوٹی تھی، میں جب بچوں کو پڑھتے دیکھتی تو میرے اندر کوئی چیز باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہونے لگتی، میں الفاظ اور عبارت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی، جی چاہتا ان ساری کتابوں کو گھول کر پی جاؤں، تب رفتہ رفتہ مجھے عرفان ہوا میں پڑھ سکتی ہوں اور میں ایک نہیں دوسری کتاب بھی چند دنوں میں استاد صاحب کو سنا دی، وہ حیران ہوئے، ایک دن میرے ابا سے بولے۔''

''ہاشم تیری بیٹی جینئس ہے۔'' ابا کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا دیئے۔

''یہ تو حیرت انگیز انکشاف ہے۔'' فہد نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''پھر تو تمہیں اب تک پی ایچ ڈی کر لینی چاہیے تھی۔''

''وہ تو میں نے کر لی۔'' عابدہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ شوخی سے جواب دیا۔

''کہاں سے؟ کیسے؟'' وہ گڑبڑا کر بولا، وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی، میری پارٹ ٹائم جاب کا وقت ہو گیا ہے، خدا حافظ۔''

اور پھر وہ غزال کی طرح چوکڑی بھرتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، وہ اسے اسی طرح سوالوں کی بھول بھلیوں میں چکراتا چھوڑ جاتی تھی۔

''پارٹ ٹائم جاب؟ پی ایچ ڈی؟'' اس کی لایعنی اور بے سروپا باتوں کا مقصد اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا، یہ لڑکی ہے یا کوئی اسرار، کئی دنوں تک وہ اسے نظر نہ آئی، پھر ایک دن پارک کی گھاس کاٹتی ہوئی مل گئی اور اسے دیکھتے ہی بولی۔

''فہد صاحب! کیسے ہیں آپ؟'' وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

''شہلا! تم نے کہیں نوکری کر لی ہے؟''

''ہاں ہاں کیوں؟'' وہ کھلکھلا پڑی۔

''تم نے کسی پارٹ ٹائم جاب کا ذکر کیا تھا، کیسی نوکری ہے تمہاری؟''

''کیا کریں گے پوچھ کے فہد صاحب، اب کیا ہمیں خوش ہونے کا بھی حق نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''ارے ارے تم تو سیریس ہو گئیں، ضرور خوش ہو، ہر انسان کو خوش ہونے کا حق ہے، بلکہ میری دعا ہے کہ تمہارے خوبصورت شنگرفی لب ہمیشہ مسکراتے رہیں، تمہاری ان آنکھوں کی چمک کبھی ماند نہ پڑے۔''

''شکریہ۔''

''اچھا اب زیادہ کسر نفسی سے کام نہ لو، سیدھے سیدھے بتاؤ تم اس دن پارٹ ٹائم جاب کا بہانہ بنا کر کیوں بھاگ گئی تھیں؟''

''نہیں فہد صاحب، بہانہ نہیں حقیقت تھی وہ۔'' وہ مسکرا دی۔

''اصل میں اس وقت گھر والوں کی چھٹی ہوتی ہے اور میری ڈیوٹی شروع ہو جاتی ہے، اماں کھانا بناتی ہے، ابا صحن میں بیٹھ کر چڑیوں کو روٹی ڈالتے ہیں، بھائی کھیلنے نکل جاتے ہیں اور میں بیٹھ کر اپنے حصے کے لفافے بناتی ہوں، جب تک گھر کے سارے لوگ مل کر کام نہ کریں تو گزارا کیسے ہو۔'' فہد نے ایک گہرا سانس کھینچا اور اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولا۔

''شہلا تم میں خداداد صلاحیتیں ہیں، اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لیتیں اور پرائیویٹ طور پر بی اے کیا ایم اے کر لیتیں تو میں تمہیں کہیں نوکری دلوا دیتا۔'' وہ ہنس کر کہنے لگی۔

''اگر مجھے آپ کے آنے کا پتا ہوتا کہ کوئی خضر راہ ادھر سے گزرے گا تو یقیناً ایسا کر لیتی پھر مشکل کیا تھی فہد صاحب، جب سے میں نے کتابوں کی دنیا میں پناہ لی ہے میں نے اپنے اندر توانائی اور سکون محسوس کیا ہے، لیکن جب میں نے قلم ہاتھ میں پکڑا تو میں ایکدم کانپ گئی، ہاتھ لرزا اور قلم چھوٹ کر زمین پر گر پڑا، میں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی، یہ بہت بڑا منصب تھا اور میرے راستے، میری سوچیں، میری دنیا بہت محدود تھی، میں اس سے منافقت اور ناانصافی نہیں کر سکتی تھی، میرے سامنے میری ماں تھی، میرا افلاس زدہ اور بیمار باپ تھا، میرے جاہل چھوٹے اور کمزور بھائی تھے اور میرا غریب اور محنتی منگیتر تھا، مجھے اسی حصار میں رہنا تھا، اسی دنیا میں جینا تھا، پھر میں ان پر برتری حاصل کر کے کیسے انہیں شرمسار کر دیتی اپنی سوچوں میں انقلاب برپا کر دینے کا مطلب یہ ہوا کہ میں ان سے منکر ہو جاتی، اپنا کعبہ الگ بنا لیتی، اپنی دنیا الگ بسا لیتی، پھر تو میرے پر لگ جاتے اور...... اور میرے والدین اور بھائیوں کا کیا بنتا؟'' وہ خاموش ہوئی تو فہد بولا۔

''ارے واہ، تم تو گہرائی کا سمندر نکلیں، اب اتنی بھی کیا پیش بندیاں، میرا خیال ہے، یہ محض تمہارا کمپلیکس تھا ورنہ ایسا ہوتا نہیں ہے، تعلیم تو انسان کے لئے صحیح سمتوں کا تعین کرتی ہے۔'' اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر جس معاشرے جس طبقے کی لڑکی ہوں، وہاں یہ سب کچھ سوچنا جرم ہے۔''

''میں اپنے گھر والوں کو کسی خوف کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔'' وہ یہ سوال کہہ کر چلی گئی۔

فہد کے اندر بے نام سا اضطراب کروٹیں لینے لگا، شہلا دھیرے دھیرے اس کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ سوچتا رہتا اس کی باتیں حقیقت سے کتنی قریب ہوتی ہیں، کسی دانشور کی طرح، اس کی دلیلوں کو جھٹلانا کتنا مشکل ہوتا ہے، اسے تو کسی مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہونا چاہیے تھا، مگر قدرت کے کھیل بھی عجیب تھے، ذہانت اور فطرت یہ اس نے چھاپ نہیں لگائی، اس کا ابر کرم جس طرح محلوں پر برستا ہے اسی طرح غریب کی جھونپڑی بھی اس کے فیض و کرم سے محروم نہیں رہتی۔

☆☆☆

ایک دن اس نے چاکلیٹ کے کئی خوب صورت پیکٹ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہے تو شہلا نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''میں اجنبیوں سے تحفے نہیں لیتی۔''
''اچھا جی۔'' فہد ایک دم بھڑک اٹھا۔
''اگر ہم اجنبی ہیں تو پھر ملتی کیوں ہو مجھ سے؟'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''بس یہی تو سننا چاہتی تھی فہد صاحب، میں کبھی کبھی خود سے یہ ہی سوال کرتی ہوں کہ آپ کون ہیں میرے، میں کیوں ملتی ہوں آپ سے؟'' فہد ہنس پڑا۔
''ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ لڑکی ہو یا الجبرا کا کوئی سوال جو حل ہونے میں نہیں آتا، میں حساب میں ہمیشہ زیرو رہا ہوں، خدا کے لئے اب مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا، لو پکڑو اسے۔'' فہد نے جھنجھلا کر پیکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے جو بے تحاشا ہنسے جا رہی تھی۔
''آپ غصے میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔'' اس نے چاکلیٹ کترتے ہوئے کہا، پھر دونوں دوختوں کے نیچے نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔
''اچھا بتاؤ، اپنے سے جو سوال کرتی ہو اس کا جواب ملا تمہیں۔'' وہ چپ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''اور آپ کیوں ملتے ہیں مجھ سے؟'' اس نے سوال پر سوال کر دیا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، فہد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تم مجھے اچھی لگتی ہو، تمہاری باتوں میں مجھے سچائی اور معصومیت نظر آتی ہے، تم سے مل کر مجھے تسکین ملتی ہے، اب تم اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' وہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ بولی۔
''فہد صاحب! حقیقت کی اس تلخ نگری میں پیدا ہوئی، جہاں سارے موسم اپنے سچے روپ میں برستے تھے، زندگی با بجولاں تھی کہ اسے اوپر دیکھنے کی سکت نہ تھی، رنگ اور شفق تو آسمان سے اترتی ہے نا، ہماری جھولی میں تو اتنے سوراخ تھے کہ کوئی رنگ بھی نہ ٹھہرا، تو پھر میں کس بنا پر چھوٹی آس بندھاؤں اپنے آپ کو؟ کیوں خواب دیکھوں، یہ بھی صحیح ہے کہ آپ سے باتیں کر کے اپنا دل ہلکا کر لیتی ہوں، آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟'' وہ مسکرائی۔
''چلیں تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیں، دوست اگر درد آشنا نہ ہوا تو پھر کون ہو گا؟'' شہلا نے ہنس کر کہا، فہد نے غور سے اس کے مسکراتے چہرے کا جائزہ لیا۔
''تو تم نے اعتراف کر ہی لیا آخر کہ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو۔''
''اب آپ کوئی دفعہ لگا دیں مجھ پر۔''
''میں تو نہیں لگاؤں گا، مگر یہ دنیا والے ضرور دفعہ لگا دیں گے، آخر ہم لوگ جو گھنٹوں کبھی درخت کے نیچے کبھی پارک میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں، تمہارے بابا، تمہاری برادری والے انہیں دیکھتے کیا؟''
''انہیں مجھ پر اعتماد ہے، وہ مجھے جانتے ہیں۔''
''اور تمہارا منگیتر؟''
''وہ تو بہت سیدھا اور بے ضرر انسان ہے، مجھے لڑکی نہیں دیوی سمجھتا ہے۔'' وہ قہقہہ لگا کر بولی۔
''اور تم اسے کیا سمجھتی ہو؟''
''تقدیر کا ایک فیصلہ۔''
''یہ تم نے کیسے کہہ دیا، جس طرح انسان موت سے بے خبر ہوتا ہے اس طرح اپنے کل سے بھی، کون جانے لمحہ بھر میں کیا ہو جائے۔''
''وہ تو درست ہے پر میرا خیال ہے اللہ میاں جی ماں باپ کے اختیار اور معاشرے کو

دیکھ کر ہی لڑکی کی تقدیر بناتے ہیں، یہ تو محض کہانیاں ہی ہوتی ہوں گی کہ کوئی بھکارن بادشاہ کے محل کی زینت بنے گی، ورنہ عام زندگی میں ایسا نہیں ہوتا، بھلا مخمل میں بھی ٹاٹ کا پیوند اچھا لگا ہے اور جو چیز بے جوڑ ہو، غیر فطری ہو، اچھی نہ لگے اس کی طلب، اس کی آرزو کیا معنی؟ اگر مل بھی جائے تو راس نہیں آتی روگ لگانے سے فائدہ؟'' شہلا کی آواز کچھ گھٹ سی گئی تھی، جیسے کوئی چیز حلق میں اٹک گئی ہو، وہ چپ ہو گئی، فہد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''دلیلوں میں تو تمہارا جواب نہیں، بہت گہری اور سمجھداری کی باتیں کرتی ہو۔''

''شکریہ۔'' ایک اداس سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر نکل گئی، اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''فہد صاحب ان کتابوں نے تو مجھے باہر کی دنیا روشناس کرائی تھی، مگر خود میری شناخت بھی کرا دی کہ میں کیا ہوں، مجھے کیا ہونا چاہیے یا میری خواہشوں کی حد کتنی ہے؟''

''کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم وہ نہیں جو نظر آتی ہو۔'' فہد نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک پڑی۔

''تم نے اپنا آپ مجھ سے چھپایا ہوا ہے۔'' فہد گہری گہری نظروں سے اس کو دیکھ کر بولا۔

''نہیں فہد صاحب!'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''میں بھلا کیا چھپاؤں گی، میرے پاس کیا ہے، میں تو آپ کے سامنے کھلی ہوئی کتاب ہوں۔''

''غلط۔'' فہد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم کھلی کتاب نہیں بند کتاب ہو، جس کا گرد پوش نہایت مضبوط اور خوب صورت چڑے کا ہے۔'' وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''چلیں یہی سہی، میں آپ کی ذہانت کی قائل ہوں۔'' پھر وہ کھڑی ہو گئی۔

''اچھا اب میری ڈیوٹی ختم، خدا حافظ۔'' وہ حسب عادت دوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور فہد کچھ اداس سا اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا، دسمبر شروع ہونے والا تھا تب ہی اس کے گھر والوں کی طرف سے پتا چلا کہ اس کی شادی کی ڈیٹ رکھ دی گئی ہے، یہ تمام پروگرام فہد کے علم میں تھا، چھ ماہ کی عارضی سروس کا پریڈ بھی ختم ہو رہا تھا اور لاہور اس کی سروس کا انتظام بھی ہو گیا تھا، یہ تمام مرحلے ایک کے بعد ایک چلے آ رہے تھے اور وہ اس چیز کو سمجھ رہا تھا، کہ اپنے جانے کی اطلاع کسی ایک کے لئے بھی خوشخبری نہیں تھی، نہ اس کے لئے نہ شہلا کے لئے، وہ اپنے کو کتنا ہی بہادر اور خود اعتماد کیوں نہ کہے مگر اندر سے وہ بھی موم کی طرح پگھلنے والی نازک جذبات و احساسات کی ایک عام سی لڑکی ہے۔

''یہ ملنے اور مل کر بچھڑنے والی کیفیتیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔'' اس نے سوچا۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں بھائی بالٹی میں چونا ڈالے گھر کی دیواروں پر سفیدی پھیر رہے تھے، اس کا باپ اردگرد پھیلی ہوئی خودرو پھولوں کی بیلوں کو تراش رہا تھا، اس کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی مگر درد میں ڈوبی ہوئی، وہ جانتا تھا یہ سارے اہتمام سردیوں کے آغاز کے تھے، وہ مڑا تو شہلا کا سامنا ہو گیا۔

''کیا دیکھ رہے تھے آپ کھڑے ہوئے؟''

''بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں تمہارے گھر۔'' وہ ہنسا تو شہلا اداس ہو گئی۔

''ہاں فہد صاحب! آپ اسے تیاری کہہ سکتے ہیں، یہی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو ہمیں زندگی کا احساس دلاتی ہیں کہ اسی جیتی جاگتی دنیا میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے، آخر نئے موسم تو ہمارے گھر بھی آئیں گے نا۔''

''کیوں نہیں آئیں گے، جم جم آئیں گے، سورج کی روشنی کو کس نے روکا ہے، بدلتے موسم، گھر گھر خوشیاں بانٹنے کے لئے ہی تو آتے ہیں، اچھا شہلا آج مجھے کچھ کام ہے، خدا حافظ۔'' وہ چلا گیا۔

جانے کیوں وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا، کئی دن گزر گئے، فہد نہیں آیا، وہ روز درخت کے نیچے بیٹھی راستے پر نظریں جمائے اس کی منتظر رہتی، ان جگہوں پہ دیکھ آتی جہاں دونوں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے، وہ سخت بے چینی محسوس کرنے لگی، وہ کس سے اس کا پتا پوچھتی، اس کا پتا پھر خود اپنی بے تابی پر شرمندہ ہو کر سوچنے لگتی۔

''وہ میرا کون ہے؟''

''آخر کیوں؟'' وہ پریشان ہو جاتی اور تھک کر درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔

''ہیلو شہلا! کیسی ہو؟'' وہ اچانک سامنے آ گیا، وہ کھل اٹھی، جیسے گلشن میں بہار آ گئی ہو، دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''کہاں چلے گئے تھے فہد صاحب!'' اس کے لہجے میں صاف اضطراب چھلک رہا تھا۔

''ابھی تو نہیں گیا، مگر اب تم سے رخصت ہونے آیا ہوں۔''

''کیوں؟''

''گھر جا رہا ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''دراصل میں چھ ماہ کی عارضی سروس پہ آیا تھا، وہ معیاد پوری ہو گئی اور وہاں نوکری بھی مل گئی ہے، مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا ہے۔'' وہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔

''مجھے یاد کرو گی؟'' فہد تھوڑا سا جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''نہیں۔'' اس نے سر جھکا لیا۔

''بڑی بے مروت ہو۔'' وہ مسکرا دی۔

''پردیسوں سے زیادہ کوئی بے مروت نہیں ہوتا فہد صاحب۔''

''نہیں شہلا ہم پردیسی ضرور ہیں مگر بے مروت نہیں، دوستوں کو کبھی نہیں بھلاتے۔'' وہ مسکرایا۔

آج وہ بالکل خاموش تھی، ذرا بھی شوخی شرارت اس کے کسی انداز سے ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

''شہلا مجھے وہ بہادر اور عالمانہ باتیں کرنے والی لڑکی بہت یاد آئے گی، حالانکہ میں جانتا ہوں وہ بالکل بہادر نہیں، وہی عام سی کاکروچ سے ڈر جانے اور ذرا سی ٹھیس سے بکھر جانے والی لڑکی ہے۔'' فہد نے سرگوشی کی، شہلا نے سر اٹھا کر شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کبھی اپنے اندر بھی جھانک کر دیکھا ہے آپ نے؟''

''ہاں دیکھا ہے۔'' وہ ہنس پڑا اور جگنوؤں کی طرح جگمگاتی نظروں سے اس کو دیکھ کر بولا۔

''دل میرا گلشن، گلشن۔'' وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

''باتیں تو بڑی اچھی کر لیتے ہیں آپ، بے وقوف بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔''

''نہیں شہلا بخدا جو محسوس کرتا ہوں وہی کہتا ہوں۔'' وہ اسی طرح مسکرا کر بولا۔

''اور تم جیسی لڑکی کو بے وقوف بنانا آسان

کام نہیں۔"

"اچھا اور کیا کیا محسوس کرتے ہیں آپ، وہ بھی کہہ دیجیے۔"

"نہیں شہلا اب کچھ نہیں کہوں گا، مجھے تمہاری وہ بات بہت پسند آئی تھی، جب ایک بار تم نے کہا تھا کہ اولاد پر ماں باپ کا بڑا حق ہوتا ہے، اتنا کہ زمین و آسمان کے خزانے مل کر بھی ادا کرنا چاہیں تو حق ادا نہ ہو، پھر اگر کوئی اجنبی لڑکی اسے ماں سے چھین کر اس کے حقوق پامال کر ڈالے تو زمین و آسمان گردش میں آجاتے ہیں، چنانچہ میں وہ لڑکی بننا نہیں چاہتی۔"

"یہ بات تم نے تذکرۃً کہی تھی، مگر میں نے تمہاری عظمت کا اسی وقت اعتراف کر لیا تھا، یہ سچ ہے شہلا کہ خاندان اور معاشرہ اپنی قدروں اور اصولوں کی بنیاد پر زندہ رہتا ہے، یہ دوریاں اور تڑپ کچھ عرصے کی آزمائش ہوتی ہیں، اس کے بعد آہستہ آہستہ صبر آجاتا ہے، مگر تمام زندگی الاؤ میں جلنے سے بچ جاتی ہے اور حقوق پر بھی آنچ نہیں آتی، ایسا ہی مرحلہ میرے سامنے بھی آ گیا ہے، شاید میں واپس نہ آؤں، میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے شہلا، حوصلہ، اعتماد، قناعت پسندی، صبر اور ایثار کے انداز، زندگی کی اس طویل مسافت میں تمہیں بھی ایک ہم سفر کی ضرورت ہے، مجھے یقین ہے تمہارے راستے میں پیچ و خم نہیں آئیں گے، ایک صاف ستھری زندگی تمہاری منتظر ہو گی اور میری پرخلوص دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

شہلا کا چہرہ ضبط سے تمتما رہا تھا، سینہ بوجھل تھا، آنکھیں پتھرا سی گئیں، مگر ہونٹوں پہ اب بھی مدھم سی مسکراہٹ لرز رہی تھی، فہد نے آہستہ سے اس کا شانہ چھوا۔

"گھر جا کر تھوڑا سا رو لینا دل ہلکا ہو جائے گا اور دیکھو اچھی لڑکی قدموں کے نشان مٹاتی جانا، خدا حافظ۔" فہد تیزی سے مڑ کر چلا گیا اور شہلا کی آنکھیں دھندلا گئیں، وہ رات بے اماں تھی، بے پناہ تھی۔

اور وہ جیسے پتھر کی بے جان مورتی، خاموش

اور سیاکت، اپنے بستر پہ لیٹی چھت کی کڑیاں گن رہی تھی، مسکراہٹیں اجنبی کے پاؤں میں لپٹی چلی گئی تھیں، آنسو کہیں اندر ہی اندر ضبط کی تپش سے خشک ہو گئے تھے، زندگی کی تلخیوں کو تو اس نے ہمیشہ قہقہوں میں اڑاما۔

''ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے کہا۔

''میں جن راستوں پہ ازل سے اتاری گئی ہوں، وہی میری منزل ہے۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

''پندرہ سال جس کی چاندنی میں آنکھ مچولی کھیلتی آئی ہوں، اسی چاند سے تو میری پرانی شناسائی ہے جو ہمیشہ کی طرح یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے آسمان پر بڑے آرام سے بادلوں کے سنگ دوڑتا ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلتا نظر آتا ہے، جب چاہا اس کے چہرے پر بادلوں نے نقاب ڈال دی، جب چاہا کھینچ لی، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اپنے بچپن کے ان بے زبان ساتھیوں اور ان راستوں کو بھول جاتی، مگر شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ یہ حادثہ مجھ پر سے گزر رہا ہے، میں اپنے آپ کو سمیٹ رہی ہوں، سنبھال رہی ہوں کہ مجھ پر بھلانے کا الزام نہ آ جائے۔'' بہت دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی، کچھ ہی دیر میں ہر طرف اذان کی آواز گونج رہی تھی، وہ اٹھی اور نماز پڑھنے کا ارادہ کیا، وہ کمرے سے نکلی تو دھند نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور درختوں کی ٹنڈ منڈ شاخوں سے اوس کے قطرے بارش کی بوندوں کی طرح گھر رہے تھے، ٹپ ٹپ اور کچھ قطرے ننگی شاخوں کے بدن سے لپٹے ہوئے تھے۔

ایک دم اسے اپنا آپ بھی ایک خزاں رسیدہ پتا ہی لگا، جو مرجھایا ہوا تھا۔

اس کے اندر کوئی غنچہ نہ چٹکا نہ کسی جذبے نے گدگدایا، جب یہ خزاں کا موسم اپنے اختتام کو پہنچے گا اور بہار کا موسم اس کے آنگن میں قدم دھرے گا تو اس کے کہکشاں سے آنچل میں ٹانکنے کے لئے اس کے پاس ایک مسکراہٹ بھی نہیں، بہار کے سارے پھول تو مرجھا گئے، وہ سارے موسم کہاں چلے گئے جنہوں نے اسے جینا سکھایا اور وہ حقیقتوں کی انگلی تھامے وقت کے بہاؤ سے نکل آئی تھی، پھر اب یہ مخالف لہریں اسے کیوں متزلزل کر رہی ہیں۔

''دیکھو اچھی لڑکی قدموں کے نشان مٹاتی جانا۔'' کہیں سے سرگوشی ابھری۔

''ہاں، نقش قدم تو مٹنے کے لئے ہی ہوتے ہیں فہد صاحب، وقت کی گردانیں کب زندہ رہنے دیتی ہیں۔'' وہ نل کی طرف بڑھی اور اپنی جلتی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگی، مگر آنکھوں میں جلن اور بڑھ گئی۔

وہ پلٹی اور کمرے میں آ گئی، اپنی چارپائی پر لیٹ کر چہرہ لحاف سے ڈھانپ لیا، آنکھوں پر تو پہرے بٹھا دیئے تھے کہ خبردار ایک آنسو بھی نہ ٹپکے، مگر دل پہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ اسی طرح ننھے بچوں کی طرح مچل رہا تھا، رو رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور سینے کی دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا کہ اس نے کیوں اپنی بہادری اور خود اعتمادی کا یہ ڈرامہ رچایا، کیوں گوشت پوشت کے اس نازک سے وجود پر اتنا ظلم ڈھایا، کیوں...... کیوں؟ اور وہ ہونٹ بھینچے بند پلکوں سے اس کے رونے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہی تھی، جانتی تھی کہ کب تک روئے گا، آخر خود ہی تھک کر چپ ہو جائے گا، بہل جائے گا، نادان جو ٹھہرا۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

''القرآن''

قرآن کریم کا ایک نام ''الذکر'' بھی ہے۔ یہ نام اکیس آیات میں ذکر ہوا ہے مثلاً ''ہم نے تیرے پاس ذکر اتارا ہے یعنی قرآن۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ کلام سننے اور پڑھنے سے صاحب کلام کے ساتھ دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کا شوق بڑھ جاتا ہے اور صاحب کلام جب دیکھتا ہے کہ فلاں شخص میرا کلام پڑھ رہا ہے یا سن رہا ہے تو وہ اس سے بہت زیادہ خوش ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنا دوست اور محبوب بنا لیتا ہے۔

قرآن کریم کسی بشر کا کلام نہیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کسی اور ذکر سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا تلاوت قرآن کریم سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث قدسی میں آیا ہے۔

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو قرآن پڑھنے پڑھانے، میرا ذکر کرنے اور مجھ سے سوال و دعا کرنے نے مشغول کر لیا ہو تو اسے اس سے زیادہ دوں گا، جو مانگنے والے کو دیتا ہوں اور اللہ کے کلام کی عظمت باقی کلاموں سے اتنی زیادہ ہے، جتنی اللہ کی عظمت اس کی مخلوق پر ہے۔

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

''احادیث مبارکہ''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ اکرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ۔

''میری امت پر وہ وقت آنے والا ہے جب دوسری امتیں اس پر ٹوٹ پڑیں گی کہ جس طرح کھانے والے لوگ دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔''

کسی کہنے والے نے کہا کہ ''جس زمانہ کا آپ حال بیان فرما رہے ہیں اس زمانہ میں کیا ہم مسلمان اتنی کم تعداد میں ہوں گے کہ ہم کو نگل لینے کے لئے قومیں متحدہ ہو کر ٹوٹ پڑیں گی؟''

آپؐ نے فرمایا ''نہیں، اس زمانہ میں تمہاری تعداد کم نہ ہو گی بلکہ تم بہت بڑی تعداد میں ہو گے لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جاؤ گے اور تمہارے دشمنوں کے سینہ سے تمہاری ہیبت نکل جائے گی اور تمہارے دلوں میں پست ہمتی گھر کر لے گی۔''

''ایک آدمی نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! یہ پست ہمتی کس وجہ سے آئے گی؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ'' اس وجہ سے یہ ہو گی کہ تم (آخرت سے محبت کرنے کے بجائے) دنیا سے محبت کرنے لگو گے اور (خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو کے بجائے) موت سے بھاگنے اور نفرت کرنے لگو گے۔'' (ابو داؤد، ثوبان)

ریحانہ احمد، سکھر

اللہ کا فضل

ایک سخی عورت اُم جعفر جس راستے سے گزرتی تھیں اس پر بیٹھے ہوئے دو اندھے فقیر صدا لگایا کرتے تھے۔ ایک کی صدا تھی۔

''الٰہی! مجھے اپنے فضل و کرم سے روزی عنایت کر۔''

دوسرا کہتا۔

''الٰہی! جعفر کا بچا ہوا مجھے بھی ملے۔''

اُم جعفر اللہ کا فضل طلب کرنے والے کو درہم اور اپنا نام لینے والے کو ایک بھُنی ہوئی مرغی میں دس دینار رکھ کر دیا کرتی تھی۔

پہلا اندھا اپنی مرغی دو درہم میں دوسرے اندھے کے ہاتھ بیچ دیا کرتا تھا۔ ایک روز اُم جعفر نے اپنا نام لینے والے اندھے سے کہا۔

''کیا تجھ کو ہمارا فضل یعنی سو دینار نہیں ملے؟''

اندھے نے کہا۔

''مجھے تو ایک مرغی ملا کرتی تھی جسے میں اپنے دوست کے ہاتھ دو درہم میں بیچ دیا کرتا تھا۔''

اُم جعفر نے کہا۔

''اللہ کا فضل طلب کرنے والے کامیاب ہیں اور آدمیوں کے فضل کا طلب گار محروم ہے۔''

صبا رانا، کوٹ چھٹہ

''سوچ ریزے''

☆ یہ محبت بھی کتنی اداس کر دینے والی چیز ہے۔ مہربان ہوتی ہے تو ساری دنیا دامن میں لا ڈالتی ہے اور چھن جاتی ہے تو زندگی کی تمام بہاریں، تمام رنگ، تمام خوشبوئیں، تمام خواب اپنے ساتھ سمیٹ کر لے جاتی ہے۔

☆ یادیں آب حیات لئے ہوتی ہیں شاید اسی لئے کبھی نہیں مرتیں اور ہمیشہ ہمارے ذہن کے گنبد پر روشنی بن کر چمکا کرتی ہیں تکلیف دہ یادوں سے دستبردار ہونا اچھا لگتا ہے لیکن وہی ہمارے دل و دماغ سے آسیب کی مانند چمٹ جاتی ہیں۔

☆ رشتے اپنائیت کے ہوں یا خلوص کے، اتنے ہی نازک ہوتے ہیں جتنے کہ آبگینے، ذرا سی ٹھیس لگی تو ٹوٹ گئے بدگمانی سے سر ابھارا تو چکنا چور ہو گئے۔ پھر ان پر کیسا فخر کیا اعتماد، کیسا مان؟

☆ جن سے محبت کی جائے وہ جسم کی پور پور میں بس جاتے ہیں ان کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا، انہیں اپنے سے جدا کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جیسے اپنے جسم کا کوئی حصہ، کوئی عضو الگ کر دیا جائے۔

زیبا منصور، رحیم یار خان

کام کی باتیں

1۔ راستہ میں تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی نیکی ہے۔

2۔ نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔

3۔ زبان سے شکوہ شکایات روک لو تو خوشی کی زندگی میسر ہو گی۔

4۔ موت سے محبت کرو تو زندگی عطا کی جائے گی۔

5۔ لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں قابلیت پر نہیں۔

6۔ تعلیم یافتہ شخص اور غیر تعلیم یافتہ شخص میں وہی فرق ہے جو زندہ اور مردہ میں۔

7۔ ذہن کے سفر میں اگر آسانی ہے تو [illegible]

8۔ علم ڈگریوں یا نوکریوں کے لئے نہیں بلکہ ذہن کی اصلاح کے لئے حاصل کرو۔

9۔ دو بھوکے کبھی سیر نہیں ہوتے علم کا بھوکا اور دولت کا بھوکا۔

10۔ انسانوں سے محبت کرنا بھی دراصل خدا سے محبت کرنا ہے۔

11۔ دوستی خوبصورت چہروں سے نہیں کرو کیونکہ یہ اکثر دل کے کالے ہوتے ہیں۔

12۔ نیکی ایک ایسی شمع ہے جو دوست اور دشمن دونوں کے گھر میں اجالا کرتی ہے۔

۱۳ دوسروں کے سینے سے شر اس وقت دور کرکہ پہلے تو اپنے سینے کی صفائی کر۔

۱۴ ہمیشہ مسکراتے رہو زندگی خود بخود خوبصورت ہو جائے گی۔

۱۵ ہماری غلطیاں ہمیں وہ تعلیم دیتی ہیں جو کسی مکتب میں نہیں ملتی۔

۱۶۔ زمین کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

۱۷ شارٹ کٹ راستہ بھی کبھار بہت طویل ہو جاتا ہے۔

۱۸ دریا کے پانی اور آنکھ کے پانی میں صرف فرق جذبات کا ہے۔

۱۹۔ دوست کو نصیحت اکیلے میں کرو تعریف سب کے سامنے کرو۔

۲۰ دوست کو اتنا مت آزماؤ کہ وہ تمہیں ازمائش میں ڈال دے۔

۲۱۔ ہمارا آج کا عمل کل کے لئے تاریخ ہے۔

نغمانہ حبیب، راولپنڈی

دین اخلاق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تم سب میں مجھ کو زیادہ محبوب اور آخرت میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں اور تم سب میں مجھ کو زیادہ برا لگنے والا اور آخرت میں مجھ سے سب سے زیادہ دور رہنے والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق برے ہوں۔'' (بہشتی زیور)

عاصمہ حیدر، قصور

کچھ کام کی باتیں

☆ جب بھی بولو، اچھا بولو۔

☆ زبان سے کچھ بھی ایسا نہ بولو، کہ جس سے دوسرے انسان کا دل زخمی ہو۔

☆ یہ بات یاد رکھیں۔ جب آپ دوسروں کے عیب چھپاؤ گے۔ تو کوئی آپ کے عیب بھی چھپائے گا۔

☆ ہمیشہ زبان کو اچھی باتوں کے لئے استعمال کرو۔

☆ ہمیشہ سچ بولو، جھوٹ بولنے سے گناہوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

میرب راشد، وہاڑی

محبت کیا ہے

۱۔ محبت اس چیز کا نام ہے جو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔

۲۔ محبت پیار کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔

۳۔ محبت ایک واحد ایسی چیز ہے امیری اور غریبی کا فرق مٹا سکتی ہے۔

۴۔ محبت کا مطلب کسی چیز کا حاصل کرنا نہیں۔

۵۔ محبت اگر خریدی جاتی تو امیر دولت مند اسے خرید لیتے۔

۶۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو خود دل میں پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ محبت انسان سے بھی کی جاتی ہے اور خدا اور اس کے رسولؐ سے بھی۔

۸۔ محبت دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا لفظ ہے۔

۹۔ محبت ہمیشہ قربانیوں سے پروان چڑھتی ہے۔

۱۰۔ محبت روح کا گلاب ہے جو گناہ کی دھوپ میں مرجھا جاتا ہے۔

۱۱۔ سچی محبت کا رشتہ خداوندی ہے۔

۱۲۔ محبت کی کوئی منزل نہیں اس کی ابتدا اور انتہا ایک ہے۔

۱۳ محبت ایک ایسی جھیل ہے جس کے کنارے بیٹھ کر تم نظارے کرو۔

۱۴ محبت کی غذا صرف اور صرف پیار ہے۔

۱۵ محبت زندگی ہے۔

سائرہ نعمان، کھاریاں

☆☆☆

صائمہ محمود

صبا رانا: کی ڈائری سے ایک نظم

''بد دعا''

بہت عرصے سے سنسان ہے اب تو
روشن تھا جو رستہ ویران ہے اب تو
ہاں کبھی بے در و دیوار یہ گھر بھی سجتا تھا
ٹوٹی منڈیروں پہ اک دیا بھی جلتا تھا
نرم گھاس کے بستر پر لیٹی
کھلے آسمان کو دیکھتی
نازک کومل سی لڑکی
کہکشاں سے کرنیں چنتی تھی
کسی کے آنے کے خواب بنتی تھی
دیئے کی گھٹتی بڑھتی لو سے
سمٹتا سکڑتا تھا دل اس کا
کسے بنتے لمحے کی آس میں تھی
خود تراشے ہوئے بن باس میں تھی
ماہ و سال گزرتے جاتے تھے زندگانی میں
نشان کے بے لمس ہونٹوں نے
اسم وہ دیا ہے کہ
رات کی کالی آنکھوں سے
ہجر کا اندھیرا نہیں چھٹتا
گھنی پلکوں کے سائے میں
کوئی خواب نہیں بکتا
مدتیں گزریں کہ ان منڈیروں پر
دیا اب نہیں جلتا

فریحہ رحیم: کی ڈائری سے ایک غزل

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں، اب ہجر کی کوئی رات نہیں
مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچہ جاناں میں کیا، ایسے بھی حالات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں
میدان وفا دربار نہیں، یہاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق سو کتی کا نام نہیں، یہ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

زیبا منصور: کی ڈائری سے کی نظم

''عہد و پیمان''

تم نے کہا تھا
مجھ سے بچھڑ کے مر جاؤ گے
اور میں بھی سوچا کرتی تھی
تم نہ ملے تو جی نہ سکوں گی
دیکھو، ہم کو بچھڑے کتنی صدیاں بیتیں
لیکن ہم تو مر نہیں پائے
دیکھو، ہم دونوں زندہ ہیں
یا شاید
ہم دونوں جھوٹے تھے

نغمانہ حبیب: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

''محبت کچھ نہیں دیتی''

محبت کچھ نہیں دیتی روایت کے اسیروں کو
سوائے خاموشی کے جو رگوں میں بہتی ہے
سوائے ایک ویرانی
جو دل پہ چھائی رہتی ہے
سوائے در در رسوائی

جو چاروں سمت ہوتی ہے
سوائے ایک اذیت جو ساری عمر رہتی ہے
ہم اپنا سر اٹھا کے چل نہیں سکتے
گناہ کرتے نہیں پھر بھی گناہ گاروں میں شامل ہیں
روایت کے اسیروں کو محبت کچھ نہیں دیتی
محبت کچھ نہیں دیتی

عاصمہ حیدر: کی ڈائری سے ایک غزل

فرقت کے پڑے ہم پہ جو اثرات نہ پوچھو
جو کہنے سے قاصر ہوں وہی بات نہ پوچھو
کچھ رکھ لو بھرم میرا ندامت سے بچالو
یوں بزم میں مجھ سے مری اوقات نہ پوچھو
مر جائیں گے توہین محبت نہ کریں گے
کیا اہل وفا کی ہیں رسومات نہ پوچھو
وہ چاہے تو بے ساغر و مینا ہی پلا دے
یارو میرے ساقی کی کرامات نہ پوچھو
آنکھوں کے تو ساون کو سبھی دیکھ رہے ہیں
سینے میں ہے جو تندی برسات نہ پوچھو

میرب راشد: کی ڈائری سے ایک نظم

''جدائی''

ہم ملے تو
برسوں جدائی ملی
قسمت نے ہمیں پھر سے ملایا
تو سدا جدائی ملی
چلو آج مل کر مسکرائیں
اور کہیں
کہ ہم نے اک خوبصورت سا
سپنا دیکھا
صرف اک سپنا دیکھا

سائرہ نعمان: کی ڈائری سے ایک نظم

ان جھیل سی گہری آنکھوں میں
اک شام کہیں آباد تو ہو
اس جھیل کنارے پل دو پل
اک خواب کا نیلا پھول کھلے
وہ پھول بہاریں لہروں میں
اک روز ہم بھی شام ڈھلے
اس پھول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت چاند چلے
اس وقت کہیں ان آنکھوں میں
اس برے پل کی یاد تو ہو
ان جھیل سی گہری آنکھوں میں
اک شام کہیں آباد تو ہو
پھر چاہے عمر سمندر کی
ہر موج پریشان ہو جائے
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے
پھر چاہے پھول سے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے
وہ روپ نگر ایجاد تو ہو
وہ عکس کبھی آزاد تو ہو
ان جھیل سی گہری آنکھوں میں
اک شام کہیں آباد تو ہو

صباحت علی: کی ڈائری سے

''بد دعا''

وہ اتنا سنگ دل نہیں ہے
کہ میرے بہتے آنسو
میری بھیک مانگتی نگاہیں
اس کے لمس کو میری ترستی بانہیں
اس کی طرف میرے بڑھتے قدم
میرے لفظوں کی صورت
ڈھل کر
بولتے ہوئے جذبے
سمجھ نہ پاتا
وہ اتنا انجان نہیں ہے

کہ میری مانگ کا سونا پن
اس کو نظر نہیں آتا
یا شاید
وہ کسی بددعا کے زیر اثر ہے

فرح سلیم: کی ڈائری سے ایک نظم

اے بادِ صبا
اس کے شہر جائے تو
میرے دل کا چپکے سے
اس دل کے شبستانوں میں اتار دینا
میری آنکھوں کے ٹوٹے خواب
اس کی آنکھوں کو بخش دینا
میرے ہونٹوں کی ان کہی باتیں
اس کی سماعتوں میں اتار دینا
بڑی ویران ہے اس دل کی نگری
تو چپکے سے اسے کہہ دیتا
اور کہنا کہ
کبھی بھولے سے تو ہمیں یاد کر لینا

نسرین فیصل: کی ڈائری سے ایک غزل

زخم پھر رسنے لگے ہیں جان جاں کہنا اسے
سونا سونا سا لگے سارا جہاں کہنا اسے
ہو گئیں تاریک راہیں ایک جگنو بھی نہیں
مٹ گئے منزل کے سارے ہی نشاں کہنا اسے
دید کی پیاسی نگاہیں ہار کر پتھرا گئیں
اپنے گھر کو لوٹ آئے مہرباں کہنا اسے
چاندنی، خوشبو، بہاریں، پیار کا موسم حسیں
سب تمہارا پوچھتے ہیں جان جاں کہنا اسے
لاکھ کوشش کی چھپایا درد دل کا اے ندیم
حالِ دل چہرے سے لیکن ہے عیاں کہنا اسے

عظمیٰ ساجد: کی ڈائری سے ایک غزل

سارے شکوے گلے بھلا دوں گی
اس کو دیکھوں گی مسکرا دوں گی
اس سے پہلے کہ ہوا کو زحمت ہو
آپ اپنا دیا بجھا دوں گی
جان لیوا ہے دل کی خاموشی
میں اسے بولنا سکھا دوں گی
جی تو لوں گی ترے بغیر مگر
زندگی کو جواب کیا دوں گی
آنے والے کا دیکھوں گی رستہ
جانے والے کو رستہ دوں گی

فریدہ عابد: کی ڈائری سے ایک نظم

"سالگرہ"

اک نئے دن کے ابھرتے سورج
تھیں اپنی انہی کرنوں کی قسم
اس آنے والی رات کی چاندنی
اک وعدہ تم سے بھی لینا ہے
آسماں پر رات کے سمے اترتے ستارو
ایک بات تمہیں بھی کہنی ہے
اس بہار بھرے باغ میں
ادھ کھلے گلاب سن لو تم بھی
اس ہوا میں بکھری موتیے کی خوشبو
یہ جانو تم بھی کہ
میرے دوست کی سالگرہ ہے
اسے تم سب، تحفے کی صورت پیغام دیتی ہوں
ہزار برس کی خوشیاں اسے دعا دیتی ہوں

منزہ سجاد: کی ڈائری سے ایک غزل

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں، سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ
بستیاں دور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ
کیا خبر ان کو کہ دامن بھڑک اٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

☆☆☆

رابعہ رزاق ---- سیالکوٹ

س: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟
ج: دل کی مراد بھر آنے پر۔
س: اگلے موسم بہار میں بھلا ہم کہاں ہوں گے؟
ج: ''ایک شخص کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔ دوسرے دن وہ افسوس کرنے والے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات ہے کہ میری وہ لڑکی بڑی اللہ والی تھی بھاگنے سے ایک رات پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ ابا کل ہمارے ہاں ایک شخص کم ہو جائے گا۔'' اب تم؟
س: ہر شوہر کو بیوی اچھی لگتی ہے مگر دوسرے کی کیوں؟
ج: اسی کو تو کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔
س: آپ کو کبھی کسی نے دن میں تارے دکھائے؟
ج: کیوں تمہارا ارادہ ہے۔
س: اگر انسان ریموٹ کنٹرول سے چلنے لگیں تو؟
ج: لگیں تو کیا مطلب' ابھی بھی چلتے ہیں یقین نہیں آتا تو کسی بھی شوہر کو دیکھ لو۔
س: نفرت کی زمین پر بھی پیار لکھنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟
ج: اس دور میں تو پاگل ہی ہوتے ہیں۔
س: کس موسم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟
ج: جس میں اندر اور باہر کا موسم یکساں خوشگوار ہو۔

ریحانہ احمد ---- سکھر

س: السلام وعلیکم! جناب کیا کر رہے ہیں؟
ج: آپ کے سوال پڑھ رہا ہوں۔
س: ہمیں تو حنا کی محفل سے محبت ہے اور آپ کو؟
ج: محفل والوں سے۔
س: کبھی غصہ آیا؟
ج: بے تکے سوال پڑھ کر۔
س: کس بات پر زیادہ غصہ آیا؟
ج: جس بات پر بھی غصہ آیا۔
س: زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
ج: برا مان جاؤ گی پڑھ کر۔
س: کیا دوستی پیار ہے؟
ج: نہیں۔
س: کیا زندگی گزارنے کے لئے لو میرج ضروری ہے؟
ج: اچھے بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔
س: میرے بی اے کے پیپرز ہونے والے ہیں۔ دعا کریں گے۔
ج: کس کے لئے؟ تمہارے لئے یا ممتن کے لئے۔

صبا رانا ---- کوٹ چھٹہ

س: آداب عین غین جی کیسے مزاج ہیں؟
ج: اللہ کا شکر ہے۔
س: میرے بغیر کیسا رہا؟
ج: سچ سچ بتائیں۔ برا تو نہیں مانوں گی۔
س: عین غین جی نو مائنڈ بتائیں؟
ج: بہت سکون رہا۔
س: کیا کہہ رہے ہیں ادھر دیکھیں؟
ج: دیکھ تو رہا ہوں۔ میں ناک پر رومال رکھ

لوں۔

فریحہ رحیم ---- خانیوال

س: محبت کیا صرف ایک بار ہوتی ہے؟

ج: جی ہاں بعد میں عادت بن جاتی ہے۔

س: مکمل تنہائی کسے اچھی لگتی ہے؟

ج: جسے محبت ہو گئی ہو۔

س: حسن کو چاند کیوں کہتے ہیں؟

ج: اس تک رسائی جو مشکل ہے۔

س: عام طور پر تو شادیاں ہوتی ہیں؟

ج: شادیاں عام طور پر ہی ہوتی ہیں۔

س: محبت کیا ہے؟

ج: کیا تمہیں نہیں معلوم؟

س: روشنی کیا ہے؟

ج: لو یہ بھی بتانا پڑے گا۔

س: محبت میں کامیابی کا راز؟

ج: محبت کیا ہے تمہیں معلوم نہیں اور کامیابی کا راز پوچھنے لگے ہو۔

س: کسی سے پیار ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: علاج اپنے ماں باپ کے پاس جا کر۔

زیبا منصور ---- رحیم یار خان

س: میری آنکھوں میں دیکھو؟

ج: تمہیں نیند آ رہی ہے۔

س: اپنوں کی جدائی کیوں برداشت نہیں ہوتی؟

ج: ان کی عادت سی جو ہو جاتی ہے۔

س: زندگی میں انسان کی ہار کب ہوتی ہے؟

ج: جب اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو۔

س: انسان اپنی بے عزتی کب برداشت کر لیتا ہے؟

ج: جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

س: ایک عورت کے لئے زندگی کا سب سے بھاری بوجھ کون سا ہوتا ہے؟

ج: جب نکمے خاوند کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

س: محبت کرنے کے لئے کیا چیز چاہیے؟

ج: دل۔

س: دنیا کی خوبصورت کیا چیز ہے؟

ج: دنیا خود بہت خوبصورت ہے۔

س: زندگی کی اداس راہوں میں؟

ج: خوشیاں بکھیر دو۔

نغمانہ حبیب ---- راولپنڈی

س: آداب عین جی! تو پھر کیا اظہار ویلنٹائن پر؟ کیا تو کیا ملا؟

ج: روز۔

س: یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی...... اب وہ بیچ راہ میں کہہ رہا ہے ہمیشہ کے لئے ''گڈ بائے'' اب میں کیا کروں؟

ج: راہ بدل لو۔

س: ''گھٹیا'' لفظ کا معنی تو لکھ دیں کہ کیا ہے؟

ج: لغت سے استفادہ کر لو۔

س: کیا اپنی محبت کو گھٹیا کہنے والے محبت کر سکتے ہیں کسی سے؟

ج: محبت کبھی گھٹیا نہیں ہوتی۔

س: کیا آپ نے کبھی کسی کی محبت کی توہین کی ہے؟

ج: نہیں۔

س: جب کوئی پیار سے بلائے گا...... تم کو......؟

ج: ایک شخص بہت یاد آئے گا۔

☆☆☆

بلقیس بھٹی

ٹی ٹونٹی

ٹی وی پر چل گیا ہے کرکٹ کا جو چلن
ہر شخص محو دید ہے دلہا ہو یا دلہن
اک مولوی سے پوچھا جو حوروں کا بانکپن
داڑھی کھجا کے بولے ! ہنڈرڈ فار ون
میں نے کہا یہ وقت ہے حق کی اذان کا
بولے کہ میں تو فین ہوں یونس خان کا
اک شعر گھر میں بیٹھ کے کہنا محال ہے
بچوں کا ذکر کیا ہے ، یہ بیگم کا حال ہے
پوچھا کسی نے آپ کے ''وہ'' ہیں مکان پر
بولیں وہ کیچ ہو گئے کب کے ''مڈآن'' پر

صباحت علی، منڈی بہاؤالدین

انمول موتی

☆ کردار وہ مالا ہے۔ جس کا ایک موتی بھی ٹوٹ جائے تو مالا بکھر جاتی ہے۔

☆ کتنا عظیم ہے وہ شخص جو اپنے غم سینے میں چھپائے رکھتا ہے اور زندگی بھر مسکراتا رہتا ہے۔

☆ اس دنیا میں واحد طریق زندہ رہنے کا یہ ہے۔ کہ انسان دوسروں کی غلطیاں بھول جائے۔

☆ شرافت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے۔ کہ شریف کسی کو دکھ نہیں دیتا۔

☆ آنسو کمال کی چیز ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بہت شفاف نظر آتے ہیں حالانکہ پتہ نہیں ہوتا کتنا جھوٹ کتنا پچھتاوا اپنے ساتھ بہا کر لے جارہے ہوتے ہیں۔

ہنسنا منع ہے

دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے کہا
''اگر تم سامنے والی دکان سے کوئی چیز چرا کر لاؤ میں پانچ سو روپیہ تمہیں دوں گا۔''
وہ آدمی گیا اور فوراً گھی کا ڈبہ لے آیا۔
دوسرے نے کہا۔
''تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا میں پولیس والا ہوں۔''
دوسرے نے کہا۔
''کہ آپ کو زیادہ دکھ ہو گا میں اس دکان کا مالک ہوں۔''

فرح سلیم، علی پور

نہلے پہ دہلا

ایک آدمی بلی کو نہلا رہا تھا۔ دوسرا آدمی ادھر سے گزرا تو کہنے لگا۔
''اس کو نہلاؤ نہیں یہ مر جائے گی۔''
وہ کہنے لگا۔
''نہیں مرتی۔''
تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی دوبارہ گزرا تو دیکھا بلی مر گئی تھی۔ کہنے لگا۔
''کہ میں نے کہا تھا ناں یہ مر جائے گی۔''
وہ آدمی بولا نہلانے سے نہیں یہ نچوڑنے سے مری ہے۔''

نسرین فیصل، جہلم

گھر پر

ایک بھوکا لڑکا دروازے پر چلا رہا تھا کہ

میں بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر روٹی دے دو۔ تو اندر سے آواز آئی مالکن نہیں ہے یہ سن کر لڑکا چلایا میں روٹی مانگ رہا ہوں مالکن نہیں۔

محبّ وطن

ایک شخص کئی سالوں بعد وطن واپس آیا جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے وقت وہ زمین پر سجدے کی حالت میں گر پڑا اور زمین چومنے لگا۔ سامنے کھڑے سپاہی نے اس کی حالت دیکھی تو دل میں سوچا کہ کتنا اچھا شخص ہے اس کو وطن کی مٹی سے کتنی محبت ہے کہ وطن پہنچتے ہی سب سے پہلے یہاں کی مٹی چوم رہا ہے۔ سپاہی آگے بڑھا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''آپ بہت محبّ وطن ہیں میں آپ کی حب الوطنی کو سلام کرتا ہوں۔''

اس شخص نے غصے سے کہا۔

''تم پہلے یہ بتاؤ کہ سیڑھیوں پر کیلے کا چھلکا کس نے پھینکا تھا۔''

عظمیٰ ساجد، گوجرانوالہ

بہار کے رنگ

ایک صاحب کی کسی دوسرے شہر میں شادی ہونے والی تھی کہ اتفاق سے وہ اسٹیشن پر سو گئے اور گاڑی چھوٹ گئی جب آنکھ کھلی تو بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ سیدھے گھر پہنچے اور اپنی ہونے والی بیوی کو فون پر کہا۔

''کہ جب تک میں نہ آؤں تم شادی مت کرنا۔''

☆

ایک بہت موٹی عورت نے رکشے والے سے کہا۔

''مجھے اسٹیشن تک چھوڑ دو۔''

رکشے والا بولا۔

''چھوڑ تو دوں گا مگر دو چکر لگیں گے۔''

☆

ماسٹر صاحب نے ایک لڑکے سے کہا۔

''بتاؤ تمہاری مادری زبان کون سی ہے؟''

لڑکا معصومیت سے بولا۔

''جناب! میری ماں گونگی ہے۔''

فریدہ عابد، ملتان

بہانہ

کمپنی کے مالک ذیشان نے ایک دن اپنے ملازم ارسلان کو بلایا اور غصے میں کہا۔

''میں نے پچھلے تین سال میں خاص طور پر یہ بات نوٹ کی ہے کہ تم جب بھی اپنی بیوی کی بیماری کا کہہ کر کمپنی سے چھٹی لے کر جاتے ہو تو اس دن ضرور کوئی کرکٹ میچ ہوتا ہے۔''

ارسلان نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری بیوی بیماری کا بہانہ کرتی ہے۔''

فضول خرچی

''حمزہ تم کچھ پڑھ رہے ہو؟'' کنجوس باپ نے شاہ خرچ بیٹے سے پوچھا۔

''نہیں پاپا جی۔'' بیٹے نے مختصر جواب دیا۔

''کیا تم کچھ لکھ رہے ہو؟'' باپ نے پھر دریافت کیا۔

''نہیں پاپا! میں کچھ سوچ رہا ہوں۔'' حمزہ نے جواب دیا۔

''تو پھر خدا کے لئے چشمہ اتار دو۔ تمہاری یہ فضول خرچی کی عادت کسی دن مجھے دیوالیہ کر دے گی۔'' کنجوس باپ نے دھاڑ کر کہا۔

منزہ سجاد، سکھر

سیر پہ سوا سیر

اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندے کو اپنے بیٹے کی فضول خرچی سے بہت شکایت تھی آخر ایک روز اپنے بیٹے سے اس نے کہا۔

''اب آئندہ میں تمہیں ایک روپیہ نہیں دوں گا کیا سمجھے؟''

''مگر کیوں ڈیڈی؟''لڑکا حیرت سے چیخا۔

باپ نے خفگی سے کہا۔

''اس لئے کے تم آج سے میرے لئے مر چکے ہو۔''

بیٹے نے سر جھکا کر کہا۔

''تو ڈیڈی کفن دفن کے لئے تو کچھ رقم دے دیں۔''

عالیہ وحید، فیصل آباد

شکست

یہ بے پناہ خواہشیں

یہ سوچوں کے لامتناہی سلسلے

یہ جذبات، یہ احساسات

وہ ساتھ گزرے

چند لمحات

میری بے چینی بڑھا دیتے ہیں

آ جاؤ تم اک بار

تا کہ میں

اپنی شکست تسلیم کرلوں

صباحت ناصر، سرگودھا

مددگار

ایک تاجر اپنی کار میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا اس نے راستے میں کسان کو روک کر پوچھا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ چک نمبر ۴۴ کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔''

کسان نے جواب دیا۔

''میں شرمندہ ہوں مجھے نہیں معلوم۔''

یہ جواب سن کر تاجر آگے بڑھ گیا جب وہ وہاں سے تھوڑی دور نکل آیا تو اسے پیچھے سے آوازیں دیں اس نے دیکھا کہ دو آدمی ہانپتے کانپتے ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں اور ان میں سے ایک وہی کسان تھا۔

''کیا بات ہے؟'' تاجر نے کسان سے پوچھا۔

''یہ میرا دوست اللہ دتہ ہے۔'' کسان نے جواب دیا۔

''میں نے اس سے پوچھا تھا لیکن اسے بھی چک نمبر ۴۴ کا راستہ معلوم نہیں۔''

عفت آفتاب، جھنگ

قدردان

تجریدی آرٹ کی نمائش میں ایک اداکار اور اس کی اداکارہ بیوی نے ایک تصویر خاصے منگے داموں خریدی اور اسے لے جا کر اپنے ڈرائینگ روم میں لگا دیا۔ اگلے دن آرٹسٹ اس جوڑے کا شکریہ ادا کرنے ان کے گھر پہنچا تو دیوار پر اپنی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اس کی تصویر الٹی لگی ہوئی تھی۔

رابعہ رزاق، سیالکوٹ

آمدنی

ایک پلمبر نے نل درست کر کے وکیل صاحب کو اپنا بل تھما دیا۔ بل دیکھ کر وکیل صاحب چراغ پا ہو گئے۔

''تین سو روپے فی گھنٹہ خدا کی پناہ، میں تو دن بھر میں بھی اتنی رقم نہیں کماتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' پلمبر نے پورے خلوص سے جواب دیا۔

''وکالت میں میرا بھی یہ ہی حال تھا، لیکن اب خدا کا شکر ہے۔''

ریحانہ احمد، سکھر

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

عالیہ وحید ---- فیصل آباد
کیسے فرار حاصل کروں میں تیری یادوں سے
اس شہر کے ہر فرد کی زباں پہ ہے ذکر تیرا

....

پھر وہی زخم ابھر آئے جو بھر چلے تھے
آج پوشیدہ سے کچھ خط کتابوں میں ملے تھے

....

وہ کہہ رہا تھا میں لوٹ آؤں گا ایک دن انتظار کرنا
وہ ہجر تھل میں رفاقتوں کے سراب دے کر چلا گیا
صباحت ناصر ---- سرگودھا
تمہارے ہجر میں یہ حال ہو گیا ہے اپنا
کسی کا خط ہو اسے بھی سنبھال رکھتے ہیں
خوشی ملے تو تیرے بغیر خوش نہیں ہوتے
ہم اپنی آنکھ میں ہر دم ملال رکھتے ہیں

....

تیرا خیال ، تیری طلب ، تیری آرزو
اک بھیڑ سی لگی ہے میرے دل کے شہر میں
دنیا کی نعمتیں تو یہاں دستیاب ہیں
تیری ہی اک کمی ہے میرے دل کے شہر میں
عفت آفتاب ---- جھنگ
کبھی یوں بھی آ میری آنکھ میں کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
میرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی خواب سی ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو
رابعہ رزاق ---- سیالکوٹ
ہم اہل وفا حسن کو رسوا نہیں کرتے
پردہ بھی جو الٹے رخ سے تو دیکھا نہیں کرتے
کر لیتے ہیں دل اپنا تصور سے ہی روشن
ہم مانگے کے چراغوں سے اجالا نہیں کرتے
درد الفت نے کھول دیئے سعید سب راز ورنہ
زبان کو تالا تو میں نے بھی لگا رکھا تھا

....

مہکتی پلکوں کی اوٹ میں کوئی تارا چمکا تھا رات میں
میری بند مٹھی نہ کھولئے وہی کوہ نور ہے ہاتھ میں
میں تمام تارے اٹھا اٹھا کر غریبوں میں بانٹ دوں
کبھی ایک رات وہ آسمان کا نظام دے میرے ہاتھ میں
ریحانہ احمد ---- سکھر
جہاں بھی ہو چلے آؤ تمہیں یادیں بلاتی ہیں
تمہارے ساتھ گزری تھیں جو شامیں بلاتی ہیں
یہ نہ سمجھو تمہارے بن کسی کا دل نہیں روتا
کسی کی آج بھی تم کو اداس آنکھیں بلاتی ہیں

....

وقفے ، وقفے نے ستاتا رہا تیرا پیکر
مجھ کو اک بات بتانے میں بڑی دیر لگی
یوں تو جیون میں تغیر کوئی ایسا بھی نہ تھا
پھر بھی معمول پہ آنے میں بڑی دیر لگی

....

بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
کچھ بھی ہوا ، ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ کٹ جائیں نہ بینائی کے رشتے
آنکھوں نے تیری راہوں سے ہٹ کر نہیں دیکھا
صبا رانا ---- کوٹ چھٹہ
یہ سوچ کر کہ وہ ہو گا کسی اور کے پہلو میں
گزار کے کبھی دیکھو ، ہزار سال کی رات

صائمہ خضر ----- مظفر آباد
اک شخص مجھ کو زخم جدائی دے گیا
جب دے نہ سکا پیار تو رسوائی دے گیا
جاتے وقت اپنی نشانی کے طور پر
مجھے کتنے خلوص سے تنہائی دے گیا
فریحہ رحیم ---- خانیوال
آنکھ میں آنسوؤں کی طرح
پھول میں خوشبو کی طرح
تم میرے دل میں ہوتے ہو
دل میں دھڑکنوں کی طرح

....

جانے والے تجھے کس طرح بتائے کوئی
زندگی کتنی ادھوری تیرے جانے سے رہی

....

تم لمحوں کا حساب رکھتے ہو
زندگی کی کتاب رکھتے ہو
فرصت ملے تو لکھنا کبھی
کیا میرا دھیاں رکھتے ہو

....

مشکل کہاں تھے ترک تعلق کے مرحلے
اے دل سوال مگر تیری زندگی کا تھا
زیبا منصور ---- رحیم یار خان
پیار ہو جائے تو بھلایا نہیں کرتے
کسی کو اتنا ستایا نہیں کرتے
ہواؤں سے دوستی کرکے انجم
ریت کے گھر بنایا نہیں کرتے

....

میری نیند میں میرے سپنے اڑا کر چلا گیا
اک شخص مجھ کو چرا کر چلا گیا
محبت کا اظہار اس نے اس طرح کیا
پھول میری کتاب میں چھپا کر چلا گیا
نغمانہ حبیب ---- راولپنڈی

تجھ سے جدا ہو کر سانس لے رہے ہیں ہم
تیری زلف کو چھو کر آنے والی ہوا کی خاطر
تیری بے رخی نے سمجھا دی یہ بات پرنس کو
خشک نہ رکھنا خیر کی مٹی کسی کے آنسوؤں کی خاطر
عاصمہ حیدر ---- قصور
وہ بھرے شہر میں کسی سے بھی
میرے بارے میں پوچھتا نہیں
دل جو اک دوست تھا مگر وہ بھی
چپ کا پتھر ہے بولتا ہی نہیں

....

محبت کے ہر جذبے سے وہ انکار کرتا ہے
وہ خونفرت ہے اور نفرت کا کاروبار کرتا ہے
اسے گر موت پیار ہے تو وہ مر کیوں نہیں جاتا
وہ سارے شہر کو جینے سے کیوں بیزار کرتا ہے
میرب راشد ---- وہاڑی
کھلتے پھولوں کی ردا ہو جائے
اتنی حساس ہوا ہو جائے
مانگتے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دے
اتنا مہرباں خدا ہو جائے

....

ارمان تڑپتے رہے ساحل کے آس پاس
شاید میرے یقیں کی کشتی الٹ گئی

....

اسی آسماں کی چھت تلے
میرا آشیاں بھی اڑان بھی
تیری چشم خوش کی پناہ میں
میرے خواب بھی میرے مان بھی
سائرہ نعمان ---- کھاریاں
ہم سے تو بہت اور بھی مل جائیں گے تم کو
ہے بات بس اتنی سی کہ نایاب یہ دل ہے

....

جشن وصال کی لاکھ سبیلیں اور سنجوگ ہزار

ایک مجھے بس تو نہیں ملتا، ویسے لوگ ہزار
بھیس بدل کے جوگی والا، گاتا پھرے فرحت
عشق میں روگ ہزار او سائیں عشق میں روگ ہزار

....

آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں
صباحت علی ---- منڈی بہاؤالدین
ترستی تھی جس وجود کی قربت کو عمر بھر
وہ مل گیا تو اور بھی تنہائی بڑھ گئی

....

تیرا خیال، تیری طلب، تیری آرزو
اک بھیڑ سی لگی ہے میرے دل کے شہر میں
دنیا کی نعمتیں تو یہاں دستیاب ہیں
تیری ہی اک کمی ہے میرے دل کے شہر میں

....

وہ تو خدا ہے سو پوری کرے گا آرزو
لوگ تو پتھروں سے بھی پا لیتے ہیں مرادیں
فرح سلیم ---- علی پور
میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی
روتی رہی اگر تو میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

....

خود کو سبز ہی رکھا، آنسوؤں کی بارش میں
ورنہ ہجر کا موسم کس کو راس آتا ہے

....

دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اس کو
بچھڑے ہوئے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے
کچھ تجھ کو یقین تھا محبت پہ نہ وفا پر
کچھ دکھ میری تقدیر میں لکھا بھی بہت ہے
نسرین فیصل ---- جہلم
اداسی راس ہے نا اس لئے بھی

ہمیں اجڑا شہر اچھا لگتا ہے

....

سات رنگوں سے کھیلنے والا
اک نیا رنگ ابھار سکتا ہے
زلف ہو یا غریب کی قسمت
دوسرا کب سنوار سکتا ہے

....

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے
عظمیٰ ساجد ---- گوجرانوالہ
اگرچہ جدائی تیری مجھ کو گوارہ نہیں ہے
سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے

....

روشن روشن لفظوں میں ذاتیں ادھوری رہ جاتی ہیں
ظرف کے سارے قصوں میں باتیں شعوری رہ جاتی ہیں
عجیب ہوں میں اور عجیب لفظوں کی دنیا ہے
اکثر جو کہنی ہیں وہ باتیں ضروری رہ جاتی ہیں

....

تعلق کرچیوں کی شکل میں بکھرا تو ہے پھر بھی
شکستہ آئینوں کو جوڑ دینا چاہتے ہیں ہم
فریدہ عابد ---- ملتان
تم نے دیکھی ہے جو باہر سے ضیاء کچھ اور ہے
جل رہا ہے میرے اندر دیا کچھ اور ہے
جاگتا ہے یوں تو شب بھر ایک چوکیدار بھی
ہجر کے ماروں کا لیکن رتجگا کچھ اور ہے

....

یہ دل ملنے کی شہر یار میں ضد باندھ لیتا ہے
کہ بچہ جس طرح بازار میں ضد باندھ لیتا ہے
اسے کیسے بتاؤں لڑکیاں خود کچھ نہیں کہتیں
وہ میرے انکار میں ضد باندھ لیتا ہے

☆☆☆

حمنا کا دستر خوان

افراح طارق

میتھی کے پراٹھے

اشیاء

تازہ میتھی	ایک گڈی
نمک	ایک کھانے کا چمچہ
آٹا	تین پیالی
ثابت دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
پیاز	ایک عدد درمیانی
ہرا دھنیا	ایک گڈی
سرخ مرچ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
کوکنگ آئل	پراٹھوں کے لئے

ترکیب

میتھی کے پتے چن کر صاف کریں اور اچھی طرح پانی سے دھولیں، ہرے دھنیے کی بھی پتیاں نرم ڈنڈیوں سمیت توڑ کر دھولیں، پیاز چھیل کر موٹی موٹی کاٹ لیں، اب میتھی میں ہرا دھنیا، پیاز، ثابت دھنیا، ہری مرچ، نمک اور مرچ ملا کر باریک پیس لیں، اور چٹنی سی بنالیں، اگر ضرورت ہو تو تھوڑا سا پانی ڈال دیں، آٹے میں بالائی ڈال کر ہاتھوں سے ملائیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے میتھی کی چٹنی آٹے یا پانی کی مقدار بڑھا سکتی ہیں، آدھے گھنٹے کے لئے ڈھانپ کر رکھنے کے بعد پیڑے بنا کر روٹی بیل لیں اور درمیانی آنچ پر گھی یا تیل میں پراٹھے بنالیں اور دہی کے ساتھ پیش کریں۔

آلو بھرے پراٹھے

اشیاء

آلو	آدھا کلو ابلے ہوئے
آٹا	ایک کلو
لال مرچ پاؤڈر	آدھا کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ بھنا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز بڑی ڈلی	ایک عدد
ہرا دھنیا	ایک گڈی کٹا ہوا
ہری مرچ	چار عدد کٹی ہوئی
گھی	حسب ضرورت

ترکیب

سب سے پہلے آٹا اور نمک ملا کر گوندھ لیں، دھیان رکھیں آٹا زیادہ نرم نہ زیادہ سخت ہو، گوندھ کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں، آلو کے بھرتے میں سارے مسالے اچھی طرح ملا لیں، توا گرم کریں، ایک چھوٹا پیڑا لیں روٹی کی طرح بیل کر مسالا لگے آلو پوری روٹی پر پھیلا کر رکھیں، اب دوسرے پیڑے کی روٹی بنائیں آلو کے اوپر رکھ کر کناروں کو اچھی طرح دبا کر بند کر دیں گرم توے کے اوپر آہستہ سے ڈال دیں، ایک طرف سک جائے تو پلٹ دیں جب روٹی کی طرح سک جائے تو لکڑی کے چمچے سے گھی لگا لیں، اچھی طرح سک کر اتار لیں، گرم گرم میتھی چٹنی، دہی کا رائتہ ساتھ رکھ کر سرو کریں۔

چکن آلو خمیری پراٹھا

اشیاء

میدہ	چار کپ

خمیر	1-1/2 کھانے کے چمچ
پسی چینی	دو کھانے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
تیل	ڈیڑھ کپ
خشک دودھ	دو کھانے کے چمچ
نیم گرم پانی	حسب ضرورت
پسی ہری مرچ	ایک چائے کا چمچہ
فلنگ کے اجزا	
ابلے اور کچلے آلو	دو عدد
بھنا چکن کا قیمہ	ڈھائی سو گرام
نمک	1/4 چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	1/2 چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	چند پتے

ترکیب

ایک پیالے میں چار کپ میدہ، دو کھانے کے چمچے پسی چینی، ایک چائے کا چمچہ، نمک، ایک عدد انڈا، ڈیڑھ کپ تیل، ایک چائے کا چمچہ، پسی ہوئی ہری مرچ اور دو کھانے کے چمچے خشک دودھ مکس کریں، پھر اسے حسب ضرورت نیم گرم پانی کے ساتھ نرم گوندھ لیں۔

اب اسے پھولنے کے لئے ایک گھنٹے تک چھوڑ دیں، فلنگ کے لئے پیالے میں دو عدد ابلے آلو ڈھائی سو گرام بھنا چکن کا قیمہ، نمک، چاٹ مسالا اور ہرا دھنیا کے چند پتے ڈال کر مکس کریں۔

دو عدد پیڑے بنائیں، اب ایک ایک کر کے ہر پیڑے کو بڑی پلیٹ کے برابر بیل لیں۔

اب ایک روٹی پر درمیان میں تھوڑی سی فلنگ رکھیں، کناروں پر تھوڑا سا پانی لگائیں، اس پر دوسری روٹی رکھ کر کناروں کو اچھی طرح جوڑ دیں، اس کے بعد اچھی طرح بیل کر بیکنگ ٹرے میں رکھیں اور 200 ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم اوون میں بیک کر لیں یا پھر دو کھانے کے چمچے گھی کے ساتھ فرائی کر لیں۔

دال پراٹھا

اشیاء

چنے کی دال	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں	دو عدد
پودینہ	ایک گڈی کٹا ہوا
ہری مرچ	چار عدد کٹی ہوئی
تیل	تین کھانے کے چمچ
آٹا	آدھا کلو

ترکیب

چنے کی دال کو نیم گرم پانی سے دھو کر ابالیں لیکن دال بہت نرم نہ ہو بکھری بکھری رہے، جب دال گل جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے چوپر میں پیس لیں، پھر اس میں حسب ذائقہ نمک، پسی لال مرچ، لیموں کا رس، پودینہ اور باریک کٹی ہری مرچ شامل کر کے رکھ دیں، اب کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں مسالا ملی دال کو ہلکا سا بھون لیں، اس کے بعد آٹے میں نمک ملا کر گرم پانی کے ساتھ گوندھیں اور تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیں، ساتھ ہی توا گرم کر لیں، پھر آٹے کا ایک پیڑا بنائیں اور روٹی کی طرح بیل کر اس پر تھوڑی دال پھیلا دیں، کنارے تھوڑے چھوڑ دیں اس کے بعد کناروں پر گیلا میدہ لگا کر دوسری روٹی بیل لیں اور اسے اوپر رکھ کر کناروں کو ہلکا سا دبا کر بند کر دیں، اب گرم توے پر اسے روٹی کی طرح سینک کر لکڑی کے چمچے سے تیل لگائیں،

سینکنے کے بعد اسے اتار کر املی کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

کھوئے کے پراٹھے

اشیاء

میدہ	دو کپ
نمک	ایک چٹکی
تیل	دو کھانے کے چمچ
پانی	حسب ضرورت

فلنگ کے اجزا

کھویا	125 گرام
چینی	دو کھانے کے چمچ
کٹا خشک میوہ	ایک کھانے کا چمچ
کدوکش کھوپرا	ایک کھانے کا چمچ
تیل	تلنے کے لئے

ترکیب

ڈو بنانے کے لئے ایک پیالے میں دو کپ میدہ، ایک چٹکی نمک، دو کھانے کے چمچے تیل اور حسب ضرورت پانی ڈال کر گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیں۔

اب فلنگ کے لئے ایک پیالے میں 125 گرام کھویا، دو کھانے کے چمچے چینی، ایک کھانے کا چمچہ کٹا خشک میوہ اور ایک کھانے کا چمچہ کدوکش کھوپرا ڈال کر مکس کریں اور پانچ منٹ کے لئے رکھ دیں۔

پھر ڈو کے دو چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں اور ان کے درمیان میں فلنگ بھر کر اوپر سے بیل لیں، اب انہیں فرائی کر کے سرو کریں۔

انڈا مسالا

اشیاء

انڈے ابال لیں	چار عدد
کوکنگ آئل	ایک کھانے کا چمچ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد چوپ کی
دار چینی	ایک اسٹک
دھنیا پاؤڈر	دو چائے کے چمچ
لال مرچ کٹی ہوئی	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
لہسن	دو عدد کٹا ہوا
نمک	حسب ذائقہ
ٹماٹر	ایک عدد
پانی	1-1/4 کپ
ہرا دھنیا چوپ کیا ہوا	دو کھانے کے چمچ

ترکیب

ابلے ہوئے انڈوں کو پانی میں رکھیں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں، اس میں زیرہ ڈال کر کڑکڑائیں، اس کے بعد پیاز اور دار چینی ڈال کر پکائیں حتی کہ پیاز لائٹ براؤن ہو جائے، اس میں دھنیا پاؤڈر، لال مرچ، ہلدی، لہسن اور نمک ڈال کر پکائیں، چمچہ مسلسل چلاتی رہیں اور لہسن کو براؤن کر لیں دو منٹ کے بعد اس میں ٹماٹر ڈال کر مزید پانچ منٹ تک پکائیں، اس میں پانی ڈال کر ایک ابال لے آئیں، آنچ ہلکی کر دیں اور پانچ منٹ دم پر رکھیں، انڈوں کو پانی سے نکال کر لمبائی میں کاٹ لیں، انڈوں کو تیار کردہ سوس میں شامل کر دیں اور تھوڑی دیر پکنے دیں، آخر میں ہرا دھنیا چھڑک کر گرم گرم سرو کریں۔

بھنا ہوا قیمہ

اشیاء

قیمہ	1/2 کلو
پیاز	دو عدد

ابلے ٹماٹر	تین عدد
ہری مرچ	چار عدد
ہرا دھنیا	1/4 گڈی
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
پسا گرم مصالحہ	1/2 چائے کا چمچ
خشک میتھی	ایک چائے کا چمچ
ادرک لہسن کا پیسٹ	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1/4 کپ

ترکیب

پہلے کڑاہی میں گرم کر کے دو عدد باریک کٹی پیاز شامل کر کے اتنا فرائی کریں کہ وہ اچھی طرح سے گولڈن ہو جائے، پھر اس میں دو کھانے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ اور قیمہ شامل کر کے اتنا بھونیں کہ قیمے کا تمام پانی خشک ہو جائے، پھر اس میں تین عدد کٹے ہوئے ٹماٹر، چار عدد چوپڈ ہری مرچ، ہرا دھنیا، ایک کھانے کا چمچہ کٹی لال مرچ، ایک چائے کا چمچہ ہلدی، 1/2 چائے کا چمچہ پسا گرم مسالا اور حسب ذائقہ نمک شامل کر کے خوب اچھی طرح سے بھنائی کریں۔

آخر میں ہرا دھنیا اور ایک چائے کا چمچہ خشک میتھی ڈال کر مکس کرلیں اور سرو کریں۔

دم کباب

اشیاء

پسندے	ایک کلو
گھی	حسب ضرورت
بادام	چھ عدد
خشخاس	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچ اور پودینہ	حسب ضرورت
سفید زیرہ	ایک چمچ
کھوپرا	دو انچ کا ٹکڑا
گرم مسالا	دو چائے کے چمچ
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

پسندے دھو کر نمک لگا کر دو گھنٹے کے لئے رکھ دیں، سفید زیرہ، خشخاس، کھوپڑے کا ٹکڑا اور بادام بھون لیں اور پھر انہیں سل پر باریک پیس لیں، پھر ان میں گرم مسالا اور سرخ مرچ ملا کر پسندوں پر لگا دیں، پسندوں پر تھوڑا گھی لگا دیں، اوون میں پندرہ سے بیس منٹ تک گرم کریں، پھر نکال کر ہری مرچ پودینہ باریک کتر کر ڈال دیں اور آپ کے دم کے کباب تیار ہیں۔

چکن کباب

اشیاء

چکن قیمہ	آدھا کلو
وائٹ پیپر	آدھا چائے کا چمچ
زیرہ گرائنڈ کیا ہوا	ایک چائے کا چمچ
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
اجینو موتو	ایک چائے کا چمچ
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچ
ہری مرچ گرائنڈ کی	ایک چائے کا چمچ

ترکیب

چکن کے قیمہ کو مکس مسالے، وائٹ پیپر، زیرہ، بھنا ہوا گرائنڈ کیا ہوا، بھنا ہوا دھنیا، کٹی ہوئی لال مرچ، اجینو موتو، نمک، ادرک، لہسن، گھی، ہری مرچ گرائنڈ کی ہوئی کے ساتھ اچھی طرح میری نیٹ کر کے ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں، پھر اسے کباب کی شکل دے دیں اور اسے میڈیم ہائی پر دس منٹ بیک کرلیں، تیار ہونے پہ گرم گرم سرو کریں۔

☆☆☆

السلام علیکم!

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات لئے حاضر ہیں، آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لئے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے ملک کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔

انسانی تہذیب وتمدن نے ترقی کی تو گھر تشکیل پائے، اچھے خاندان سے اچھے معاشرے اور اچھے معاشروں سے بہترین قومیں بنتی ہیں، عورت کو گھر اور خاندان میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، وہ معاشرے ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے جہاں عورت کا حق تسلیم کیا گیا اور اسے عزت واحترام کا درجہ دیا گیا، ہمارے ہاں بہت سے معاملات میں تبدیلی آئی ہے، سوچ بدلی ہے، خواتین جو پہلے گھروں تک محدود تھیں اب مختلف میدانوں میں سرگرم عمل ہیں اور اپنی صلاحتیں منوا رہی ہیں لیکن یہ تبدیلی ابھی صرف بڑے شہروں تک ہی محدود ہے، خواتین کی اکثریت آج بھی اپنے حق سے محروم اور جبر کا شکار ہیں، حقوق خواتین کا چرچا تو بہت کیا جاتا ہے، ان کی حمایت میں جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں، اسمبلی میں خواتین کے حق میں بل منظور کیے گئے، لیکن آج تک کسی پر بھی کسی منصوبے میں عمل نہیں ہوا۔

خواتین کو جو حقوق، جو رتبہ اور احترام ہمارے مذہب میں دیا گیا ہے، اس کے بعد کسی قرارداد یا مطالبہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی، صرف احکامات اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے، جو مذہب نے متعین کیے ہیں۔

اپنا بہت سا خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کا خیال رکھتے ہیں۔

آیئے درود پاک، استغفار اور کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے آپ کے خطوط کی محفل میں چلتے ہیں۔

یہ پہلا خط ہمیں سعدیہ عزیز کا چیچہ وطنی سے ملا ہے، وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں۔

مارچ کا حنا مایا علی کے سرورق کے ساتھ ملا، حمد ونعت اور پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں سے دل کو منور کیا، انشاء نامہ میں انشاء جی کی شاعری کی بے قدری کا ورق کھولے بیٹھے تھے، ایک دن حنا کے ساتھ میں ڈاکٹر نازش امین سے ملاقات پسند آئی، سلسلے وار ناولوں میں اُم مریم کا ناول ”دل گزیدہ“ بے حد دلچسپ ہے، اُم مریم کی تحریروں میں ایک بات تو واضح ہے کہ وہ کہیں بھی تحریر کو بوریت کا شکار نہیں ہونے دیتی، سدرۃ المنتہیٰ کے ناول کی تو اس مرتبہ قسط انتہائی مختصر تھی ادھر شروع ہوئی اور ادھر ختم، مختصر ہونے کے باوجود کہانی میں دلچسپی کا عنصر نمایاں تھا۔

نایاب جیلانی کا ناول بھی اب دلچسپی کے مراحل میں داخل ہو رہا ہے، جہاندار اور نیل بر کا کردار کافی سے زیادہ پراسرار ہے جبکہ حمت کی خوبصورتی اس کی معصومیت میں ہے، مکمل ناول

اس مرتبہ دونوں ہی بہترین تھے، ''کس کے ہاتھ
پہ'' صدف اعجاز کی تحریر آج کل کے حالات کی
بھرپور عکاسی کر رہی تھی دوسری طرف فلک ارم
ذاکر جو کہ بہت عرصے بعد نظر آئیں حنا میں ان کا
ناول ''میرے ہرجائی'' بھی اس ماہ کی بہترین
تحریر تھی، آنیہ کی ساس کا کردار بے حد متاثر کن
تھا، فرح بخاری کے ناولٹ کا دوسرا حصہ بھی
دلچسپ تھا، اگلی قسط کا انتظار ہے، رمشا احمد کا
ناولٹ ''نبھا سکو تو ساتھ دو'' پسند آیا، ناولٹ کی
کہانی تو اچھی تھی ہی اس کا عنوان بے حد پسند آیا،
افسانوں کی اس مرتبہ بہار تھی، یعنی چھ افسانے،
شگفتہ شاہ کا افسانہ ''چمکتے جگ بیت گئے'' افسردہ
کر گیا، فاطمہ خان کا ''شہر کی لڑکیاں'' بھی اچھا
تھا، جبکہ قرۃ العین خرم ہاشمی کا افسانہ ''آسیب''
پسند نہیں آیا، عمارہ امداد کی تحریر ''بات اتنی سی تھی''
شبانہ شوکت کا ''میری ذات ذرہ بے نشاں'' اور
حمیرا نوشین کی ''اشک چپ چاپ سے بہے'' بھی
قابل تعریف تھے، مستقل سلسلوں میں حاصل
مطالعہ، بیاض، ڈائری، دستر خوان، رنگ حنا، حنا
کی محفل اور کس قیامت کے یہ نامے، ہر سلسلہ
اپنی اپنی جگہ بہترین تھا، فوزیہ آپی پلیز ایک دن
حنا کے ساتھ میں سباس گل، شبانہ شوکت، ام
مریم، شگفتہ شاہ وغیرہ کو بھی لائیں۔
میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں اس محفل
میں امید ہے جگہ ضرور ملے گی۔

سعدیہ عزیز، خوش آمدید اس محفل میں آپ
کی آمد نے ہماری اس محفل کو جگمگا دیا، مارچ کے
شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، ایک دن حنا کے
ساتھ میں شگفتہ شاہ اور ام مریم تو کافی عرصہ پہلے
شائع ہو چکیں شاید وہ شمارے آپ کی نظروں سے
نہیں گزرے، سباس گل اور دیگر مصنفین بھی
انشاء اللہ جلد ایک دن ہمارے ساتھ گزاریں
گئیں، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

سمعان آفندی: چکوال سے لکھتے ہیں۔

حسب معمول حنا چھ کو ملا، ٹائٹل پہ مایا علی
آنچل کو لہراتے ہوئے سیدھا دل میں اتر گئیں،
سب سے پہلے اسلامیات کارنر کا مطالعہ کیا جس
سے ایمان تازہ ہو گیا، انٹرویو میں ڈاکٹر امین
نازش کی ہمت کو داد دیں گے جناب کہ ہاؤس
وائف کے ساتھ ساتھ وہ دوسری ذمہ داری بھی
بخوبی نبھا رہی ہیں گریٹ آپی، ابھی آگے ہی بڑھ
رہے تھے کہ اچانک رمشا احمد ''نبھا سکو تو ساتھ دو''
کہہ کر گئیں ساتھ ہمیں ''شہر کی لڑکیاں'' فاطمہ
خان دکھانے مگر ''بات اتنی سی تھی'' عمارہ امداد کہ
ہمیں دیکھتے دیکھتے ''جگ بیت گئے'' شگفتہ شاہ
مگر ہمیں ہمارے سپنوں کی رانی جیسی نہ ملی
افسوس، یہ سفر طے کر کے لوٹ کر واپس آ رہے
تھے کہ کھڑی تھیں راستے میں صدف اعجاز ''کس
کے ہاتھ پہ'' ''اشک چپ چاپ بہے'' حمیرا
نوشین اور بول رہی تھیں کہ ''میری ذات ذرہ بے
نشاں'' شبانہ شوکت، خیر اب تو ہم عادی ہو گئے
ہیں ''تربت کے اس پار کہیں'' کے نایاب جیلانی
جو آگاہ کر رہی تھیں کہ ''آسیب'' قرۃ العین خرم
ہاشمی کے آگے بھی ''ایک جہاں اور ہے'' سدرۃ
المنتہیٰ کا پھر جا کر دل کو تسلی محسوس ہوئی، اب باری
ہے ''وفا شرط ہے'' فرح بخاری اور ''دل گزیدہ''
ام مریم کی، جو اپنے انداز سے رسالے کی
جان لگیں، ویلڈن آپی، عاصمہ حیدر کی ڈائری
سے نظم ٹرانسفر ہوئی میری ڈائری میں، بہن ام
رباب نے لکھا کہ ''خواب خواہش اور آرزو'' کو
ایک ہی قسط میں ختم کر دینا چاہیے تھا مگر مجھے ان
سے اتنا کہنا ہے کہ اگر وہ ایک ہی قسط میں اس
ناولٹ کا اینڈ کرتی تو میں پھر بھی کہیں نہ کہیں کمی
محسوس ہوتی اور اس بات کو مکمل یقین دہانی نہ

ہوتی کہ دوست مطلبی کیسے اور کب بنتے ہیں، رائٹر نے اگرچہ اس کو تین قسطوں میں لکھا مگر بہت ہی واضح اور پر اثر انداز سے لکھا ہے اس ناولٹ کو مستقل سلسلوں میں میرا پسندیدہ سلسلہ بیاض ہے مگر یہاں کچھ اشعار نہایت گھسے پٹے ہوتے ہیں، اینڈ تھینکس فوزیہ آپی جگہ دینے کا، امید ہے یونہی جگہ ملتی رہے گی، آپی میں اپنی نظم بھیج رہا ہوں، پلیز لازمی شائع کیجئے گا۔

سمعان آفندی مارچ کے شمارے کے لئے پسندیدگی کا شکریہ، بیاض کا انتخاب آپ کے معیار پر پورا نہیں اترا جان کر افسوس ہوا، انشاء اللہ آئندہ اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے، امتحان میں کامیابی کے لئے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، لیکن اس کے ساتھ دوا کرنا یعنی محنت وہ آپ کا کام ہے، آپ کی نظم انشاء اللہ باری آنے پر شائع ہو گی، آئندہ بھی آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

رائے خان: موڑ ایمن آباد سے ان کا شکوہ کچھ یوں ہے۔

حنا کا اور ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے، ہم ہر ماہ حنا بہت ہی شوق سے پڑھتے ہیں حنا سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے مگر حنا ہم کو نظر انداز کر رہا ہے ہماری تحریریں مسلسل نظر انداز کر کے ردی کی ٹوکری کی نظر کر رہے ہیں تمام مستقل سلسلے لاجواب رہے تمام قارئین نے بہت اچھا لکھا تمام افسانے، ناول، ناولٹ بھی لاجواب رہے اللہ کرے تمام لکھنے والے یونہی حنا کو چار چاند لگاتے رہیں اور حنا ہمیشہ عروج پر رہے آمین۔

رائے خان پہلے تو اپنے نام کی وضاحت کریں، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تحریریں ہمیں ملی تو ہم ضروری شائع کرتے، ردی کی ٹوکری ہمارے پاس ہے ہی نہیں آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرنا مگر تفصیلی تبصرے کے ساتھ شکریہ۔

مرزا علی بیگ: ٹھٹھہ مغلاں سے لکھتے ہیں۔

مارچ کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا سرورق بہت ہی پیارا تھا، پیارے نبی کی پیاری باتیں ایمان افروز تھی تمام مستقل سلسلے بہت اچھے رہے مگر ان میں اپنی تحریروں کو نہ پا کر بہت افسوس ہوا، تمام مستقل سلسلوں میں دوستوں نے بہت اچھا اور پیارا لکھا سب دوستوں کو اتنا اچھا لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو افسانے ناولٹ اور مسلسل ناول بہت اچھے لگے بے حد خوبصورت تحریریں تھیں اچھا لکھنے پر میں تمام مصنفین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں، اللہ کرے حنا دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

مرزا علی بیگ پلیز آپ بھی اپنا نام مکمل لکھ کر بھیجیں ایسے کچھ اندازہ نہیں کیا جاتا ہے، حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تحریریں ہمارے پاس محفوظ ہیں انشاء اللہ باری آنے پر شائع ہوں گی شکریہ۔

سید عبادت کاظمی: کی ای میل ڈیرہ غازی خان سے موصول ہوئی ہے وہ لکھتے ہیں۔

اس مرتبہ حنا کا سرورق بہت زبردست تھا، ''دل گزیدہ'' بہت اچھا جا رہا ہے، ام مریم بہت اچھا لکھتی ہیں، میرا پسندیدہ دوسرا ناول ''پربت کے اس پار کہیں'' میں شانزے اور رحمت کے کردار اچھے ہیں، ''اک جہان اور ہے'' میں امرت کو سمجھ ہی نہیں آتی کسی بات کی، ''ہما عامر کو بھی جلد کسی مکمل ناول کے ساتھ لائیں۔

بھائی عبادت کاظمی اس محفل میں خوش آمدید، مارچ کے شمارے کے لئے آپ کی پسندیدگی کا شکریہ، ہما عامر تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں، آئندہ بھی آپ

کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

ربیعہ اکرم: سیالکوٹ سے لکھتی ہیں۔

مارچ کے شمارے کا سرورق مایا علی کے معصوم سے مکھڑے سے سجا ملا، پیاری سی مایا کی دھیمی سی مسکراہٹ نے حنا کو چار چاند لگا دیئے، اسلامیات والا حصہ ہمیشہ کی طرح ایمان افروز تھا، انشاء نامہ میں انشاء جی کی تحریروں کی کیا بات ہے، ڈاکٹر نازش امین نے ایک دن حنا کے ساتھ گزارا ہمیں بے حد اچھا لگا، پلیز نازش صاحبہ اب کوئی ناول بھی لکھ ہی ڈالیں کافی عرصہ ہو گیا آپ کی تحریر کو پڑھے، اس ماہ کی بہترین تحریر مکمل ناول میں صدف اعجاز کی تحریر تھی، ویلڈن صدف آپ نے بے حد اچھا لکھا، خصوصاً آپ نے جو منظر نگاری کی وہ بہت خوب تھی اللہ آپ کو ایسا ہی اچھا اچھا لکھنے کی صلاحیت مزید عطا کرے، فلک ارم ذاکر نے ''میرے ہرجائی'' کے عنوان سے لکھا، فلک اگر آپ نئی مصنفہ ہیں تو آپ نے بڑی اچھی تحریر لکھی ہے، چند خامیاں ضرور تھیں مگر وہ ناگوار نہیں لگیں، پلیز اچھی اچھی تحریروں کے ساتھ حنا میں حاضری لگوائی رہیے گا، فرح بخاری کا ناولٹ ''وفا شرط ہے'' اچھا بھلا چل رہا تھا کہ آگے باقی آئندہ دیکھ کر آہ بھر کر رہ گئے، فرح آپ کی تحریر بھی بے حد متاثر کن تھی، مکمل ناولٹ پڑھ کر ہی مزید تبصرہ کیا جائے گا، ''نبھا سکو تو ساتھ دو'' یہ کہتی ہوئی رمشا احمد آئیں، رمشا احمد بہت کم لکھتی ہیں مگر بے حد اچھا لکھتی ہیں ہمیشہ کی طرح ان کی یہ تحریر بھی دل میں اتر گئی، اب بات ہو جائے میری فیورٹ مصنفہ سدرۃ المنتہیٰ کی، سدرۃ بے شمار اتار چڑھاؤ کے بعد آپ کی تحریر اختتامی مراحل میں داخل ہو گئی بلاشبہ آپ کی یہ تحریر ''اک جہاں اور ہے'' برسوں یاد رکھی جائے گی اس کا ہر کردار اپنے اندر بے شمار پراسراریت سمیٹے ہوئے ہے، آپ کے لئے بہت سی نیک تمنا میں، ''دل گزیدہ'' جی ون اینڈ اونلی ہماری پیاری سی بہن ام مریم کی تحریر بہت خوب ام مریم کیا مزے کی کہانی کا تانا بانا بنا ہے آپ نے، نایاب جیلانی نے بھی دھیمے دھیمے کہانی کو آگے بڑھایا ہے، آپ کی تحریر بھی اب دلچسپی کے مراحل میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔

افسانے بھی اس مرتبہ بہترین تھے، شگفتہ شاہ نے عورت کی نفسیات اور اس کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے قلم بند کیا، فاطمہ خان اور حمیرا نوشین نے بھی اچھی کوشش کی عمارہ امداد کی طرز تحریر جب سے ان کو پڑھ رہے ہیں ایک سی ہے ''نصیحت آموز'' پلیز عمارہ اب تو آپ کا کافی پرانی مصنفین میں شمار ہونے لگ گیا ہے، تو کچھ تبدیلی لائیں اپنی تحریر میں، قرۃ العین کا افسانہ کچھ خاص متاثر نہ کر سکا جبکہ شبانہ شوکت نے بھی اچھا لکھا، مستقل سلسلے بھی بہترین تھے۔

ربیعہ اکرم، خوش آمدید، اس محفل میں مارچ کا شمارہ آپ کی توقع پر پورا اترا یہ جان کر ہمیں خوشی ہوئی آپ کی تعریف اور تنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہیں، ہم آئندہ بھی آپ کی محبتوں اور حنا کی تحریروں پر آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

☆☆☆